REGD. L. No. 1703.

یہ کتاب چوہدری بشیر حسین ضیائی مرحوم (ایم۔ اے علیگ) کے اس
ذخیرہ کتب کی ہے جو اس کتب خانے کو عطیہ کیا گیا ہے۔ قادر محی

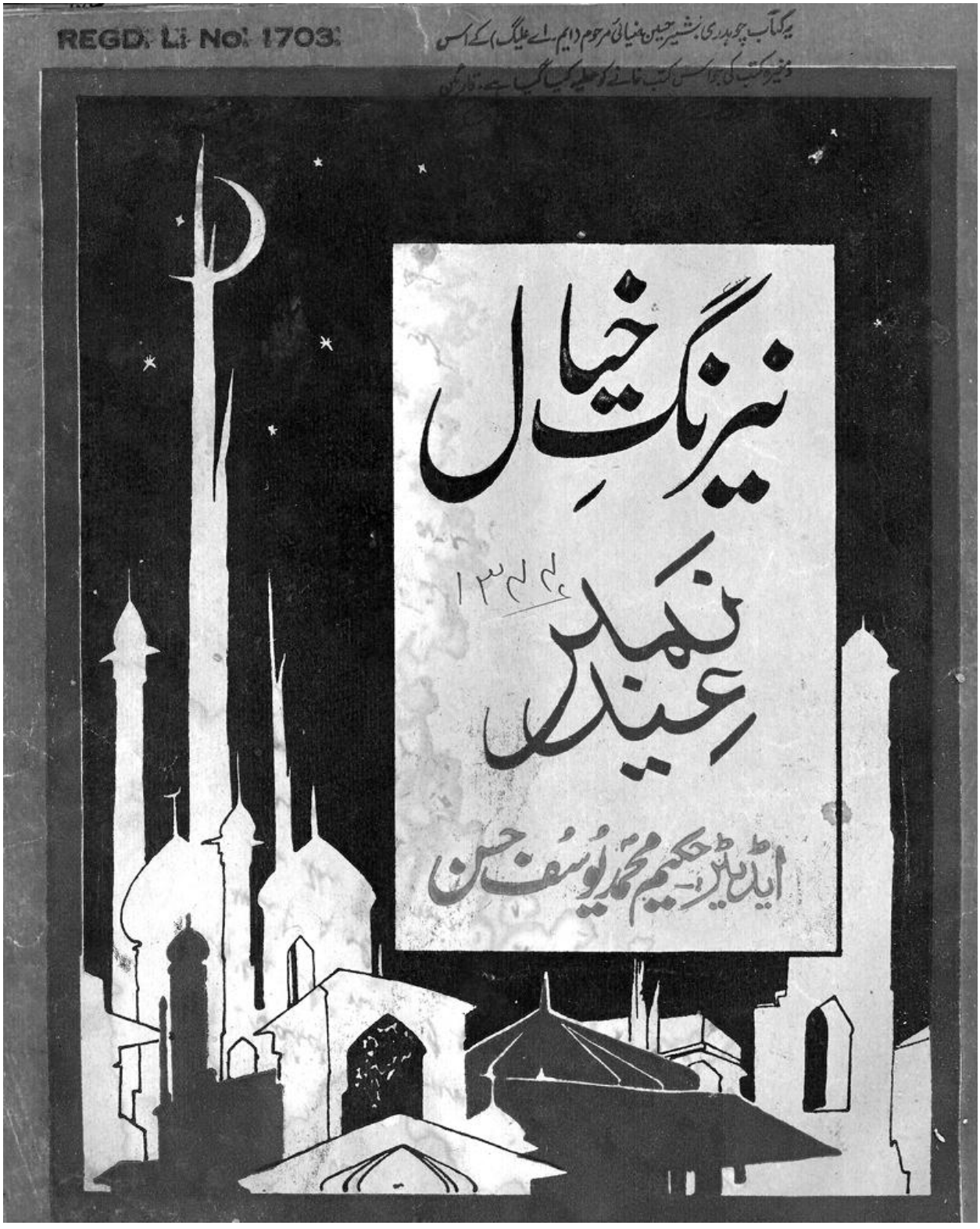

IQBAL ACADEMY PAKISTAN
Library
3/613
LAHORE

بہترین فرنیچر

صرف

ایم حیات اینڈ سنز (لاہور) کے ہاں سے مل سکتا ہے۔

ہم فرنیچر سازی کے فن میں اپنے قدیم تجربہ اور غیر محدود ذرائع کی امداد سے اپنی مصنوعات میں آراستگی اور مناسبت کو درجہ کمال پر پہنچا رہے ہیں۔
یہی وجہ ہے کہ سمجھ دار گھرانوں میں فرنیچر کی خرید کا خیال آتے ہی

حیات اینڈ سنز کا نام لیا جاتا ہے۔

ستا فرنیچر
وہی ہے جو سالہا سال تک
آپ کے زیر استعمال
رہنے کے علاوہ
آپ کے دولتکدہ کی
زینت
کو دوبالا کرتا ہے

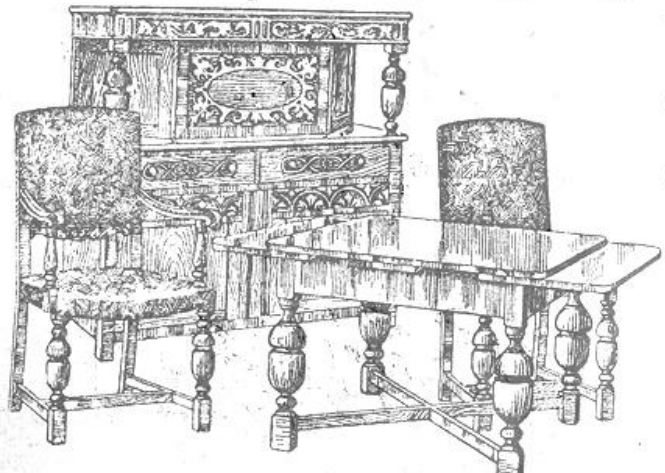

وہ فرنیچر
سب سے زیادہ مہنگا ہے
جسے آپ نے
سستا سمجھکر خریدا لیکن
بہت جلد اس نے ٹکڑے ٹکڑے
ہوکر آپ کے مکان کو
کباڑخانہ بنا دیا۔

ہمارے شوروم میں بلا تامل تشریف لائیے اور ہماری اشیا کا ملاحظہ فرمائیے جنہیں خریدنے کے بعد آپ سالہا سال تک مطمئن ہو جائینگے۔

یہ ایک حقیقت ہے۔ کہ ہمارے خریدار اپنے فرنیچر پر ہمیشہ فخر کرتے ہیں +

ایم حیات اینڈ سنز۔ ہال روڈ لاہور

نیرنگِ خیال ہندوستان بھر کے علمی ادبی رسایل میں سب سے زیادہ مستقل خریدار رکھتا ہے اسلئے ہمیشہ اسمیں اشتہار دو

جلد ۱۱ نمبر ۱۸-۱۸ بابت فروری و مارچ ۱۹۳۱ء اشاعت ۵۵۰۰

نیرنگِ خیال عید نمبر

چندہ سالانہ تین روپیہ چھ آنہ معہ محصول ممالک غیر سے ۸ شلنگ فی پرچہ ۵ر عید نمبر ایک روپیہ

نیرنگِ خیال عید نمبر کے دلچسپ مضامین

حضرت خواجہ حسن نظامی مدظلہ العالی
فرانسیسی طرزِ انشا کے دس نادر نمونے (یہ مضمون مصور ہے)
اورنگ زیب عالمگیر
پروفیسر تاثیر مدظلہ العالی
شاہجہان کی رحلت
از حضرت ظفر قریشی (جادو ناتھ سرکار کا نادر مضمون)

مولانا حضرت راشد الخیری ایڈیٹر عصمت
آمنہ کا لال
خان شہید
از جناب سید حسن برنی بی۔ اے۔ ایل۔ ایل بی
ننھا ادیب
از جناب صوفی صفوۃ اللہ بیگ دہلوی

مولانا سید نجیب اشرف ندوی۔ ایم۔ اے۔
ہاشمی کی یوسف زلیخا اور اردو شہ پارے
حامد اللہ افسر
کی دو لاجواب نظمیں
والٹیئر (کلیسا کا مشہور باغی)
از جناب ریاض حسین صاحب بی۔ اے

مزاحیہ

دریا پار شادی — از صبیحو قلندر آبادی
عید کی نماز — ناکارہ حیدر آبادی
اسمیں میرا کیا قصور ہے؟ — از جناب محمد حکیم جعفری بی اے ایڈوکیٹ
عید مبارک — جناب ادیب اے آبادی
ایڈیٹر نیرنگ خیال کی تصویر — از جناب مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی

حصہ نظم

جنگ نامۂ اسلام
از طالب الٰہ آبادی

میرزا یاس یگانہ لکھنوی
محترمہ بلقیس جمال بریلوی
جناب امرچند صاحب قیس

جناب شیام سندر لال صاحب باصر
جناب افتخار فلک صاحب
جناب مولانا عبدالباری صاحب آسی
سید شبیر احمد صاحب فرخ آبادی — وغیرہ وغیرہ

افسانے

فاضل — مشہور فلمی ڈرامہ کا اصل افسانہ
نارنگی کی کلیاں — مس حجاب اسمٰعیل کے قلم سے
چینی کی چوٹی — از جناب مرزا محمود نظامی اسلامیہ کالج لاہور

ڈراما

فوجی کارنامہ — از جناب منشی کنہیا لال بی اے ایڈیٹر چاند

ادبی مضامین

چاند — محترمہ سلطان لکھنو

تم بھی ہنستے ہو میرے حال پر — شرف الدین احمد عظیم آبادی
سیاح عورت کے خط کا جواب اُس کے فوجی محب کیطرف سے
از جناب کنور محمد لیسین علیخاں
ایک محبوبہ کی استدعا — از جناب اظہر فاروقی بنارس
ایڈیٹر نیرنگ خیال کی تصویر — حضرت خواجہ حسن نظامی مدظلہ

تصاویر

محبت کا پھول۔ رنگین
باغ عدن ”
دو کبوتر کی یاد ”
عمر خیام کی ایک رباعی سہ رنگ
اعلیحضرت غازی نادر شاہ معہ اپنے بھائیوں کے وغیرہ وغیرہ

اشتہارات

دمہ کی انوکھی دوا ”کشمال“ کی ایک خوراک سے انتہائی فائدہ ہوتا ہے۔ جو دوسری دواؤں سے ایک ماہ میں بھی نہیں ہو سکتا۔ سخت سے سخت دورہ چند منٹوں میں کافور ہو جاتا ہے۔ پرانا سے پرانا خلاگ خرد دمہ ایک ہی شیشی کے استعمال سے جاتا رہتا ہے پہلی خوراک سے خاطر خواہ فائدہ نہ ہو تو دوا واپس کر کے اسکی قیمت معہ دو طرفہ محصول ہم سے لیجئے بتکمیل شرط کیواسطے دو خوراکیں نمونتاً اور واپسی قیمت کا اقرار نامہ ہر پارسل میں بھیجا جاتا ہے (نوٹ) گردہ اور مثانہ کے مریضوں اور ہونا لگا انکو نقصان نہیں قیمت فی شیشی للعہ

پتہ:- مینیجر کشمال فارمیسی ۲ وکٹوریہ پارک شہر بنارس

دیوان غالب مطبوعہ جرمنی۔ قیمت تین روپے۔ کتب خانہ جامعہ ملیہ دہلی سے طلب کریں

(کتبہ۔ اشفاق احمد بریلوی)

31,613

بزمِ خیال

از ایڈیٹر

چوری کے مضامین

معزز ہمعصر انقلاب نے افکار و حوادث کے کالم میں ایک دلچسپ واقعہ کا تذکرہ کیا ہے۔ کہ افسانہ والیا جو مخزن کی کسی گذ
شایع ہوا تھا۔ آج سے سترہ سال بیشتر جناب پیارے لال شاکر میرٹھی کے قلم سے شایع ہو چکا ہے۔ اور ان پندرہ سا
رسایل آسے نقل کر چکے ہیں۔ معزز ہمعصر عصمت نے بھی بعض لڑکیوں کی شکایت اپنے رسالہ میں لکھی ہے کہ وہ مطبوعہ مضامین نقل کر کے عصمت میں بھیج
میں سے بعض غلطی سے شایع بھی ہو چکے ہیں۔ اس قسم کی چوریاں بلکہ سینہ زوریاں رسایل کی شہرت پر دھبہ لگانے والی ہوتی ہیں۔ نو آموز اہلِ قلم کو اس ق
سے بچنا لازم ہے۔ نیرنگِ خیال کو بھی بعض کرم فرماؤں نے تختۂ مشق بنانے کی تجویز کی تھی۔ چنانچہ اس وقت تک دو افسانے نیرنگِ خیال میں بھی شایع ہو چکے
اپنی مصروفیتوں کی وجہ سے اتنا موقع نہیں ملتا کہ ہم تمام رسایل کا بغور مطالعہ کر سکیں۔ اس لئے ہم آسانی سے ان کا شکار ہو گئے۔ ایسے مضمون نگار نیرنگِ خیال کو
کریں گے وہ خواہ اپنے بدنام ہو جائینگے کہ کوئی رسالہ ان کا اچھے سے اچھا مضمون بھی شایع کرنے پر تیار نہ ہوگا۔

اسداللہ

جنوری کے نیرنگِ خیال میں ایک افسانہ موناکے عنوان سے صفحہ ۳۹ پر شایع ہوا ہے۔ مضمون نگار کا نام کاتب نے غلطی سے الہ الزما
اور تپھر پر بھی یہ غلطی صحیح لگانے سے بھول گیا۔ یہ نام دراصل اسداللہ خاں تھا۔ ناظرین درست کر لیں۔

سالنامہ کی تصویر وارداتِ قلب

سالنامۂ نیرنگِ خیال میں ایک تصویر شایع ہوئی تھی جسمیں تلغرافی کے ایک کھمبے کے ساتھ ایک سرخ اور ایک س
ہے۔ نیچے ایک ہاتھ نکلا ہوا کچھ لکھ رہا ہے۔ اس کا مطلب بیشتر ناظرین نہیں سمجھ سکے۔ اس تصویر کا نام وارداتِ
ہے۔ انسان کے دل پر خیالات بالکل تلغرافی کی طرح سے وارد ہوتے ہیں۔ اس لئے مصوّر نے تار کے کھمبے پر جو شکلیں بنائی ہیں وہ دل سے مشابہت رکھتی ہیں۔ دل میں بھی دو کیفیتی
ایک سیاہ ایک سرخ۔ ایک طرف سے گویا نیں سیاہ خون آتا ہی جو صاف ہو کر سرخ ہو جاتا ہے۔ انسان کا چہرہ بھی جو بظاہر سیاہ ہے وہ بہ باطن سرخ (اُدو) ہے اور وہ تخیل کی دنیا میں سا تویں
تک پہنچ جاتا اور خیالات کو کاغذ پر قلمبند کرتا جاتا ہے۔ ہندوستان میں جو بعض نظموں پر الہام و پیغام یا وارداتِ قلب کے عنوانات دیکھے جاتے ہیں یہ تصویر اُس کیفیت کی بہترین منظ

شاہنامۂ اسلام

پنجاب کے فردوسی حضرت ابوالاثر حفیظ جالندھری نے شاہنامۂ اسلام لکھ کر تاریخِ اسلام پر ایک احسان عظیم فرمایا ہے۔ شاہنامۂ اسلام کا دوسرا حصّہ پہ
سے بھی زیادہ مقبول و معروف ہوگا۔ اور پبلک اسے ہاتھوں ہاتھ خریدیگی۔ حصّہ دوم کی ایک نظم ہم سالنامہ میں شایع کر چکے ہیں۔ عنقریب اُس کے بعض
دلچسپ حصّونکو بھی ہم ناظرین کی خدمت میں پیش کرنے کی عزت حاصل کرینگے۔ تاکہ ناظرین اس عظیم الشان کام کا اندازہ کر سکیں جسے حضرت ابوالاثر کمال کاوش سے سرانجام دے رہے

حضرت چغتائی کا دوسرا کارنامہ

مرقعِ چغتائی دیوانِ غالب کی کامیابی اور پبلک کا اُسے ہاتھوں ہاتھ خریدنا نہ صرف چغتائی آرٹ کی کامیابی ہے۔ بلکہ ہنا
پبلک میں حسنِ مذاق پیدا کرنے اور ملک میں اچھی اچھی مطبوعات شایع کرنے کے لئے میدان بنانے کا بھی ذریعہ ثابت ہوتا
مرقعِ چغتائی کی حقیقی قدر و منزلت یورپ میں ہوئی ہے۔ کیونکہ انگلستان کے بیشتر مشہور رسایل میں جو آرٹ سے تعلق رکھتے تھے مرقعِ چغتائی پر بے انتہا اچھے ریویو شایع ہوئے ہیں۔ ہم بعض
اپنی آئندہ اشاعت میں پیش کرینگے۔ مرقعِ چغتائی کی بہت کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں۔ اس لئے ناظرین کو چاہئے کہ یہ کتاب سترہ روپے میں خرید لیں کیونکہ تیسرا ایڈیشن شایع ہونا بہت بڑی ہمت
کام ہے۔ بعض اصحاب پوچھتے ہیں کہ قبلہ چغتائی صاحب آجکل کیا چیز تیار کر رہے ہیں۔ اس کے متعلق ہمیں اس سے زیادہ کچھ معلومات حاصل نہیں کہ آپ کوئی اور کتاب مصوّر شایع کرنے
انتظام کر رہے ہیں۔ جس کی تصاویر بڑی محنت سے تیار کی جا رہی ہیں۔ لیکن یہ ابھی تک صیغۂ راز میں ہے کہ چغتائی کا دوسرا کارنامہ کیا ہوگا؟ لیکن اتنا ہم جانتے ہیں کہ اُس کی اشاعت
یورپ کے فنونِ لطیفہ کے ماہرین میں ہلچل پڑ جائیگی۔ اور چغتائی کو وہ بین الاقوامی شہرت حاصل ہوگی جس کے وہ ہر طرح سے مستحق ہیں۔

عید نمبر کی تصاویر

عید نمبر کی تصاویر میں ایک تصویر باغ عدن کے نام سے شایع کی جارہی ہے۔ یہ ایک یورپین مصنفہ کی فکرِ گرانمایہ کا نتیجہ ہے۔ ایک باغ ہے جسمیں ہرن کھیل رہے ہیں۔ اور خادمائیں اور شہزادیاں اُنسے اپنا دل بہلا رہی ہیں۔ دوسری دو تصویریں عمر خیام کی رباعیوں پر ہیں۔ ایک سہ رنگی ہے اور ایک دو رنگی ہے۔ ایک سہ رنگی تصویر "دوسرے دل کی یاد میں" شایع کی جارہی ہے۔ ایک حسینہ ایک درخت کے نیچے ملول و حزیں سر جھکائے کھڑی ہے۔ درخت پر دو دلوں کی تصویر کندہ ہے۔ دوسرے دل کی یاد میں یہ عورت غمگین و آزردہ نظر آرہی ہے۔

میر ولی اللہ صاحب

یک رنگ تصاویر میں میر ولی اللہ صاحب بی اے ایل ایل بی پلیڈر ایبٹ آباد کی تصویر بھی شایع کی جارہی ہے۔ آپ نیرنگِ خیال کے معاونِ خصوصی ہیں۔ اور ہمیشہ دو مختلف ناموں سے مضامین لکھتے رہے ہیں۔ آج ہم پہلی دفعہ اس حقیقت کو بے نقاب کرتے ہیں کہ نیرنگِ خیال کے مشہور مزاحیہ مضامین جو "ادیب" کے قلم سے شایع ہوئے تھے وہ میر ولی اللہ صاحب کے زورِ قلم کا ہی نتیجہ تھے۔ اس نمبر میں بھی ایک مضمون آپکے قلم سے شایع ہورہا ہے۔ میر صاحب ایک پختہ گو شاعر۔ ایک مشہور قانون داں اور ایک زبردست ادیب اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ناظرین نیرنگِ خیال جو "ادیب" کی شخصیت سے آگاہ ہونے کے لئے بیقرار تھے وہ آج آپکی تصویر دیکھکر بیحد محظوظ ہونگے۔

اعلیحضرت غازی نادر شاہ شاہ افغانستان

اعلیٰ حضرت غازی امان اللہ خاں نے جو خدمات افغانستان کی سرانجام دیں اُن سے مہذب دنیا بخوبی واقف ہے۔ لیکن خدا کو یہ منظور نہ تھا کہ وہ اپنے پروگرام کو پایۂ تکمیل پہنچاسکتے۔ چنانچہ ان کی اصلاحات جلد بازی کی چٹان سے ٹکراکر پاش پاش ہوگئیں۔ اس کے بعد افغانستان میں طوائف الملوکی کا دور آیا۔ بچۂ سقہ تختِ حکومت پر جلوہ افروز ہوا۔ جس سے تہذیب و تمدن کی بنیادیں تک ہل گئیں۔ خیال کیا جاتا تھا کہ اب افغانستان کا محفوظ رہنا محال ہے۔ لیکن اعلیحضرت غازی نادر شاہ جو بے سروسامانی کی حالت میں داخل ہوئے تھے آخر دم تک اپنی جان پر مصیبتیں جھیلتے ہوئے افغانستان کی فلاح و اصلاح کے لئے سربکف رہے۔ اللہ پاک کسی کی ہمت و کوشش رائیگاں نہیں کرتا اور نیک نیتی کا پھل ملتا ہے۔ چنانچہ کابل پھر فتح ہوا اور اعلیحضرت تختِ حکومت پر جلوہ افروز ہوئے۔ تمام ملک کے سربرآوردہ اصحاب نے آپکو بادشاہ بنایا۔ جس وقت آپ تخت پر بیٹھے۔ اُس وقت خزانہ میں ایک پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔ فوج منتشر و برباد تھی۔ مدارس بند تھے۔ ڈاکوؤں اور بدمعاشوں نے زور پکڑ رکھا تھا۔ لیکن ان حالات میں بھی اعلیٰ حضرت کے تدبر اور حکمتِ عملی کے طفیل ملک کا نظم و نسق قایم ہوگیا اور ایک سال کے اندر اندر آپ چھوٹی بڑی تمام مشکلات پر غالب آکر افغانستان کو امن و امان کے پرچم تلے لانے میں کامیاب ہوگئے۔ ہمارے خیال میں ایران میں رضا شاہ پہلوی کو جن تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا تھا ان سے زیادہ مصائب کا مقابلہ اعلیحضرت غازی نادر شاہ کو کرنا پڑا ہے۔ اسلام کے اس فرزندِ جیّد سے ہمیں توقع ہے کہ وہ افغانستان میں دینِ حق کے قیام اور تہذیب و تمدن کی نشر و اشاعت میں کامیاب ہونگے اور افغانستان اور افغانوں کو دنیا کی متمدن سلطنتوں کے برابر سربلند بنادینگے۔

اس نمبر میں اعلیٰ حضرت غازی نادر شاہ، آن کے بھائی سردار ہاشم خاں وزیرِ اعظم اور ان کے تیسرے بھائی سردار ولی محمد خاں فاتح کابل کی تصویر دے رہے ہیں۔

جنگ نامۂ اسلام

ایک تصویر اُس آہنی خود کی ہے جسے فاتح قسطنطنیہ محمد ثانی نے زیب سر فرمایا تھا۔ جو جنگ نامۂ اسلام کے سلسلہ میں شایع کی جارہی ہے۔ جنگ نامۂ اسلام ایک کتاب کا نام ہے جو دفتر نیرنگِ خیال میں مرتب ہورہی ہے۔ اس کتاب میں دنیائے اسلام کی تمام مشہور ترین لڑائیوں کو منظوم پیش کیا جائیگا۔ عید نمبر میں ایک جھلک اسکی نمایاں ہے یعنی حضرت طالب الہ آبادی نے جنگِ قسطنطنیہ کو منظوم کیا ہے۔ جس کی ایک قسط اس نمبر میں اور بقیہ آئندہ نمبر میں شایع ہوگی۔ یہ نظم ہر طرح سے کامیاب ہے اور اس میں وہ جنگی سپرٹ برابر جھلک رہی ہے جو ہم ان جنگی نظموں میں چاہتے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ جنگ نامۂ اسلام تمام کا تمام حضرت طالب منظوم کرتے۔ لیکن حامد اللہ صاحب افسر کا خیال ہے کہ مختلف شعراء سے اس کے مختلف حصّے منظوم کرائے جائیں۔ ہم تمام شعرا کو طبع آزمائی کی دعوت دیتے ہیں۔ بالخصوص حضرت سیماب اور حضرت جوش ملیح آبادی کو اس اہم ترین کام کی طرف توجہ دینی چاہئے۔ جو صاحب بھی کوئی جنگ منظوم کرنا چاہیں۔ اوّل وہ ہم سے خط و کتابت کریں اور نمونہ کے اشعار ساتھ بھیجدیں۔ (عید نمبر کی تصاویر کے تمام بلاک ہمارے اپنے تیار کردہ ہیں)

سالنامۂ نیرنگِ خیال قیمتاً ملتا ہے

ہم نے دسمبر میں دسمبر کا نیرنگِ خیال شایع کیا تھا۔ اور دسمبر میں ہی سالنامہ بھی شایع ہوا تھا۔ گویا سالنامہ ایک علیحدہ پرچہ ہو جو قیمتاً ملتا ہے۔ صرف نیرنگِ خیال کے خریداروں کو اتنی رعایت دی جاتی ہے کہ انہیں وی پی ۱۲؎ کی جگہ ۸؎ کا بھیجا جاتا ہے (۸؎ قیمت ہے محصول ڈاک) لیکن بعض نے سمجھا کہ وہ اس حقیقت سے بیخبر تھے وہ برابر سالنامہ مفت حاصل کرنے کے لئے خطوط لکھتے رہتے ہیں۔ نیرنگِ خیال کا چندہ ہے سالانہ ہے۔ اس قلیل چندہ میں ہم ۸؎ کا سالنامہ کیسے مفت دے سکتے ہیں۔ جب کہ ہم دسمبر کا رسالہ بھی شایع کرتے ہیں۔ جو رسایل سالنامے مفت دیتے ہیں وہ ایک تو دسمبر کا رسالہ شایع ہی نہیں کرتے۔ دویم ان کا چندہ بھی ۱۲ار زاید ہے۔ اس طرح سے وہ سالنامہ کی قیمت وصول کرلیتے ہیں۔ ایسے رسایل عید نمبر قیمتاً دیتے ہیں اور ہم عید نمبر مستقل خریداروں کو مفت پیش کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ نیرنگِ خیال کا ہر معمولی نمبر

بھی عام رسایل سے بہتر اور جاذب نظر ہوتا ہے۔ نیرنگ خیال کے جن خریداروں نے ابھی تک سالنامہ طلب نہیں فرمایا انہیں جلد وی پی منگوا لینا چاہئے ورنہ بعد میں ایک وی پی بھی باقی نہ بچیگی ؛

سالنامہ ۱۹۳۰ و ۳۱ء

سالنامہ نیرنگ خیال ۱۹۳۰ء کی جسقدر جلدیں دفتر میں باقی ہیں اُن کی قیمت بڑھا کر دو روپے کردی گئی ہے۔ تازہ سالنامہ ۱۹۳۱ء کی تین سو کاپیاں باقی ہیں جو عہ کے حساب سے اس وقت مل سکتی ہیں۔ بعد میں ان کی قیمت میں بھی اضافہ ہوجائے گا۔ ۱۹۳۰ء کا سالنامہ مجلد عیہ محصولڈاک ۸ر کل تین روپیہ میں اور ۱۹۳۱ء کا سالنامہ مجلد عہ محصولڈاک ۸ر کل عیہ میں مل سکتا ہے۔ جن اصحاب کو مجلد درکار ہوں وہ مجلد طلب کرسکتے ہیں۔ اگر ۱۹۳۰و۳۱ء کو یکجا مجلد کرانے کا آرڈر دیا جائے تو اس صورت میں بجائے صہ کے صہ روپے میں دونوں ارسال خدمت ہوسکتے ہیں۔ جلد طلب فرمایئے ؛

ہمعصر روزنامہ زمیندار اور نیرنگ خیال

معزز ہمعصر زمیندار نے سالنامہ نیرنگ خیال پر جو ریویو لکھا ہے اُس میں اردو کے عروج و ارتقا کے جدید دور کا افتتاح کرنے کا سہرا نیرنگ خیال کے سر باندھا ہے۔ اور صاف طور پر لکھدیا ہے کہ علم و ادب کی اشاعت، اردو کی ترقی اور مشرقی آرٹ کی ترویج کے سلسلہ میں نیرنگ خیال کا کوئی مثیل نظر نہیں آتا۔ اس تنقید کا ہر لفظ غور سے پڑھنے کے قابل ہے ؛

سالنامہ نیرنگ خیال ۱۹۳۱ء

"نہ صرف پنجاب بلکہ ہندوستان میں اردو کے عروج و ارتقا کے جدید دور کا افتتاح کرنے والوں میں حکیم یوسف حسن اور ان کے رسالہ نیرنگ خیال کا نام یقیناً سنہرے حروف میں لکھا جائے گا۔ نیرنگ خیال نے اپنی زندگی کے سات سال کی قلیل مدت میں علم و ادب کی اشاعت، اردو کی ترقی۔ اور مشرقی آرٹ کی ترویج کے سلسلے میں جو شاندار خدمات انجام دی ہیں۔ ان میں اس کا کوئی مثیل نظر نہیں آتا۔ مصر کے شیخ صحافت المقتطف کے مدیر المقطم کے بانی اور عربی صحافت کے جدید دور کا افتتاح کرنے والے آنجہانی ڈاکٹر یعقوب صروف نے لکھا تھا کہ "علم و ادب کی عام ترویج و اشاعت کے لئے ضروری ہے کہ رسایل اپنے میں تنوع اور رنگینی پیدا کریں۔ اور خواص کے ساتھ عوام کی دلچسپی کو بھی ملحوظ رکھیں"۔ جو حضرات نیرنگ خیال کا ابتدا سے مطالعہ کرتے رہے ہیں۔ وہ اس امر میں یقیناً ہمارے ہم خیال ہوں گے کہ حکیم یوسف حسن نے بھی ہمیشہ اسی نظریہ کو پیش نظر رکھا ہے۔ اور نیرنگ خیال کو بوقلموں دلچسپیوں کا مرقع بنا کر ایک بہت بڑے طبقہ کو ادبیات کے مطالعہ کی چاٹ لگا دی ہے۔ اور ملک میں ایسی فضا پیدا کردی ہے جسمیں اب اردو کے ہر ادبی رسالہ کی کامیابی کا امکان پیدا ہوگیا ہے ؛

اردو کے رسایل میں خاص نمبروں اور سالنامہ کی اشاعت کی بدعت جاری کرنے کا سہرا بھی حکیم یوسف حسن ہی کے سر ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اس میدان میں بھی نیرنگ خیال کا ابتک کوئی مقابلہ نہیں کرسکا۔ اور کوئی مقابلہ کرے تو کیونکر خود نیرنگ خیال کا ہر خاص نمبر اپنے پچھلے نمبروں پر فائق ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ سالنامہ ۱۹۳۱ء جو اس وقت ہمارے پیش نظر ہے۔ پچھلے سالناموں سے ہر بات میں بڑھا ہوا ہے اور اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ اسے یورپ کے کسی بہتر سے بہتر سالنامہ کے مقابلہ میں فخر و تفوق کے ساتھ پیش کیا جاسکتا ہے۔ درجنوں تصاویر۔ مشہور ترین ارباب قلم کے افسانے۔ ڈراما۔ نظمیں۔ غزلیں۔ رباعیات۔ بیسیوں علمی، ادبی اخلاقی اور فکاہی مضامین کا اتنا شاندار مجموعہ اگر یورپ میں شایع ہوتا تو اس کی قیمت پانچ چھ روپے سے کم نہیں ہوتی۔ مگر حیرت ہے کہ حکیم صاحب یہ سالنامہ صرف ڈیڑھ ڈیڑھ روپے میں لٹا رہے ہیں۔ ڈیڑھ روپیہ میں تو صرف اس کا چاند اور سورج سے زیادہ حسین و درخشندہ ٹائٹل بھی ارزاں ہے۔ ہم حکیم صاحب کو اُن کی وقیع علمی و ادبی خدمات اور ایسا شاندار سالنامہ پیش کرنے پر مبارکباد دیتے ہیں اور قارئین زمیندار سے سفارش کرتے ہیں کہ وہ علم و ادب کی یہ گرانقدر تاریخی یادگار ضرور ہی حاصل کریں۔ اور نیرنگ خیال کے کارکنوں کی سرگرمی اور ان کی اہم ادبی خدمات کی داد دیں۔ سالنامہ ۱۹۳۱ء کی قیمت عہ ہے۔ اور منیجر صاحب رسالہ نیرنگ خیال، شاہی محلہ لاہور سے دستیاب ہوسکتا ہے"؛ (زمیندار ۱۸ر جنوری ۱۹۳۱ء)

نیرنگ خیال عید نمبر کے صفحات

جنوری کے نیرنگ خیال میں ہم اس بات کا اعلان کرچکے ہیں کہ اب شذرات کا خاتمہ سمجھنا چاہئے اور صرف نیرنگ خیال کے ناظرین کے ساتھ باہمی گفتگو کے لئے بزم خیال کے عنوان سے ایک صفحہ وقف رہیگا۔ عید نمبر چونکہ دو ماہ کا مشترکہ نمبر ہے اس لئے اسمیں قریباً تین صفحات اس عنوان کی نذر ہوگئے ہیں۔ ہم عید نمبر کی تعریف و توصیف میں ایک حرف نہیں لکھ رہے۔ اس کے مضامین اور تصاویر آپکے سامنے ہیں اگر آپ اس مجموعہ کو پسند فرماتے ہیں تو دوست و احباب کو توجہ دلائیے کہ وہ جنوری ۱۹۳۱ء سے یا عید نمبر سے خریداری قبول فرمائیں۔ نیرنگ خیال کا آئندہ نمبر اپریل نمبر ہ راپریل کو ڈاک میں ڈالا جائیگا جو دلچسپ مضامین اور لاجواب تصاویر سے مزین ہوگا

ایڈیٹر

یہ کتاب چوہدری نذیر حسین خان غوری مرحوم (ایم اے علیگ) کے ذخیرہ کتب کی ہے جو ان کے کتب خانے کو عطیہ کی گئی ہے۔ قارئین سے درخواست ہے کہ مرحوم کے لیے دعائے مغفرت فرمائیں۔

جنگ نامۂ اسلام

فتح قسطنطنیہ

آمد آمد محمدؒ

[دفتر نیرنگ خیال میں ایک کتاب جنگ نامۂ اسلام کے نام سے زیر ترتیب ہے۔ جس میں دنیائے اسلام کی مشہور ترین لڑائیاں نظم کی صورت میں شایع کی جائینگی۔ فتح قسطنطنیہ کی مشہور ترین جنگ کو حضرت طالب الہ آبادی نے نظم کا جامہ پہنایا ہے۔ جس کا ایک حصّہ عید نمبر کی زینت ہے۔ جنگ نامہ اسلام عنقریب شایع کیا جائیگا۔ جو اُمید ہو کہ پبلک میں بیحد مقبول ہوگا
ایڈیٹر]

آج پھر سیفِ قلم جنگ پر آمادہ ہے　　رد کشِ دامنِ مقتل ورقِ سادہ ہے
ساقیا آج ذرا بھر کے چھکا دے ہم کو　　جوشِ جرأت سے ہیں مدہوش پلا دے ہم کو
میکدہ میں ہے بہت زور سے اک سنّاٹا　　جام ٹکرائیں تو شمشیر کا ہو جھنّاٹا
تودۂ گرد بنے منزلِ قسطنطنیہ　　غیرتِ برقِ تپاں ہو دلِ قسطنطنیہ
ہر ورق معرکۂ رزم کی تصویر بنے　　ہر سطر جنگ کی چلتی ہوئی شمشیر بنے
آج پھر فوج ہے سلطان محمد کی رواں　　بادۂ جوش سے سرشار ہے ایک ایک جواں
گونج جاتے ہیں جو تکبیر کے نعرے باہم　　ڈر سے ہو جاتا ہے شیرازۂ گیتی برہم
افسرِ فوج جو ضیغم ہے وہ ہے ابنِ مراد　　اسی رستم کے تو پہلو میں ہے قلبِ فولاد
سر پہ لہراتے ہیں رہ رہ کے ہلالی جھنڈے　　اوجِ اسلام دکھاتے ہیں جلالی جھنڈے
بیدِ لرزاں ہے اُدھر پیکرِ قسطنطنیہ　　شیرِ قالیں ہے مگر قیصرِ قسطنطنیہ
بانیِ شہر کی اولاد میں ہے سیزدہُم　　ڈر سے سلطان محمدؒ کے مگر ہوش ہیں گم
آمد آمد کا جو شہرہ ہے تو گھبراتا ہے　　سُن کے اخبار وہ بے موت مرا جاتا ہے
حال سلطان کا سُن سُن کے لرز جاتا ہے　　شکلِ مخبر نظر آتی ہے تو تھرّاتا ہے

ایک مخبر نے ابھی آکے سنائی ہے خبر
روز بڑھتے ہی چلے آتے ہیں جرار ادھر

یوں تو فوج ان کی نہیں بادِ صبا آتی ہے
ٹوک دیتے ہیں جو شیروں کو قضا آتی ہے

دھجیاں لشکرِ دشمن کی اڑا دیتے ہیں
صف شکن اینٹ سے بس اینٹ بجا دیتے ہیں

یہ خبر سن کے ڈرا خوف سے تھرّانے لگا
صورتِ افعیٔ پُرپیچ وہ بل کھانے لگا

عصر کے بعد ہی وہ برج پہ آکر بیٹھا،
تھے سبھی ساتھ اعزّا رفقا اور وُزرا

منتظر آمدِ سلطان محمد کا تھا
موت تھی دُور مگر خون گھٹا جاتا تھا

چرخ پر جب شفقِ شام کی چادر پھیلی
اُفقِ مشرق پہ گھنگھور گھٹا سی چھائی

سُرخ آندھی سی اُٹھی تھی تُتُقِ گردنہ تھا
دُھندلا دُھندلا کسی مقتل کا کھنچا تھا نقشا

نوکیں نیزوں کی جو رہ رہ کے چمک جاتی تھیں
آنکھیں ہر صاحب مردم کی جھپک جاتی تھیں

جلوے اپنے جو دکھاتے تھے ہلالی پنجے
دلِ دشمن کو مسلتے تھے خیالی پنجے

رفتہ رفتہ جو قریب آکے پھٹی وہ آندھی
سرخ بجلی کی نگاہوں میں گھٹا کوند گئی

اسلحے جسم پہ ہر بار تڑپ جاتے تھے
سپرِ مہر کو بے ساختہ تڑپاتے تھے

لہریں لیتا ہوا لشکر تھا کہ بڑھتا آیا،
یا اُمنڈتا ہوا فولاد کا دریا آیا،

توپخانہ جو دکھائی دیا جراروں میں
ایک لرزہ سا پڑا شہر کی دیواروں میں

جب قریب آکے ہلال اور ستارے چمکے
برقِ خاطف کے نظر سوز شرارے چمکے

سبز علموں کے ہلالوں سے صلیبیں کانپیں
اخترِ بخت بھی کانپے جو جبینیں کانپیں،

متصل آکے جوانوں نے علم گاڑ دیئے
آج تک رہ گئے قائم وہ قدم گاڑ دیئے

محاصرہ اور نماز

عیسوی چودہ سو ترپن (١٤٥٣) تھی کہ سلطاں پہنچے
دین اسلام کے پرجوش نگہباں پہنچے

مورچے بیٹھ گئے شہر کے دربند ہوئے
جنگ سے پہلے ہی نامردِ نظر بند ہوئے

عصر کا وقت تھا جب حصر کا آغاز ہوا
مستعدِ جنگ پہ ہر مسلم جانباز ہوا

آئی اپریل کی چھبیس کہ آفت آئی
گھر گئے رومی بدبخت قیامت آئی

خیمے گاڑے گئے جراروں نے کمریں کھولیں
جھوم کر شیروں نے تلواریں سنبھالیں تولیں

قلب میں شاہ کا بیچوں بیچ گڑا بدر مثال
جاں نثاروں کی پڑیں راوٹیاں شکلِ ہلال

اپنے بستر سے سحر ہوتے ہی جرار اٹھے
یا علیؑ کہتے ہوئے ٹیک کے تلوار اٹھے

اول دوسری طرف
صفحہ ۷ ملاحظہ ہو

اسی زنجیر کے حلقے میں تھا کل بندرگاہ
کثرت ایسی تھی کہ اُس پار نہ جاتی تھی نگاہ

بحر سے ترکوں کے حملے کی نہ تھی کوئی سبیل
دُہری دیواریں تھیں خشکی میں ادھر چھ چھ میل

گرد دیواروں کے تھیں خندقیں سَو فٹ گہری
جیسے دل جسم میں محفوظ تھے ایسے شہری

بندشوں سے نہ ہوا کچھ بھی خطر سلطاں کو
حق سے ہاتھ آیا تھا رستم کا جگر سلطاں کو

نعرے تکبیر کے ہونے لگے میداں میں بلند
سینے منقل ہوئے ڈر سے دلِ دشمن تھے سپند

سر بکف مرنے پہ ہر مسلمِ جانباز ہوا
تیر چلنے لگے اور جنگ کا آغاز ہوا

پہلے دن آ گئے خندق میں اُتر کر رومی
اخترِ بخت نے دکھلائی سراسر شومی

خود بخود آ گئے وہ کھچ کے قضا کے مُنہ میں
دہنِ گور میں تھے اور بلا کے مُنہ میں

چھوٹ سکتا ہے بھلا صید شکنجے سے کہاں
بچ کے جاتے ہیں ہرن شیر کے پنجے سے کہاں

تیر مسلم کے نہ چلتے تھے قضا چلتی تھی،
یا کڑکتی ہوئی ساون کی گھٹا چلتی تھی

صاف و بے عیب تھی ترکوں کی قَدَر اندازی
جیسے پتّے جھڑیں یوں ہوتی تھی سراندازی

جب یہ حالت تھی تو دشمن کے قدم کیا رُکتے
موت کے سامنے بانیٔ ستم کیا رُکتے

فوج اسلام ادھر جوش میں آکر جھومی،
پیچھے ہٹنے لگے اُس سمت دُبک کر رومی

پھر تو خندق میں قیامت کی ہوئی اک ہل چل
بھاگنے والوں میں بڑھ بڑھ کی جگہ تھا چل چل

ہر لعیں سایہ کو بھی اپنے عدو جانتا تھا
باپ بیٹے کو اُجالے میں نہ پہچانتا تھا

بھاگے جاتے تھے عجب شان سے مشّاق سوار
اُن کا مُنہ غرب کو تھا شرق کو روئے رہوار

دُمچیاں کھینچتے تھے اور سمجھتے تھے لگام
سوجھتا ہی نہ تھا وحشت میں کچھ آغاز انجام

پس کے برباد ہوئے سیکڑوں ٹکرا کے مرے
جوشِ وحشت میں غرض ٹھوکریں کھا کھا کے مرے

بھاگنے میں وہ سپاہی تھے غضب کے ہشیار
گرتے پڑتے ہوئے ہٹتے ہی گئے وہ جرّار

دم لیا شہر کی دیوار کے پیچھے جا کر
بڑھ گیا جوشِ شجاعت پسِ پردہ آکر

افسروں پر تو پیادوں نے کیا گل پاشی
ایک کو ایک نے بڑھ بڑھ کے دیا شاباشی

جم کے حملے کئے ترکوں نے کئی بار اُدھر
پسِ دیوار جو تھے اُن پہ ہوا کچھ نہ اثر

گولیاں کھاتے تھے مسلم بھی ادھر ہنس ہنس کر
پتھر آتے تھے تو کر دیتے تھے سینے کو سپر

جوشِ جرأت میں وہ جانباز بڑھے جاتے تھے
موت کے مُنہ پہ سرافراز چڑھے جاتے تھے

ظہر کا وقت جب آیا تو نمازی پلٹے
سن کے آوازِ اذاں کھیت سے غازی پلٹے

(خاص) باقی آئندہ نمبر میں

طالب الٰہ آبادی

علم سبز کے جس وقت پھریرے کھولے
ہاتھ منہ دھونے لگے لوگ وضو کرنے لگے
صاف ظاہر ہوا طاؤس نے شہپر تولے
رنگ تصویر عبادت میں جری بھرنے لگے

خوش گلو چند مؤذن جو چڑھے ٹیلوں پر
ان کی تکبیر کے نعروں سے بیاباں گونجے
بلبل قدس چہکنے لگے گلدستوں پر
صوفیہ ہلنے لگا شیر نیستاں گونجے

جب اذاں ختم ہوئی ہوگئے غازی یکجا
دور سے آئے تھے وہ "رات کے جاگے ہونگے
بس امام آگے تھا اور سب تھے نمازی یکجا
ابھی پیچھے ہیں لڑائی میں سب آگے ہونگے"

اپنی تحقیق بتاتی ہے کہ تھے ساٹھ ہزار
منقسم ہوگئے اب ساٹھ صفوں میں دیندار
پر کئی لاکھ پہ بھاری تھے وہ یکتا جرار
ایک اک صف میں کھڑے ہوگئے ایک اک ہزار

شان اسلام واخوت کی نظر آنے لگی
تھے کھڑے پہلوئے حاکم میں برابر محکوم
عرش تک ملت بیضا کی ضیا جانے لگی
نہ تو خادم تھا کوئی اور نہ کوئی مخدوم

شمع اسلام کے جانباز وہ پروانے تھے
جلوہ افشانیٔ اخلاص تھی با حسن و جمال
کیوں نہ ہو ایک ہی تسبیح کے سب دانے تھے
جاہ اسلام ہویدا تھا بقول اقبال

"ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز"
میں کہاں اور کہاں انکی نمازوں کی ثنا
"سمع اللہ وہ کہتے تھے خدا سنتا تھا"

صاف تھی ان کی جو قرأت تو رواں تھی ترتیل
بے ریا انکی دعائیں تھیں تو خالص تحلیل
یہ قدم وہ ہیں جہاں کھیت میں پڑجاتے ہیں
مثل دیوار سکندر وہیں گڑ جاتے ہیں

سر رہے دوش پہ یا تن سے اڑے وقت جدال
پانوں ایک انچ سرک جائیں نہیں ہے یہ مجال
ہے جبیں خاک پہ اسوقت تو دینداروں کی
سجدے کرتے ہیں یہی چھانوں میں تلواروں کی

آغاز جنگ

تھی بس اک نام کی سلطان کی بحری طاقت
موقع موقع سے رسد ان سے پہنچ سکتی تھی
رسدی اور مددی کشتیوں کی تھی کثرت
وقت پڑنے پہ مدد ان سے پہنچ سکتی تھی

بیڑا قیصر کا قوی اور مرتب تھا تمام
بحر اسود سے جو آتا تھا تجارت کا جہاز
جتنا ہوسکتا تھا موجود تھا سب استحکام
اپنے بیڑے میں ملا لیتا تھا وہ حیلہ ساز

سامنے بیڑے کے فولاد کی تھی اک زنجیر
جو کہ تھی سد سکندر کی بعینہٖ تصویر

ہجرت

مکّے کا آقا، مکّے کا والی، مکّے سے جانے والا ہے
ابرِ سیاہِ رنج و الم پھر مکّے پہ چھانے والا ہے
نادان بھی ہیں، جاہل بھی ہیں، فاسق بھی ہیں، ظالم بھی
کٹ نہ مریں یہ سارے قبیلے کون بچانے والا ہے
مکّے کی گلیوں کے یہ مسافر پوچھینگے کس سے راہ کدھر ہے
تو ہی تو بھولے بھٹکے ہوؤں کو راہ دکھانے والا ہے
دُکھ ہوگا تو کس سے کہیں گے دُکھ کی کہانی کون سنے گا
تو ہی اکیلا اس بستی میں رنج بٹانے والا ہے
دنیا بھر کو آج مدینے رشک نہ ہو کیونکر تجھ پر
وہ جو دنیا بھر کے لئے ہے تجھ میں آنے والا ہے

(خاص) حامد اللہ افسر

برق اور تاریکی

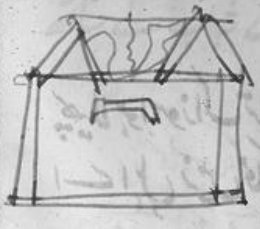

چمک اے برق ہاں اک بار پھر تو با دمِ تازہ
جھپک سے تیری، تاریکی کا ہو جاتا ہے اندازہ
نظر پر ہوگئیں قصرِ الم کی ظلمتیں روشن
خوشی کی اک جھلک کے واسطے کھلتے ہی دروازہ

(خاص) حامد اللہ افسر

رُباعیاتِ آسی

از حضرت مولانا عبدالباری صاحب آسی

گو شوق نے کر دیا ہے حالت کو تباہ
پھر بھی وہ کہربا ہے ہم مشتِ گیاہ
دیدار کی احتیاج اوروں کو ہے
کافی ہے ہمارے واسطے ایک نگاہ

سامانِ طرب فراہم کر کے
دنیا سے صفائے دل کا دعوا کر کے
وحدت کو بنا لیا ہے کثرت ہم نے
آئینہ میں اپنے عکس پیدا کر کے

پھر چاک دلِ حزیں کو سینا نہ پڑے
پھر خونِ جگر کسی کو پینا نہ پڑے
اُس حشر کی جستجو ہے مجھ کو آسی
مرنے والوں کو جس میں جینا نہ پڑے

بیکار ہے وہم قربِ ساحل کا سرور
بیکار ہے عالمِ مسرّت کا ظہور
دریائے بلا میں جوشِ طوفاں نہ سہی
یہ دل ہے اگر تو ناؤ ڈوبے گی ضرور

پھیلا ہوا سوز اک ترانے کا ہے
دیکھا ہوا باب اک فسانے کا ہے
اے اہلِ زمیں فلک فلک کو نہ کہو
اُلٹا ہوا اک ورق زمانے کا ہے

مستی ہو شباب ہو تو سب کچھ ہے وہی
مطرب ہو رباب ہو تو سب کچھ ہے وہی
یہ کچھ بھی نہ ہو اگر میسّر آسی
ساقی ہو شراب ہو تو سب کچھ ہے وہی

(خاص)

غالبؔ کا غیر مطبوعہ کلام

مرسلہ حضرت آتشی

غزل

نہ پوچھ حال اس انداز سے عتاب کے ساتھ
لبوں پہ جان بھی آجائے گی جواب کے ساتھ

مجھے بھی تاکہ تمنّا سے ہو نہ مایوسی
ملو رقیب سے لیکن ذرا حجاب کے ساتھ

نہ ہو بہرزہ روادار سعیٔ بیہودہ
کہ دورِ عیش ہے مانا خیال و خواب کے ساتھ

بہر نمط غمِ دل باعثِ مسرّت ہے
نمودِ حسرتِ دل ہے ترے شباب کے ساتھ

لگاؤ اُس کا ہے باعث قیامِ ہستی کا
ہوا کو لاگ بھی ہے اک مگر حباب کے ساتھ

ہزار حیف کہ اتنا نہیں کوئی غالبؔ
جو جلنے کو ملا دیوے آکے خواب کے ساتھ

(خاص)

چاندنی رات

حامد اللہ افسر کی ایک نظم

چاندنی افسردہ بھی ہے زرد بھی — چھن رہا ہے ہلکا ہلکا درد بھی
دل کی دھڑکن گویا دل کو چھوڑ کر — منتشر ہے چاندنی کے فرش پر
کچھ پریشانی سے ایسی ماہ میں — جیسے کھو جائے مسافر راہ میں
چاندنی میں کوئی شے بیتاب ہے — حُسن کا شاید پریشاں خواب ہے
چاند ہے اشکوں سے منہ دھوئے ہوئے — نغمے غم انگیز ہیں سوئے ہوئے
یہ سکوں ہے آج کچھ آشفتہ حال — یا تڑپ کے بعد ہے کوئی نڈھال
خامشی جو ہمرہِ مہتاب ہے — بولنے کے واسطے بیتاب ہے
چاندنی کا حسن اِس کے دم سے ہے — اور محبت اس کو افسر ہم سے ہے

(خاص) افسر

نذرِ عقیدت

محمد علی کی یاد میں

اے کہ تو تھا چمن آرائے وطن جانِ وطن — تیرے ہی دم سے تھا سرسبز گلستانِ وطن
اے محمد علی، اے شمع شبستانِ وطن — اُٹھ گئی ساتھ تیرے رونق ایوانِ وطن
اے شہیدِ وطن اے روحِ وطن جانِ وطن — ذات سے تیری تھے وابستہ صدارمانِ وطن
قوم کے واسطے کی جان بھی قرباں تو نے — ہو گیا آج سے تو فخرِ شہیدانِ وطن
رہبرِ کامل اے پیغامبرِ حریت — تیری تعلیم کا ہر لفظ ہے ایمانِ وطن
کوئی ثانی نہیں تدبیر و سیاست میں ترا — کون تھا تجھ سے جو بڑھ کر تھا نگہبانِ وطن
کون وطن آج چلا دنیا سے — ٹکڑے ٹکڑے نظر آتا ہے گریبانِ وطن

دین و ملت کے فدائی اے خوش انجام حیات
موت ہے تیری ترے واسطے پیغام حیات

سید شبیر احمد فرخ آبادی

(خاص)

نشاطِ عید

اثرِ:- جناب منظر صدیقی اکبر آبادی - مدیر شاعر آگرہ

(۱)

ہر روز نئی کشید ہوتی ہی رہی
روز اک بطِ مے شہید ہوتی ہی رہی
ہر جام ہلالِ عید بنتا ہی رہا
روزوں میں بھی اپنی عید ہوتی ہی رہی

(۲)

قسمت سے نصیب دید ہو جاتی ہے
سرسبز مری اُمید ہو جاتی ہے
تم جانتے ہو آتے ہیں محرّم گھر میں
تم آتے ہو میری عید ہو جاتی ہے

(۳)

تم آگئے اب کوئی طرب ہو کہ نہ ہو
ظاہر کوئی عشرت کا سبب ہو کہ نہ ہو
رویت ہے ہلال کی جمالِ روشن
ہو جائیگی عید، چاند اب ہو کہ نہ ہو

(۴)

اک سال ہوا شراب ڈھالی نہ گئی
بھولے سے بھی ہونٹھ تک پیالی نہ گئی
تشریف وہ لائے اُن کو تکلیف ہوئی
میں خوش ہوں کہ میری عید خالی نہ گئی

(۵)

جو ذریعۂ التفاتِ جاناں نہ ہوا
وہ شخص کبھی فائزِ ارماں نہ ہوا
وہ خاک حقیقتِ وفا سمجھے گا
جو عید کے دن بھی تجھ پہ قرباں نہ ہوا

(۶)

روزے پہنچے رسید آئی ساقی
پیمانہ بکف امید آئی ساقی
میخانے کے در کھول دے پی - اور پلا
برخیز کہ صبحِ عید آئی ساقی

منظر

(خاص)

تبسّم عید

ماہِ نو بر فلک نمایاں شدہ
گوشۂ قلب زار تاباں شد

ذرّہ ذرّہ ز نور رخشاں شد
قطرہ قطرہ مہ فروزاں شد

گوشہ گوشہ جمیل و تاباں شد
چپّہ چپّہ چنیں زر افشاں شد

سینہ صیقل شدہ ز تاب جمال
ظلمت قلب نور عرفاں شد

(۲)

غنچۂ صبح عید خنداں شد
بلبل روح نغمہ افشاں شد

گل امید می چکد غنچہ
چوں نسیم سحر خراماں شد

بر سر موج کاکل سنبل
گہر شبنم ز نار رقصاں شد

بر جبین سیمیں حسیں رُخ
تاب ماہ طرب فروزاں شد

موج صد پیچ و تاب فرمائد
با خمش ناز عشق پیچاں شد

ماہ در آب عکس می ریزد
تیغ در دست نار لرزاں شد

ملبلے نغمہ سرائد چوں
کہ نگار شگوفہ رقصاں شد

بوئے گل عطر پاش شد یکسر
کہ مشامم شمیم بیزاں شد

آفتاب طرب طلوع شدہ
ذرہ ذرّہ سرور افشاں شد

عشرت عید در جہاں آمد
برگ نخل مراد رقصاں شد

صائم تشنہ لب چنیں سیراب
کہ لبش آبجوئے حیواں شد

ہر لب مسلم جہاں شیریں
عید شیریں کہ شکرستاں شد

طفل شوخ و شریر می رقصد
جوشش عشرت بہ قلب ہیجاں شد

نو عروس حسیں بہار فروز
لب لعلش تبسم افشاں شد

صد جواناں بہ قہقہہ ریزند
جوشش خندہ بہ عام ارزاں شد

یک گروہ طرب بصد عشرت
سوئے مسجد چنیں خراماں شد

کہ زہر نقش پا چکد خندہ
کہ غبار رہش گلستاں شد

کہ ز طفلاں فضا تبسم خیز
کہ ز پیراں جہاں درخشاں شد

چوں جواناں قدوم مست زدند
ذرۂ گرد راہ رقصاں شدہ

رنگ پوشاک ہائے گوناگوں
حسن قوس و قزح نمایاں شد

شور و غوغا چنیں بلند شدہ
شور محشر تکبیر افشاں شد

این جمالہ کہ بلبل ہندی
با مسرّت چنیں غزلخواں شد

پیش آرم گل مبارک باد
غنچۂ صبح عید خنداں شد

(خاص)

بلقیس جمال
بریلوی

"صلِّ علیٰ محمدٍ صلِّ علیٰ محمدٍ"

(از جناب لالا امر چند صاحب قیس)

اے کہ ترا وجود ہے وجہ قرارِ دو جہاں — اے کہ تری نمود ہے لطفِ خدائے لامکاں
اے ترے درود پر سجدہ گزار آسماں — اے کہ ترا درود ہے وردِ زباں انس و جاں
صلِّ علیٰ محمدٍ صلِّ علیٰ محمدٍ

تیرے ہی دم قدم سے ہے زینتِ بزمِ کائنات — کون و مکاں ہے نور سے آئینۂ تجلّیات
دہر میں سب سے تو بڑا تجھ سے بڑی خدا کی ذات — بھیج رہا خدا بھی ہے تجھ پہ درود اور صلوٰۃ
صلِّ علیٰ محمدٍ صلِّ علیٰ محمدٍ

آنکھ میں تیری مستتر شانِ جلالِ عزّ و جل — رُخ پہ ترے ضیا فگن نورِ جمالِ لم یزل
فرق پہ تیرے جلوہ ریز افسرِ خاتمِ رسل — قلب میں تیرے موجزن بحرِ فضیلتِ عمل
صلِّ علیٰ محمدٍ صلِّ علیٰ محمدٍ

جلوہ فگن خدا کا نور تیری جبینِ ناز پر! — جھک گئے جسکے روبرو دیکھ کے کافرونکے سر
تو ہی خدا کا آخری دہر میں ہے پیامبر — تیرا عمل خدا کا حکم تیرا وطن خدا کا گھر
صلِّ علیٰ محمدٍ صلِّ علیٰ محمدٍ

آج ہمارے حال پر لطف کی اک نظر بھی ہو — یعنی یہی شبِ الم پیشِ روِ سحر بھی ہو
تیرا غلام نعمتِ خاص سے بہرہ ور بھی ہو — حلقہ بگوشِ مصطفیٰ حاملِ مال و زر بھی ہو
صلِّ علیٰ محمدٍ صلِّ علیٰ محمدٍ

امر چند قیس

تیرا ہی آسرا ہے

اے رہنمائے اعظم — پیغمبرِ معظم
سب کے دلوں کے محرم — تو خوب جانتا ہے
تیرا ہی آسرا ہے

ہے پاسبان دشمن — ہر مہربان دشمن
سارا جہان دشمن — دل تجھ کو ڈھونڈھتا ہے
تیرا ہی آسرا ہے

اوبار سے بچالے — افکار سے چھڑالے
اے دو جہان والے — تو جانِ مدعا ہے
تیرا ہی آسرا ہے

آفات اور بلائیں — ڈر ہے کہ کھا نہ جائیں
دکھڑا کسے سنائیں — دل تجھ کو ڈھونڈھتا ہے
تیرا ہے آسرا ہے!

شیام سندر لال باصر

رباعیات

(۱)

ملتا ہی نہیں قرار توبہ توبہ — اے ہستیٔ مستعار توبہ توبہ
گرداب بلا ہے اور کشتی اپنی — اے رحمتِ کردگار توبہ توبہ

(۲)

چشم تر اشکِ خوں نہ روتی یارب — دل کی کھیتی میں غم نہ بوتی یارب
کیوں نہ آرام سے گذرتی اپنی — تیری رحمت جو ساتھ ہوتی یارب

(۳)

ہمدردِ دلِ نزار کہاں سے لاؤں — ہر دکھ کا خریدار کہاں سے لاؤں
ہو نیکو تیری بزم میں لاکھوں میں پر — میں اپنا طرفدار کہاں سے لاؤں

(۴)

خوں ہوگیا دل عشق میں روتے روتے — ہم تھک گئے غم سینے میں بوتے بوتے
کر اب تو کرم اپنے گدا پر یا رب — تقدیر بھی تنگ آگئی سوتے سوتے

افتخار فلک

(خاص)

رسالہ ادبی دُنیا کی ترقی معکوس

از احمد حسین

اگرچہ نیرنگ خیال اور ادبی دنیا میں باہم کسی قسم کی چپقلش نظر نہیں آتی۔ اس لئے یہ اُمید رکھنا کہ ایڈیٹر صاحب نیرنگ خیال اس مضمون کو شایع فرما دیں گے ایک امید موہوم ہے لیکن اس اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ اردو کی ترقی اور اردو رسایل کے بقا اور قیام کے لئے اگر اس قسم کا مضمون لکھا جائے جس سے ایسے حقایق کا انکشاف ہو جس سے مدیران رسایل کو فائدہ پہنچ سکے تو ایڈیٹر صاحب نیرنگ خیال سطور ذیل کو شایع کرنے میں کسی قسم کی خرابی محسوس نہیں کریں گے +

میں ادبی دنیا کا بغور مطالعہ کرنے والا ہوں۔ اُس کے پہلے نمبر سے لیکر آجتک کے تمام نمبر مطالعہ کر چکا ہوں۔ اور مجھے نہایت افسوس کے ساتھ اعلان کرنا پڑتا ہے کہ رسالہ ادبی دنیا ترقی معکوس کر رہا ہے +

سب سے اوّل ادبی دنیا کے پہلے نمبر میں جس پالیسی کا اعلان کیا گیا تھا وہ ایک ادبی رسالہ کے لئے کسی حالت میں بھی موزوں قرار نہیں دی جا سکتی۔ ایک ہندو ہندو رہکر اور ایک مسلمان مسلمان رہ کر علم و ادب کی خدمت بھی کر سکتا ہے اور مادرِ وطن کی خدمتگذاری بھی۔ لیکن اس قسم کا وعظ رسایل میں کرنا جس سے مذہب سیکنڈری حیثیت میں رہ جائے مذہب پرست ہندوستانیوں کو اپیل نہیں کر سکتا۔ اس کے ساتھ فرہنگ شامل کرکے جو مٹی پلید کی گئی تھی وہ بھی میرے خیال میں ایک بے معنی حرکت تھی جو خدا کا شکر ہے کہ ادبی دنیا نے اب چھوڑ دی ہے۔ لیکن ادبی دنیا کا انقلابی پروگرام اور اُس کے بلند بانگ دعاوی نقش بر آب ثابت ہو رہے ہیں۔ سال سوا سال کی قلیل مدت میں چندہ کا تین روپیہ بارہ آنہ سے بڑھا کر محصول سمیت پانچ کر دینا اور مضامین کے ایکسو صفحات کا گھٹاتے گھٹاتے ۶۵ تک لے آنا۔ رسالہ کی ترقی معکوس کو ظاہر کرتا ہے۔ چندہ بڑھانے کے ساتھ ضرورت تھی کہ رسالہ کے حجم اور ظاہری ٹیپ ٹاپ میں اضافہ ہوتا لیکن برعکس اس کے مضامین کا صرف ۶۵ صفحات میں رہ جانا کسی صورت میں بھی گوارا نہیں کیا جاتا۔ کاغذ جو پہلے ۲۴ پونڈ کا ہوتا تھا اب صرف ۲۰ پونڈ رہ گیا ہے ٹائیٹل اور تصاویر کا کاغذ بھی نسبتاً ہلکا معلوم ہوتا ہے۔ پہلے رسالہ ایک آنہ کے ٹکٹ میں آتا تھا۔ اب صرف دو پیسے کے ٹکٹ میں موصول ہوتا ہے۔ پہلے اشتہارات کے خلاف نوٹ لکھے جاتے تھے۔ اب ایسے اشتہار شایع کئے جاتے ہیں جن میں جریان احتلام، سرعت اور مقوی مبہی اور قوت مردمی کی ادویات کا ذکر ہوتا ہے۔ پہلے سال میں قریباً نو دس ہزار روپے خسارہ کا اعلان کیا گیا تھا۔ اور اب جنوری نمبر میں مولانا حال وقال کے زیر عنوان لکھتے ہیں کہ رسالہ ادبی دنیا **موجودہ صورت** میں پانسو روپے ماہوار کا خسارہ اُٹھا رہا ہے۔ یہ پانسو روپے ماہوار کا خسارہ **موجودہ صورت** کی طرف خاص طور پر توجہ دلانے والا ہے جس کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں۔ یعنی سو صفحوں سے ۶۵ صفحوں تک مضامین کو گھٹا دینا محصول سمیت پانچ روپے چندہ بڑھا لینا اور ڈاک خرچ میں نصف کے برابر کمی کر لینے، کاغذ ۲۴ پونڈ سے کم کر کے ۲۰ پونڈ کر دینے اور اشتہارات چھاپنے کے باوجود اتنا خسارہ ابھی باقی ہے۔ اللہ پاک اپنا رحم کرے اور رسالہ ادبی دنیا کو قایم و برقرار رکھے۔ چھ ہزار روپیہ سالانہ کا خسارہ **موجودہ صورت** میں بھی تشویش سے خالی نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ رسالہ ادبی دنیا ہمیشہ زندہ رہے۔ اس لئے مدیر رسالہ ادبی دنیا کو توجہ دلاتا ہوں کہ وہ حجم وغیرہ میں اتنی اور کمی پیدا کر لیں جس سے یہ پانچسو روپے ماہوار کا خسارہ نہ اُٹھانا پڑے اور رسالہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دنیائے ادب کی اچھی بُری خدمت بجالاتا رہے۔

مدیر رسالہ ادبی دنیا میری اس عرضداشت پر بہت ناک بھوں چڑھائیں گے۔ لیکن اُنہیں ایک تو اپنے بلند بانگ دعاوی پر غور کرنا چاہئے اور دوسرے مارکٹ میں رسایل کا جو حشر ہو رہا ہے اُس سے سبق حاصل کرنا چاہئے۔ مجھے ایک عزیز نے ابھی ابھی اطلاع دی ہے کہ پشاور کا مشہور رسالہ ادیب پورے ایک سال کے بعد بند ہو گیا ہے صوبہ سرحد کے صدر مقام سے ایک ادبی رسالہ کا جاری ہونا کسقدر ہمت افزا تھا۔ ادیب کتنا اچھا شایع ہو رہا تھا۔ اُس کے اعلانات کی کثرت۔ اخبارات میں پروپگنڈا چار چار خاص نمبروں کی اشاعت۔ سب کچھ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات کے ساتھ ساتھ عدیم النظیر اولوالعزمی کو ظاہر کرنے والے تھے۔ لیکن جو قدم اُنہوں نے عجلت میں اُٹھایا اور مارکٹ میں داخل ہوتے ہی مقابلہ کی ٹھانی اس سے خدا جانے کتنا نقصان اُٹھانا پڑا۔ کہ آج بزم ادب ادیب کی رونق سے خالی ہو گئی ہے۔ میرے خیال میں اس سے بہتر تھا کہ وہ اپنے اخراجات اس حد تک کم کر دیتے جس سے رسالہ بغیر نقصان اُٹھائے چل سکتا اور رسایل کے اڈیٹروں کو رسالہ زمانہ سے سبق حاصل کرنا چاہئے جو ۲۵ سال سے چل رہا ہے۔ اور زندہ ہے اور اپنے حلقہ میں اردو کی خدمت کر رہا ہے۔ اگر وہ مقابلہ بازی کی قریباً نگاہ

کے قریب بھی بھٹک سکتا تو یقیناً اپنی نقد جان نذر کر دیتا۔ ادبی دنیا کے متعلق جو کچھ بھی میں نے لکھا ہے طعن سے نہیں لکھا۔ بلکہ میرا مقصد وحید صرف یہ ہے کہ جب موجودہ صورت میں بھی پانچسو روپے ماہوار کا نقصان ہو رہا ہے تو رسالہ کو پائدار اور مضبوط بنانے کے لئے اس کے اخراجات میں اتنی کمی اور کر لینی چاہئے جس سے یہ عظیم نقصان باقی نہ رہے۔

ادبی دنیا کی ایک بات مجھے ہمیشہ ناگوار گذرتی ہے وہ حال و قال میں اسکا ایسے پیرایہ میں اپنی خدمات کا ذکر کرنا ہے جو حقیقت سے کوسوں دور ہوتی ہیں۔ میرے خیال میں اس روش کو بھی ترک کر دیا جائے تو رسالہ کی قدر و منزلت اور وقار میں اضافہ ہو سکیگا۔ میرے سامنے اس وقت جنوری کا رسالہ ہے جسمیں اڈیٹر صاحب فرماتے ہیں۔

"ادبی دنیا کے افسانے عریانی، حیا سوزی اور بے باکی سے کلیتہً پاک اور عموماً اخلاق آموز۔ عبرت آموز اور انسانیت آموز ہوتے ہیں۔ اہل الرائے اسکا اعتراف کرنے لگے ہیں کہ ادبی دنیا سب سے پہلا رسالہ ہے جس نے حسن و عشق کے عریاں افسانوں کے مقابلہ میں بلند پایہ اخلاقی افسانوں کو عام پسند بنا کر ذوق عامہ کی اصلاح کی ہے"

یہ ہے دعویٰ اور اس حقیقت کے باوجود کامل ڈھٹائی سے لکھدیا گیا ہے کہ ادبی دنیا کے ایک فحش اور گندے افسانے کے خلاف اخبارات میں زیر تعلیم پنجاب اور ٹیکسٹ بک کمیٹی تک کو توجہ دلائی جا چکی ہے۔ اور ہندوستان کے سب سے بڑے اہل الرائے ادیب حضرت خواجہ حسن نظامی مدظلہ العالی جو رسالہ ادبی دنیا کے معاون خصوصی ہیں کی رائے بھی چھپ چکی ہے کہ افسانہ زیر بحث واقعی قابل اعتراض تھا۔ حال و قال کے زیر عنوان اس قسم کے قال کے ساتھ حال واقعی کو بھی مدنظر رکھ لیا جاتا تو زیادہ بہتر ہوتا۔

اسی جنوری نمبر میں ادبی دنیا کی نظموں کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:۔

"فاخر لاہور کی ادبی مجلسوں میں ایک اچھے شاعر کی حیثیت سے روشناس رہ چکے ہیں۔ لیکن ادبی دنیا کا فاخر جس جاہ و جلال سے اس میدان میں اُترا ہے اُسکے تیور دیکھکر حریفانِ فن میں کھلبلی مچگئی ہے۔ فاخر جس بلندی پر کھڑا ہو کر اپنا منظوم الہام دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے سچ تو یہ ہے کہ جوش ملیح آبادی کی نگاہیں بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتیں"

یہ ہے ادبی دنیا کی تعلیاں اور دوست واحباب کے پراپگنڈا کا ڈھنگ۔ فاخر واقعی ایک اچھا شاعر ہے۔ لیکن وہ ادبی دنیا کی اس چوٹی پر جسے ہمالیہ کی ماونٹ ایورسٹ سے بھی زیادہ بلند ہونے کا فخر حاصل ہے اور جہاں سے وہ دوسری دنیا تک اپنا الہام بالکل بحفاظت بھیج سکتا ہے۔ کے باوجود ابھی ملک میں اتنا مشہور و ہر دلعزیز نہیں ہوا جتنے حضرت جوش ملیح آبادی ہیں۔ فاخر کے کلام سے حریفانِ فن میں نہ ابھی کھلبلی مچی ہے نہ اُن کے جاہ و جلال کا تذکرہ ہے۔ اللہ رحم کرے۔ فاخر صاحب کو رسوا کرنے کے لئے ایسے ہی دوستوں کی ضرورت تھی۔

ہم اڈیٹر صاحب ادبی دنیا کو توجہ دلاتے ہیں (۱) وہ ادبی دنیا کے اخراجات میں اتنی کمی اور کر دیں جس سے پانچسو روپے ماہوار کا خسارہ باقی نہ رہے خواہ صفحے کم کرتے کرتے ۲۵ ہی رہجائیں (۲) قال و حال میں بلند و بانگ دعاوی اور انقلابی پروگرام کی اشاعت ترک کر دیجائے۔ (۳) دنیا کی ۲۵ زبانوں کے تراجم نہ شایع کئے جائیں کیونکہ اس سے زیادہ بے معنی چیز آجتک مطالعہ میں نہیں آئی۔ ادبی دنیا کی سوا سالہ زندگی کی حقیقت اگر ناظرین نیرنگ خیال معلوم کرنا چاہیں تو اس شعر میں ملاحظہ فرمالیں ؎

خشت اوّل چوں نہد معمار کج تا ثریا می رود دیوار کج

احمد حسین

جنت کے خطوط

مرنے کے بعد کی کیفیت اور جنت کی سرگذشت پڑھ لیجئے یہ خطوط یہ خطوط انسان کو نیکی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ یہ خطوط چوٹ کھائے ہوئے دلوں کا علاج ہیں۔ اس کے علاوہ انسان کو مرنے کے خوف سے اطمینان دلانے کے لئے ایک بہترین مجموعہ ہیں قیمت ۸ر

تذکرہ اولیائے ہند

اس کتاب میں ہندوستان بھر کے اولیاء اللہ کے سوانح حیات تحقیق سے لکھے گئے ہیں۔ اس میں قریباً تین سو اولیاء اللہ کا ذکر ہے جنکے کشف و کرامات ورد و ظائف اور احکام و نصائح وغیرہ سب کچھ درج ہے۔ کتاب مجلد ہے۔ قیمت چار روپیہ (للعہ)

مضامین پطرس

قیمت دو روپیہ (عہ) علاوہ محصول ڈاک نیرنگ خیال بکڈپو سے طلب فرمایئے۔ آج ہی آرڈر دیجئے گا۔

انتخاب اودھ پنچ

مشہور ظریف اخبار کے مزاحیہ مضامین قیمت عہ

فن کشتہ سازی

حکیم محمد یوسف حسن مہتمم دار التجارب کی تصنیف ہی جاہل سے جاہل شخص بھی صحیح طور پر کشتہ سازی کا فن سیکھ سکتا ہے۔ کتاب کا نام صفت اکبر ہے۔ حجم ۲۰۰ صفحات قیمت دو روپیہ (عہ) رعایتی قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ (عہ) محصول ڈاک علاوہ

پتہ۔ مینیجر رسالہ نیرنگ خیال۔ شاہی محلہ۔ لاہور

پطرس کے مضامین

[پطرس کے مضامین مصنفہ اے ایس۔ بخاری بی اے - (کینٹب) ایم اے۔ گورنمنٹ کالج لاہور
مطبوعہ دار الاشاعت پنجاب ر۔ حجم ۱۵۵ صفحات۔ سائز ۱۸×۲۲/۱۶ - قیمت دو روپیہ (عہ)]

کتاب زیر تبصرہ حضرت پطرس کی دس بارہ سال کی کوششوں کا نتیجہ ہے - اس میں وہ مضامین بھی ہیں۔ جو مصنف نے طالبعلمی کے زمانے میں لکھے - وہ بھی ہیں جو پروفیسری میں لکھے گئے - وہ بھی ہیں۔ جو کنوارپن کے دوران میں سرزد ہوئے - اور وہ بھی ہیں جو شادی کی حالت میں لکھے گئے۔

اگر پطرس کو کوئی شکسپیری انداز کا نقاد میسر آگیا تو کچھ عجب نہیں - کہ وہ "سویرے جو کل آنکھ میری کھلی" (طالب علمی) "میں ایک میاں ہوں" (شادی)، "انجام بخیر" (پروفیسری) "میبل اور میں" (ولایت رفتگی) وغیرہ مضامین سے مصنف کے صحیح سوانح حیات مرتب کرنے میں کامیاب ہو جائے - (صحیح سے تاریخی صحت نہیں بلکہ نفسیاتی صداقت مقصود ہے) خدا کرے کہ ایک ایسا نقاد جلد تیار ہو جائے - ورنہ مجبوراً ہمیں تیار کرنا پڑیگا مگر یہ تو محض مزاح تھا - اور نتیجہ تھا - اس اثر کا جو ہم پر کتاب زیر تبصرہ کے مطالعہ سے ہوا - (معلول سے علت کا اندازہ کیجئے) حقیقت یہ ہے - کہ یہ کتاب ایک نہایت ہی ذکی - اعلےٰ تعلیم یافتہ اور راسخ ادیب کی عمر کے بہترین حصہ کی تراوش ذہنی کا مجموعہ ہے - اردو میں اس قسم کی کتابوں کا فقدان ضرب المثل ہے - اور یہ کتاب ایسی ہے کہ اس کی طباعی کی بنا پر ہم بجا طور پر دوسری زبانوں سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔

مزاحیہ مضامین لکھنا کوئی ہنسی کھیل نہیں۔ ہنسنا آسان ہے - ہنسانا خون جگر روتا ہے - انگریزی کے ایک مشہور ادیب کا مقولہ ہے (جو خود اقتصادیات کا ماہر اور ظریفانہ مضامین لکھنے میں ید طولےٰ رکھتا ہے) کہ ایک ظریفانہ مضمون لکھنے میں جو مشکلات پیش آتی ہیں - وہ اقتصادیات پر ایک کتاب لکھنے میں پیش نہیں آتیں اور پھر پطرس کی قسم کی ظرافت!
——— ہمارے بہت سے مزاحیہ نگار محض فقرہ بازی پر اکتفا کرتے ہیں - ادھر ادھر کی باتوں کو پیوند لگا کر مضمون تیار کر لیتے ہیں

ان میں کوئی مرکزی خیال کوئی تنظیم فکر کسی قسم کی ہم آہنگی نہیں ہوتی پطرس کے مضامین میں (اچھے سے اچھا - اور برے سے برا) اور خوبی ہو نہ ہو ہم آہنگی جو آرٹ کی جان ہے - ضرور ہوتی ہے - ایک ماہر موسیقی داں کی طرح وہ ادھر ادھر پلٹے لگا کر اصل راگ کی طرف لوٹ آتا ہے - سرحد سے باہر نہیں جاتا۔

ان مضامین میں ایک خاص بات یہ ہے کہ لکھنے والا اوروں پر ہنسنے کی بجائے اپنے اوپر ہنستا ہے - یہ الگ بات ہے کہ اس کا "میں" اس روح انسانی کا ترجمان ہے - جو "من و تو" کے فرق سے ناآشنا ہے - اس لئے جہاں کہیں وہ اپنے "میں" سے گذر کر آپ پر چوٹ کرتا ہے تو "آپ" اس طرح ہنستے ہیں - بلکہ "مسکراتے ہیں" - کیونکہ پطرس کے مضامین قہقہہ کی بے ہنگامی کے حریف نہیں - جس طرح "آپ" "میں" پر ہنستے ہیں (دیباچہ ہی کو لیجئے گو مختصر سی چیز ہے مگر اپنی جگہ پر مکمل ہے)۔

فرماتے ہیں :-

"اگر یہ کتاب آپ کو کسی نے مفت بھیجی ہے تو مجھ پر احسان کیا ہے اگر آپ نے کہیں سے چرائی ہے (گویا آپ چور ہیں - مگر گھبرائیے نہیں تلافی ہوئی جاتی ہے) تو میں آپ کے ذوق کی داد دیتا ہوں اپنے پیسوں سے خریدی ہے تو مجھے آپ سے ہمدردی ہے - (لو برابر ہو گئی - اپنے آپ کو بھی دھر لیا) اب بہتر یہی ہے کہ آپ اس کتاب کو اچھا سمجھ کر اپنی حماقت کو حق بجانب ثابت کریں - جو صاحب اس کتاب کو کسی غیر ملکی زبان میں ترجمہ کرنا چاہیں (وہ مصنف سے نہیں بلکہ اس ملک کے لوگوں ...... سے اجازت حاصل کر لیں")

(کہ وہ اس مصیبت عظمےٰ کو اپنے سر لینا چاہتے ہیں - یا نہیں!)

ہم نے خطوط وحدانی کی عبارتیں آپ کو سمجھانے کے لئے نہیں لکھیں۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ آپ ہم سے بہتر سمجھ سکتے ہیں۔ ان کا مقصد محض مصنف کو چڑانا ہے۔ اسے اس جراحی کی جزا مل جائے جو وہ انسانی فطرت پر اس بے دردی سے عمل میں لاتا ہے۔ باقی رہی یہ بحث کہ ہنسی پیدا کس طرح ہوتی ہے۔ اور گدگدی اور ظرافت میں کیا فرق ہے؟ اور پطرس کیونکہ (بروقتی نقالی وغیرہ سے) یہ کیفیت پیدا کرتا ہے۔ اس کے لئے فرصت درکار ہے۔

حالت یہ ہے کہ عید نمبر تیار ہو چکا ہے۔ کاتب رو رہا ہے اور ہم قلم ہاتھ میں بلکہ منہ میں لئے بیٹھے ہیں ؛

ادارت

شریر بیوی

قیمت عہ محصول ڈاک معاف

۹۲ صفحات مجلد

مضامین پطرس

مزاحیہ مضامین کا لاجواب مرقع

قیمت عہ/ - علاوہ محصول ڈاک

انتخاب اودھ پنچ

مشہور ظریف اخبار کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ

قیمت عہ علاوہ محصول ڈاک

المشتہر منیجر نیرنگ خیال بک ڈپو شاہی محلہ لاہور

ریویو

دولت غزنویہ باتصویر مدارس میں آجکل تاریخ ہند کے متعلق جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔ ان میں شاہان قدیم کے متعلق سوائے جنگوں اور لڑائیوں کے دوسری قسم کے حالات کی گنجائش نہیں ہوتی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان بادشاہوں نے زیادہ فتوحات حاصل کی ہیں۔ ان کے متعلق غلط فہمیاں بھی زیادہ ہیں۔ چنانچہ سلطان محمود غزنوی کے متعلق بھی بہت سے ایسے واقعات تاریخوں میں ہیں جن کی کوئی بنیاد نہیں۔ حال ہی میں کتب خانہ دارالادب (بھاٹی دروازہ لاہور) نے "دولت غزنویہ" کے نام سے ایک کتاب شایع کی ہے جسمیں سلطان محمود اور اس کے جانشینوں کے متعلق مفصل صحیح تاریخی واقعات جمع کئے گئے ہیں اور جا بجا مستند تاریخی حوالجات سے غلط واقعات کی تردید کی گئی ہے۔ اور دکھایا گیا ہے کہ سلطان موصوف کے حملوں کے اسباب کیا تھے اور ان کے کیا کیا نتائج پیدا ہوئے۔ اس سلسلہ میں خاندان غزنویہ کے بھی مکمل تاریخی واقعات جمع ہو گئے ہیں۔ اور کتابت و طباعت عمدہ ہے۔ سلطان محمود کی سہ رنگی امیر سبکتگین کی دو رنگی تصاویر کے علاوہ موصوف کا مقبرہ۔ غزنی کی مسجد اور سومنات کی تصاویر بھی شامل کتاب ہیں۔ سرورق نہایت خوبصورت ہے جس پر ایک نقشہ دیا گیا ہے جسمیں وہ تمام مقامات دکھائے گئے ہیں جنکا کتاب میں ذکر آیا ہے۔ ضخامت چار سو صفحات۔ قیمت عہ علاوہ محصول ڈاک۔ مہتمم کتبخانہ اندرون بھاٹی دروازہ۔ لاہور سے طلب کریں +

سوزن کاری

سوزنکاری زنانہ دستکاری کا ایک اہم صنعتی حصہ ہے جس کی جاننے والی خواتین اپنے گھر کے سامانوں کو خوبصورت اور زیدہ زیب بنا سکتی ہیں۔ اس مرقع میں سوئی دھاگے سے کپڑوں پر کاڑھنے کے بیسیوں ایسے بیل بوٹے اور رائج الوقت نمونے دئے گئے ہیں۔ کہ ان کی وجہ سے کتاب نگارخانۂ چین معلوم ہوتی ہے۔ حروف تہجی بھی لکھدیئے گئے ہیں جن کے خاکوں پر سوزن کاری کر کے اپنا نام یا کوئی اور عبارت لکھی جا سکتی۔ قیمت ۱۲ر

ملنے کا پتہ:۔ نگارستان ادب۔ کوچہ کمانگراں۔ رنگ محل۔ لاہور

آمنہؓ کالال

از مولانا حضرت راشد الخیری ایڈیٹر عصمت دہلی

آمنہؓ کے لال پر زمینی کائنات نثار ہونے کو آگے بڑھی۔ بار آور شاخوں نے ارض حجاز کو بوسہ دیا۔ نسیم نے ہزار جان سے قربان ہو کر بساطِ ارضی کو چوما۔ ہوا نے اس مقدس نام کی تسبیح پڑھی۔ خوشرنگ پھولوں نے مکہ کی خاک اپنی آنکھوں سے ملی۔ اور ملک کا چپہ چپہ اور ذرہ ذرہ اس مسرت میں لہلہاتی ہوئی کونپلوں کا ہم آہنگ ہو۔

آسمانِ عرب نے عبد المطلب کے گھر دار ابن یوسف کے در و دیوار پر روشنی کی بارش کی۔ چمکدار تارے عبد اللہ کے لختِ جگر پر قربان ہوئے۔ اور مخلوق فلکی نے شادمانی کا غلغلہ بلند کیا +

آتش نمرود کے ذرات پھولوں کا لباس پہنکر زر و جواہر کی کشتی میں دعاء ابراہیمی کو سر پر رکھے عبد المطلب کے گھر پر نمودار ہوئے۔ دار ابن یوسف کی دیواریں تعظیم کو جھکیں۔ فرحت کی جھڑیاں برسیں۔ ہوا معطر ہوئی اور زمین و آسمان مبارکباد کے نعروں میں سرگرم ہو گئے ؎

یہ بزم طرب اور خوشی کی گھڑی — مسرت کی ہر سو لگی ہے جھڑی
عقیدت ہے یاں دست بستہ کھڑی — مگر آنکھ تجھ بن ہے سونی پڑی

فدا تجھ پہ سو بار صلِ علےٰ

غلام اور تھوڑی سی یہ لونڈیاں — بصد عجز و منت ہیں حاضر یہاں
کرم ان پہ ہو اے شہ مرسلاں — بنا انکی مجلس کو رشک جناں

شہ دو جہاں اپنا جلوہ دکھا

گنہگار آنکھوں میں طاقت نہیں — یہ دو چار ہوں تجھ سے ہمت نہیں
ترے سامنے ہوں یہ جرأت نہیں — نگہ بھر کے دیکھیں یہ قدرت نہیں

شہ دوسرا جلد آجلد آ

دلِ مضطرب پر بری ہے بنی — نظر آسماں پر ہے اس کی لگی
یہ بزم کنیزاں ہے خالی پڑی — اسے جگمگا التجا ہے یہی

سما جا ان آنکھوں میں آجلد آ

زمین و زماں تجھ پہ قربان ہو — ملائک سے ارفع تری شان ہو
تو دنیا کا بے مثل انسان ہو — خدا تیرا حافظ نگہبان ہو

فدا تجھپہ ہر جاں جلد آجلد آ

حیاتِ انسان کی تاریخ ان واقعات سے محروم نہیں۔ جب قدرت کے زبردست ہاتھوں نے اپنی طاقت پر فخر کیا ہے۔ صانع حقیقی نے اپنی صنعت کو سراہا اور احسن الخالقین نے اپنی خلقت پر ناز کیا۔ آج کتاب زندگی کا یہ باب بند ہوتا ہے اوصاف انسانیت ختم ہوتے ہیں۔ اور آدمیت کی تمام صنعتیں جمع ہو کر ایک ذات میں رونما ہوتی ہیں۔ رحم و کرم کی حسین دیویاں خلق و مروت کے تر و تازہ گلدستے ہاتھ میں لئے عبد المطلب کے گھر میں نمودار ہوئیں۔ خلوص و صداقت کے کفش بردار چہرے راستی و ایثار کے جواہرات سے مزین ہو کر سامنے آئے۔ عبادت و ریاضت کے علمبردار شرک و بت پرستی کو تاراج کرتے ہوئے خانہ کعبہ پر توحید کے جھنڈے گاڑنے لگے۔ آسمان فرطِ مسرت سے اُچھل پڑا۔ زمین اپنی خوش نصیبی پر فخر کرنے لگی۔ اور وہ وقت قریب آگیا جب دنیا کے ہاتھ اس بچہ کو اپنی آغوش میں لیں جس کو روئے زمین کی اصلاح کرنی ہے۔ ارضی و سماوی کائنات کی نظریں اس جمال پر پڑیں جو ایک عالم کو منور کرے گا اور وہ فخر موجودات ظہور پذیر ہوا جس کے مبارک قدموں میں سرکش گردنیں جھکیں گی۔ اور عدل حقیقی اس کے پاؤں چومے گا +

آمنہ کے لال! تیری پیدائش ایک نعمت ہے۔ جو خدا ہم کو عطا فرما رہا ہے تیرا وجود جس نے کارخانۂ حیات کو زیر و زبر کر دیا۔ تیری مقدس ہستی جس نے دنیا کی تاریکی میں تہلکہ مچا دیا قدرتی انعام تھا۔ رسالت کے معنے تو نے بتائے۔ نبوت کی تفسیر تو نے کی۔ انسانیت کا عقدہ تو نے کھولا۔ اور بندگی کا راز تو نے بتایا۔ عبودیت کا مرحلہ تیری شان تھی۔ اور توحید کا ڈنکا تیری زبان۔ آمنہ کے پیٹ سے پیدا ہونے والے بادشاہ ہم لونڈی غلاموں کا سلام قبول فرما۔ چمنستانِ تخیل کو اپنے رحم سے

ترو تازہ کر۔ ہمارا حقیر ہدیہ منظور کر اپنے رحم سے اور اپنے کرم سے ؏

خدا کے نام سے ناآشنا ہر ایک انساں تھا — نہ قانون عبادت تھا نہ تعلق تھا نہ رستہ تھا
وجود پاک نے تیرے خدا کا رنگ دکھلایا — زبان پاک نے تیری خدا کا نام بتلایا ؏

درود ہے تجھ پہ اے مولا سلام ہے تجھ پہ اے آقا

قیامت خیز گھڑیاں کفر کی العظمتہ للہ — ستم کے سلسلے جاری مظالم کا تھا اک تانتا
حقیقت تو نے دکھلائی بتایا راستہ سیدھا — خس و خاشاک کو تو نے صف اعلیٰ میں پہنچایا

درود ہے تجھ پہ اے مولا۔ سلام ہے تجھ پہ اے آقا

خدا نے زندگی دی۔ آدمیت تو نے اے آقا — قیاس زندگی آلودہ کو صیقل تو نے دلوایا
فنا انسانیت ہو کر بہیمیت کا دورہ تھا — ہدایت تو نے کی اور اٹھا یا نیک و بدبخشا

درود ہے تجھ پہ اے مولا سلام ہے تجھ پہ اے آقا

دغا کا دور دورہ تھا گھڑی آفت کی آئی تھی — جو بارش تھی تو ظلموں کی گھٹا نخوت کی چھائی تھی
محو ہو کر خدا کا نام قوت کی خدائی تھی — مگر ہستی تری نام خدا ساتھ اپنے لائی تھی

درود ہے تجھ پہ اے مولا۔ سلام ہے تجھ پہ اے آقا

حیا و خلق و ایماں سب ہٹے تھے یکقلم غارت — نہ تھی کمزور کی عزت نہ کچھ عورت ہی کی قیمت
بجائے کلفت و آفت کے دی آسائش و راحت — غلامی تو نے کی رخصت تو دی عورات کو قیمت

درود ہے تجھ پہ اے مولا۔ سلام ہے تجھ پہ اے آقا

یتیموں کی طرف تو نے بڑھایا ہاتھ الفت کا — دیا بوسہ سروں پر انکے تو نے رحم و شفقت کا
دکھایا رنگ انسانی بتایا طرز الفت کا — غریبوں بیکسوں پر تو نے رکھا ہاتھ رحمت کا

درود ہے تجھ پہ اے مولا۔ سلام ہے تجھ پہ اے آقا

خدا کا فضل تھا انعام تھا نور خدا تو تھا — شمع توحید باری کی جو سچ پوچھو ضیا ر تو تھا
ترے احکام نے ختم رسل ساکت زباں کردی — نہ ہوتا قفل گر منہ پر تو بتلاتے کہ کیا تو تھا

درود ہے تجھ پہ اے مولا سلام ہے تجھ پہ اے آقا

زباں احسان اخلاقی کہاں تک تیرے گنوائے — بکھیرے ہیں جو تو نے پھول گلشن انکو جھولائے
ترے احسان کا دنیا میں بدلا ہے تو اب یہ ہے — کہ ذکر خیر تیرا خود سنے اوروں کو سنوائے

درود ہے تجھ پہ اے مولا سلام ہے تجھ پہ اے آقا

اغیار کا اعتراف

۔صرف مسلمان نہیں ہر انسان نگاہ بلند کرے اور سامنے دیکھے۔ موسوی عہد گزر چکا۔ عیسوی دور ختم ہوا۔ نبوت رسالت کے جلوے اپنے اپنے رنگ دکھا کر فنا ہوگئے۔ اور وہ وقت آگیا کہ آمنہ کے لال پر پہلی مرتبہ خدا کا پیام نازل ہوا۔ اعلان نبوت کوس لمن الملک کی طرح دنیا میں گونج رہا ہے۔ آسمانی کتابوں کے ماہر تلاش کے قدموں سے آگے بڑھ رہے ہیں اور تحقیق کی آنکھیں یتیم عبداللہ کے گھر کا طواف کر رہی ہیں۔ آفتاب نصف النہار پر ہے اور عرب کی قیامت خیز گرمی نے آفت بپا کر رکھی ہے۔ یروشلم کے دو یہودی توریت و زبور کے عالم جن کے دلوں کو آیات ربانی نے تعصب و کدورت سے صاف کیا تھا۔ مکہ کی سرزمین پر داخل ہوئے۔ اور اپنے ایک ہم مشرب و ہم مذہب یہودی بقال کی دکان پر ٹھہر کر کہا۔ "وہ شخص جس نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے کہاں ہے"۔

میزبان بقال اپنے مہمانوں کے شوق کا استقبال بلند قہقہہ کی صدا میں کر رہا تھا کہ غل غپاڑہ کی آواز کانوں میں آئی اور اجنبی سیاحوں کی آنکھوں نے دیکھا کہ آدمیوں کا غول چیختا چلاتا ہا ہو کرتا چلا آرہا ہے۔ چشم زدن میں مجمع سر پر آپہنچا تو معلوم ہوا کہ سیاہ کمبل میں لپٹا ہوا ایک انسان بیچ میں ہے۔ جس کے قدموں کو نبوت اور رسالت چوم رہی ہے۔ سر سے خون کے فوارے جاری ہیں۔ لڑکے اور بچے۔ بڈھے اور جوان چاروں طرف سے اس کے اوپر پتھر برسا رہے ہیں اور سر کنڈے مار رہے ہیں۔ یہودی دل تڑپ اٹھے۔ ہمدردی کا جذبہ بلند ہوا۔ اضطراب کی لہریں چہروں پر دوڑنے لگیں۔ اور مکہ والوں کے ان مظالم پر لعنت کی بوچھاڑ کرتے ہوئے اٹھے تو بقال نے کہا "جس کی آرزو تم کو یہاں تک کھینچ کر لائی ہے وہ محمد یہی ہے"۔

ذوق حیرت سے بدلا اور تعجب کے آثار نمودار ہوئے۔ اور دل نے جس کی ہمدردی میں رحم شامل ہو چکا تھا۔ فیصلہ کیا کہ آزمائش کا بہترین موقعہ ہے۔ یہ جگر خراش مظالم خالی جانے والے نہیں۔ یہ خون رنگ لائے گا اور اگر دعویٰ سچا اور رسالت برحق ہے تو اس کی بددعا مکہ کیا عرب کا کلیجہ توڑ دے گی۔ اور عذاب الٰہی ان ظالموں کا ناس کر دے گا۔

یہودی مجمع کے ساتھ آگے بڑھے۔ چند قدم چلے تھے کہ ایک پتھر نے سرکار کی پیشانی زخمی کی۔ اور خون کی تللی جاری ہوئی۔ دونوں اس لئے کہ نتیجہ کی آرزو گدگدا رہی تھی اور دل مظالم پر رو رہا تھا۔ قریب پہنچ گئے۔ تھرا اور کانپ رہے تھے۔ کہ ان کے سامنے ایک عجیب سماں آیا۔ عبداللہ کا یتیم جس کے حامی قبروں میں جا پہنچے تھے۔ اور جس کا کوئی والی وارث زندہ نہ تھا۔ ٹھٹکا۔ کمبل کے کونہ سے پیشانی کا خون پونچھ کر آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے اور کہا:۔

"معبود حقیقی میری قوم کی غلطیوں کو معاف کیجیو۔ بے گناہ ہے۔ اس نے ابھی تک مجھ کو پہچانا نہیں"۔

اس جواب کا خون رگوں میں بجلی کی طرح دوڑا اور عقیدت نے جسم میں لرزہ پیدا کر دیا۔ فضا شور و شغب میں ایک متفقہ چیخ یہودیوں کی بلند ہوئی۔ اور دونوں سر یہ کہتے

ہوئے قدموں میں گرے۔

"لاریب تو رسول برحق ہے"

زندگی کے اس خوشنما دربار میں اس ظلم و ستم پر نفس کو مغلوب کرنا ایسا معجزہ ہے جس کا جواب دینے میں عفو و تحمل کے فرشتے خاموش ہیں۔ یہ رحم و کرم یہ ایثار یہ درگذر عظیم النظیر ہے۔ جویائے حقیقت دریائے تاریخ میں لاکھ غوطے کھائے۔ مگر یہ در شہوار میسر نہیں آتا۔ اور عقل سلیم گردن جھکا کر صرف اتنا کہتی ہے:۔

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

توسن قلم میدان تاریخ کو طے کر لینے کے بعد بیان سیرۃ میں سجدے کرتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ اور متعجب ہوتا ہے کہ کیسے دل اور کیسے انصاف تھے ان لوگوں کے جنھوں نے یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ مگر زندگی کی کشمکش نے ایمان منگوا دیئے۔ جانتے تھے اور سمجھتے تھے کہ معمولی انسان نہیں پیغمبر ہے۔ مگر ایسے کینہ دوز اور سیاہ قلب کہ دل کی حقیقت سے دماغ کو اور آنکھ کے تماشے سے زبان کو محروم رکھتے تھے۔

راشد الخیری

(سیرۃ رسالت)

چاند

(محترمہ مہر سلطان کے قلم سے)

موسم گرما کی ایک رات تھی۔ میں اُس وقت ایک کوچ پر لیٹی ہوئی تھی۔ اور رات کی تاریکی میرے سیاہی مائل سنہری بالوں کو اور زیادہ سیاہ کر رہی تھی۔ دفعتاً مغرب کی جانب سے کچھ روشنی نمودار ہوئی۔ دیکھتی کیا ہوں کہ چاند اپنے منور چہرے کو بادلوں کے سیاہ دامن میں چھپائے کچھ کبیدہ خاطر لڑکھڑاتا چلا آتا ہے۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے پوچھا اے بے چین دلوں کو اور زیادہ بے چین کر دینے والے چاند! تو اسقدر رنجیدہ خاطر کیوں ہے؟ تیرا شگفتہ چہرہ آج اس طرح کھلایا ہوا کیوں معلوم ہوتا ہے؟ تجھ میں میں اسوقت ایک عظیم الشان انقلاب محسوس کر رہی ہوں۔ بتا تو سہی تو کہاں سے آ رہا ہے؟ اور کہاں جانے کا قصد ہے؟ سچ کہنا تجھے کس کی تلاش ہے؟ آخر کس لیے تو اس طرح سرگردان نظر آتا ہے؟!

——— چاند نے مجھے مسکرا کر دیکھا۔ یہ میرے سوالات کا شاید جواب تھا۔

آہ تجھے جس کی جستجو ہے مجھے بھی اسی کی تلاش ہے۔ تو مجھے دیکھ اور افسوس نہ کر کیونکہ میں بھی تیری ہی طرح مبتلائے گردش ہوں۔ تجھے زندگی کی آرزو ہے اور میں بھی اسی کے حصول کیلئے صحرانوردی اور بادیہ پیمائی میں مشغول ہوں۔ اگر تو اپنے خیالات کی تہہ میں ڈوب جاتا ہے تو مجھے بھی نسیم سحر کا ایک جھونکا بیخود و سرشار کر دیتا ہے۔ تو ساکت ہے تو میرا دل بھی خاموشیوں کا مسکن ہو رہا ہے۔

پیارے چاند تیرے لئے خورشید کا پرتو اجل کا پیغام ہے۔ اسوقت تیری زندگی میں عظیم انقلاب واقع ہوتا ہے ——— ہاں میری حالت بھی تو ایسی ہی ہے۔ کسی کی روشنی نے میری آنکھوں کو خیرہ کر دیا ہے۔ میں اُس کی نورانی شعاعوں میں کھو گئی ہوں ——— لیکن اے چاند مجھ میں اور تجھ میں ایک بہت بڑا فرق ہے تو عشق کے ظاہری آثار کے باوجود دراصل گرمئی محبت سے خالی ہے۔ لیکن میں اپنے دل میں ایک التہاب اور پہلو میں ایک درد محسوس کرتی ہوں جو رہ رہ کر اُٹھتا ہے اور مجھے بے چین کر دیتا ہے۔

(خاص) پیارے چاند تو میری ہستی کے راز سے واقف نہیں لیکن ہائے افسوس سچ تو یوں ہے کہ میں خود بھی اسے اب تک نہیں جانتی۔

مہر سلطان لکھنوی

ع- تم بھی ہنستے ہو میرے حال پہ...

از جناب شرف الدین احمد صاحب عظیم آبادی

دل اور وہ بھی ایسا دل جو لذتِ سوز و گداز سے ناآشنا نہیں۔ بہت ہی نازک ہوتا ہے۔ ترچھی نظریں یا شوخ ادائیں تو خیر ایک طرف بعض وقت محض یہ خیال کہ اپنا کوئی طرزِ عمل کسی کی ناگوارئ خاطر کا سبب ہوا ہے۔ بس کچھ نہ پوچھئے آنکھوں کے سامنے کیا تکلیف دہ نقشہ پیش کر دیتا ہے +

مجھے تم سے ——— ہاں صرف تم سے محبت ہے' لیکن کیوں؟ یہ میں نہیں جانتا۔ تمہاری خوشی سے مجھ ایک خاص مسرت ہوتی ہے۔ لیکن تمہارا رنج ——— معاذ اللہ۔ اس سے خدا بچائے! تمہارے بعض انداز ایسے بھی ہیں جو حقیقتاً خدا جانے کیا ہیں۔ لیکن وہ خشم آلود ضرور ہیں۔ پھر تم ہی بتاؤ یہ کیسے ممکن ہے کہ میں اس روح فرسا نقشہ کو دیکھوں اور نہ لرزوں؟ اس تکلیف دہ منظر کی پیچیدگیوں میں الجھوں اور حرف شکایت زبان پر نہ لاؤں ——— ؟ اے کاش تمہیں میری مجبوریوں کا احساس ہوتا!

میں قدرتاً ذرا شوخ طبع واقع ہوا ہوں اور زندہ دلی میری فطرت کا بہترین جزو ہے۔ میرا انداز کلام بعضوں کو ہنسا دیتا ہے۔ لیکن میری غیر معمولی شوخیاں بعضوں کے لئے اکثر تکلیف دہ بھی ہو جاتی ہیں۔ دوسروں کے ہنسنے پر میں خوش ہوتا ہوں۔ اسیطرح بعضوں کی خفگی کو میں اپنی شرارتوں کی بہترین کامیابی سمجھتا ہوں ——— لیکن میری کسی غیر ارادی شرارت پر تمہارا آنکھیں بدل لینا' سچ کہتا ہوں میرے لئے ایک ناقابلِ برداشت صدمہ ہے۔ اس سانحہ سے میں پریشان ہو جاتا ہوں۔ میری آنکھیں آنسو تو نہیں بہاتیں۔ اس لئے کہ اظہارِ غم کی یہ کوئی اچھی صورت نہیں۔ لیکن میرا دل اس منظر کی تاب نہیں لا سکتا۔ اور میں اُن آنکھوں سے روتا ہوں جو میرے دل میں پنہاں ہیں۔ لوگ میری فطری شوخیوں کے یکایک خموشی سے بدل جانے پر متعجب ہوتے ہیں۔ بعض ایسے ہیں جو میرے حال پہ ہنستے ہیں۔ شاید اس لئے کہ وہ میری دلی کیفیتوں سے پوری طرح واقف نہیں۔ میں اُن کے اس اندازِ تمسخر کی مطلق پروا نہیں کرتا۔ کیونکہ مجھے ان سے واسطہ ہی کیا ——— ؟ مگر ہاں' میری فطرت کے اس حسرتناک انقلاب پر تمہارا یکایک ہنس دینا' اپنی شوخی سے نہیں بلکہ میری بے وقوفی پر' اور کس طرح ——— ؟ قصداً ——— ہاں ہاں' بالکل قصداً ——— بس کچھ نہ پوچھو۔ خیر' اس کی ذمہ دار بھی شاید میری قسمت ہے ؎

خندۂ اہلِ جہاں کی مجھے پروا کیا تھی ۔۔۔ تم بھی ہنستے ہو مرے حال پہ رونا ہے یہی

(خاص)

شرف الدین احمد

کیا آپ شریر بیوی خرید چکے؟ اگر آپ شریر بیوی خرید چکے ہیں تو اُمید ہے کہ آپ نے اسے بے حد پسند کیا ہوگا۔ اور آپ دوست احباب سے اس کے خریدنے کی سفارش کر رہے ہونگے۔ اگر آپ نے ابھی تک نہیں خریدی تو ۱۹۳۱ء کی اس دلچسپ اور سبق آموز کتاب کو فی الفور خریدیئے۔ پڑھیئے اور ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جایئے۔ حجم ۱۹۲ صفحہ مجلد قیمت عہ محصول ڈاک معاف

ملنے کا پتہ:- منیجر رسالہ نیرنگ خیال شاہی محلہ لاہور

نیرنگِ خیال عید نمبر ۱۹۳۱ء

عمر خیام کی ایک رُباعی

مزاحیہ:-

عید کی نماز

از "ناکارہ" حیدرآبادی

یقین مانئے میں ان لوگوں میں سے نہیں جن کا یہ عقیدہ ہے کہ اگر کوئی شخص عید کی نماز نہ پڑھے تو صحیح معنوں میں اُس کی عید نہیں ہوتی۔ میں نے اکثر اوقات عید منائی اور بڑے زور شور سے منائی۔ مگر لطف یہ کہ نماز ہی نہیں پڑھی۔ اور جب لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ "جناب عید کی نماز کہاں پڑھی؟" تو میں فوراً جواب دیتا ہوں "محلہ کی مسجد میں"۔ میرا ضمیر قطعاً مجھے لعنت ملامت نہیں کرتا۔ اور منکر نکیر کی صورت میری آنکھوں میں کبھی نہیں پھرتی۔ بعض اوقات ایسا ہوا ہے۔ کہ جب میں منہ توڑ بالا جواب دے چکتا ہوں تو ایک دوسرا پریشان کن سوال مجھ سے کیا جاتا ہے "واہ میں نے بھی تو اُسی مسجد میں نماز پڑھی۔ کہاں بیٹھے تھے آپ؟ ہم سے ملے نہیں"۔ تو میں فوراً فی البدیہہ عرض کر دیتا ہوں۔ "بس آپ کے پیچھے ہی تو بیٹھا تھا۔ جی ہاں تیسری صف میں کھم کے بازو"۔ اور وہ "تعجب ہے"! کہہ کر خاموش ہو جاتے ہیں۔ مگر غیب سے کوئی آواز میرے کان میں ہرگز یہ کہتی ہوئی نہیں سنائی دیتی کہ "تو جھوٹا ہے"!

میری سمجھ میں آجتک یہ نہ آیا کہ کیوں لوگ عید کی ملاقات کے بعد یہ سوال مجھ سے کرتے ہیں کہ عید کی نماز کہاں پڑھی؟ شاید اُن کے نزدیک اس نماز کی اہمیت ہو تو ہو مگر میری ناقص رائے میں عید کے معنی یہ ہیں۔ نئے نئے قیمتی کپڑے پہننا عطر اور سرمہ کی بجائے سینٹ اور کریم لگانا۔ اور سب سے بڑھ کر شیر خورمہ اور سوئیاں کھانا ——— کیا کہا کہ بھئی منہ میں پانی بھر آیا؟ جناب اس میں میرا کیا قصور ہے؟

——— ہاں تو یہ کہہ رہا تھا کہ اب راقم الحروف یا "راقم السطور" اس سوال کا اتنا عادی ہو گیا ہے کہ عید کی ملاقات کے ابتدائی مرحلے ("عید مبارک"۔ "آپ کو بھی سلامت"۔ گلے ملنا یا مصافحہ کرنا وغیرہ وغیرہ) جب ایکبار طے ہو جاتے ہیں، تو میں سمجھ جاتا ہوں کہ اب وہی پرانا فرسودہ سوال مجھ سے ہونے والا ہے۔ مگر تجربہ نے اب مجھے ہوشیار کر دیا ہے۔ اور میں اس منحوس سوال کی نوبت آنے نہیں دیتا اور خود فوراً کہہ دیتا ہوں "جی نہیں۔ محلہ کی مسجد کو خدا سلامت اور آباد رکھے۔ میں نے عیدگاہ میں نماز نہیں پڑھی"!

سچ جانئے یا نہ جانئے میں نے آجتک عیدگاہ کی صورت نہیں دیکھی۔ اس میں میرا قصور نہیں۔ بھلے مانسوں نے عیدگاہ اتنی دور بنائی ہے کہ جاتے اور آتے توبہ قبول ہو جاتی ہے۔ بہت سے خدا کے چہیتے بندے ایسے ہیں جو اس سنّت رسُول کی سختی سے پابندی کرتے ہیں۔ مگر جب میں اُن کی حالت عیدگاہ سے واپس آنے پر دیکھتا ہوں تو دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اچھا ہوا جو میں نے کبھی جانے کی غلطی نہ کی۔ اس کے علاوہ عموماً عیدگاہ میں نماز جلدی ہو جاتی ہے۔ اور میں نے آجتک یہ نہ جانا کہ سویرے اُٹھنا کس کو کہتے ہیں۔ اگر حکیم صاحب کبھی "تڑکا" پر مجھے مضمون لکھنے کو کہیں تو میں اُنہیں صاف جواب دیدوں کہ "حضرت ایسے فضول موضوع پر ہم مضامین نہیں لکھا کرتے"۔ اور خدانخواستہ اگر وہ اصرار کریں تو مجھے یقین ہے کہ میں اس کے سوا اور کچھ نہیں لکھ سکونگا کہ ؎

"سویرے جو کل آنکھ میری کُھلی ——— گھڑی کی کمانی سوا نو پہ تھی"

(خدا کے لئے یہ نہ سمجھئے کہ میں شاعری کر رہا ہوں)

ان وجوہ کی بنا پر میں آجتک عیدگاہ کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے شرف بخش نہ سکا۔ عید کی صبح جب میں غسل، بناؤ سنگھار، ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہو جاتا ہوں تو سوچتا ہوں۔ اگر وقت ہو تو طوعاً و کرہاً مسجد کی طرف بھٹک جاتا ہوں۔ اور راستہ میں تکبیر پڑھتے جانے کی بجائے "آلہی خیر ہو وہ بن سنور کر گھر سے نکلے ہیں"۔ یا کوئی اور ایسی ہی چیز گنگناتا جاتا ہوں۔ اب جو کچھ میں بیان کرنے والا ہوں اس کو مسجدوں تک محدود نہ سمجھنا چاہیئے۔ معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ عیدگاہوں میں بھی ہمارے مسلمان بھائی اس سے بڑھ چڑھ کر بدحواسیاں کرنے سے نہیں چوکتے۔ جب سے میں عاقل و بالغ ہوا ہوں سال میں دو بار یہی دیکھتا آیا ہوں اور آئندہ بھی یہی دیکھنے کی قوی توقع ہے۔ مگر اس "تماشہ" کی یکسانی اور تکرار سے اب میں بیزار آ گیا ہوں۔ اگر نمازیوں نے اپنی ان بدحواسیوں میں معقول اضافہ یا خاطر خواہ تبدیلی نہ کی ... تو پھر خواہ مخواہ ہم کو یہی کہنا

انجام دینا ہوگا۔ آخر میں یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ میں مبالغہ سے کام نہیں لے رہا۔ اور اگر کہیں لے رہا تو "ادیبانہ" نہ کہ شاعرانہ مبالغہ سے +

عید سے دو تین روز پیشتر اعلان شایع ہوتے ہیں۔ اخباروں میں مضامین لکھتے ہیں۔ پوسٹر لگائے جاتے ہیں۔ کہ عید کی نماز عیدگاہ میں ادا کرو، رسول اللہ صلعم نماز ہمیشہ عیدگاہ میں ادا فرماتے تھے۔ مسجدیں بڑے بوڑھوں نحیف معذور لوگوں کے لئے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ مگر مسجدوں میں جاکر دیکھئے تو معلوم ہوگا۔ کہ نمازیوں میں ہٹے کٹے بانکے نوجوانوں کی تعداد ہی زیادہ ہوتی ہے۔ نماز سے تقریباً ایک گھنٹہ قبل نمازیوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور تھوڑی دیر میں مسجد خدا کے نیک بندوں سے کھچا کھچ بھر جاتی ہے۔ حیرت ہونے لگتی ہے کہ اگر شہر کی ساری مسجدوں کا یہی حال ہوگا تو عیدگاہ میں شاید فرشتے نماز پڑھتے ہوں گے۔ ان لوگوں میں جو نماز کے لئے آتے ہیں۔ بعض تو وہ خدا پرست بندے ہوتے ہیں جو ہر روز پانچ دفعہ یہاں آکر نمازیں پڑھتے ہیں۔ بہت سے آدم کے بیٹے ایسے ہوتے ہیں جنکو ہفتہ میں ایک آدھ بار بھولے سے خدا یاد آجاتا ہے۔ مگر پچھتر فیصدی وہ مسلمان بھائی ہوتے ہیں، جو ہر روز خدا کو پکار کر دق کرنا پسند نہیں کرتے اور سال میں دو ایک دفعہ مسجد آکر گویا اللہ میاں پر احسان کرتے ہیں۔ مگر سب سے اعلیٰ اور خوش قسمت ہیں وہ ہستیاں، جو عید کے موقعہ پر بھی عیدگاہ جانا تو درکنار مسجد کی طرف پلٹ کر بھی نہیں دیکھتیں +

اب اگر کوئی شخص ایسے موقعہ پر سر جھکائے۔ اپنے معبود حقیقی سے لو لگائے نہ بیٹھا ہو یا تسبیح کی کھٹا کھٹ سے سامعہ نوازی نہ کر رہا ہو، بلکہ میری طرح ہر آنے جانے اٹھنے بیٹھنے والے کی حرکات و سکنات کو بغور دیکھ رہا ہو تو اسے عجیب و غریب چیزیں نظر آئیں گی جو اسے کہیں اور شاید ہی دکھائی دینگی "رنگ" اور "بو" کا ایسا اجتماع اس کے سوا صرف ایک اور جگہ نظر آتا ہے۔ جس طرف نظر اٹھائیے یہی دکھائی دے گا۔ کوئی شخص اپنی شادی کی شیروانی زیب تن کئے چلا آرہا ہوگا۔ تو کوئی مشجر اور رکم خواب کی۔ کوئی اطلس کی تو کوئی ریشم کی۔ کوئی ٹویڈ کی تو کوئی سرج کی۔ اور اگر کوئی بھلا مانس مردوں کی کمزوری یعنی صنف لطیف کا بیحد دلدادہ ہوگا تو وہ چکن کی شیروانی پہنے۔ لوگوں کو ٹھکراتا چلا آرہا ہوگا۔ کوئی زرّیں شملہ (عمامہ) سر پر باندھے ہوگا۔ تو کسی کے سر پر ترکی ٹوپی دائیں یا بائیں جانب ایک مخصوص زاویہ بناتی ہوگی۔ کوئی بدنصیب اس طرح مسجد کے دروازہ سے داخل ہوتا ہوا دکھائی دیگا۔ کہ ایک سخت جگر گودیں ہوگا۔ دوسرا پاؤں سے چسٹا ہوا ہوگا۔ اور ایک تیسرے خون کی کمائی (ننھی) انگلی پکڑے ہوگی۔ اور یہ شخص بالکل ایسا معلوم ہوگا جیسے غٹرغوں کبوتروں کے درمیان ایک بچوں والی مرغی۔ یہ سب کچھ مسجد کے دروازہ پر لٹکتے ہوئے بورڈ کے جلی نوٹ کے باوجود ہوگا کہ "براہ کرم چھوٹے بچوں کو مسجد میں نہ لائیے"۔۔۔ بعض اوقات یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ کوئی صاحب بیٹھے بیٹھے خدا جانے کیا ہوتا ہے، آستین چڑھائے یوں ایک دم سے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں کہ گویا اب کسی سے لڑ پڑنے والے ہی ہیں اور حوض کی طرف ہجرت کر جاتے ہیں +

اعلان کیا گیا تھا کہ عید کی نماز ٹھیک ساڑھے نو بجے ہوگی۔ مگر اکثر اوقات اس "ٹھیک" کی ہتک کی جاتی ہے ہم لوگوں کی پابندئ وقت تو ضرب المثل بن کر رہگئی ہے۔ یا تو خود پیش امام صاحب دیر میں تشریف لاتے ہیں۔ یا یقینی طور پر کوئی نہ کوئی واقعہ ضرور ہو جاتا ہے۔ بارے خدا خدا کر کے جب تکبیر ہوتی ہے تو سب لوگ بسم اللہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اب معرکہ "صف آرائی" شروع ہوتا ہے۔ اور نمازی وہ وہ مضحکہ خیز حرکتیں کرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے کبھی نماز ہی نہیں پڑھی کہیں سے یہ صدا بلند ہو رہی ہے کہ "کیوں بھئی صفیں ٹھیک ہوگئیں؟ صفیں جلدی درست کر لیجئے۔ شروع کریں؟ لاحول ولا" کوئی یہ چلّا رہا ہے "نہیں جناب نہیں! ذرا ٹھہریئے نا!" کوئی گلا پھاڑ پھاڑ کر کہہ رہا ہے "استغفر اللہ! ذرا ٹھہرو حضت! جلدی کا ہیکی ہے؟ صف ابھی ٹھیک ہی نہیں ہوئی۔ جناب آپ ذرا پیچھے ہو جایئے۔ نہیں نہیں۔ آپ نہیں وہ لال شیروانی والے صاحب۔ ہاں ہاں آپ۔ بس۔ بس توبہ آپ تو بہت پیچھے ہٹ گئے" کوئی صاحب بچوں کو کھڑا کر کے ہدایتیں کر رہے ہیں کہ "دیکھو بس اسیطرح کھڑے رہو۔ سنتے ہو چاند؟ شرارت کی یا اپنی جگہ سے ہلے تو خوب پیٹونگا۔ ابے چنّو یہ کیا کر رہا ہے؟ چل چپ رہ! ایسا ہاتھ رسید کرونگا کہ۔۔۔ بس یونہی کھڑا رہ" کچھ دیر بعد یہ غل غپاڑہ کم ہوتا ہے اور ایک سکوت چھا جاتا ہے۔ امام صاحب کان تک ہاتھ اٹھانے بھی نہیں پاتے کہ پھر آخری صف سے ایک غلغلہ بلند ہوتا ہے "ٹھہرو۔ ذرا ٹھہرو" لوگ لاحول ولا پڑھتے ہوئے پیچھے مڑ کر اس کی وجہ دریافت کرتے ہیں۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک صاحب عین وقت پر ہانپتے کانپتے صفوں کو درہم برہم کرتے ہوئے اندر پہنچے ہیں +

معاً "اللہ اکبر" کی دل ہلا دینے والی صدا بلند ہوتی ہے۔ چلو نماز شروع ہوئی پہلی تکبیر پر تو سب ہاتھ باندھ لیتے ہیں۔ مگر اس کے بعد کی تکبیروں پر (مجھے کہتے ہوئے شرم معلوم ہوتی ہے) ایک تماشہ ہوتا ہے۔ کوئی ہاتھ کانوں تک اٹھا کر باندھ رہا ہے کوئی کھول رہا ہے۔ کوئی کن انکھیوں سے اپنے بازو والے کو دیکھ رہا ہے۔ کوئی کچھ

کررہا ہے۔ کوئی کچھ۔ غرض جوں توں کر کے یہ مرحلہ طے ہوتا ہے اور پیش امام صاحب قرأت شروع کرتے ہیں۔ سورہٗ فاتحہ تک تو سب کے سب کان لگا کر سنتے ہیں۔ مگر اس کے بعد مقتدیوں میں معدودے چند ہی ہوتے ہیں جو بغور سنتے ہیں کہ امام اس خوش الحانی سے کیا پڑھ رہا ہے۔ رہے دوسرے مقتدی سو ان کے خیالات ادھر ادھر بھٹک رہے ہونگے۔ کوئی ذہن میں اپنا آج کا پروگرام مرتب کر رہا ہوگا۔ کوئی یہ سوچ رہا ہوگا کہ گھر جانے کے بعد شیر خورمہ اور سوئیاں کے علاوہ اور کون کون سی چیزیں کھانے کو ملیں گی۔ کوئی یہ خیال کر رہا ہوگا کہ آج سنیما جانا چاہیئے۔ ہیرلائڈ کا فلم تبلایا جانے والا ہے۔ کوئی اس کشمکش میں مبتلا ہوگا کہ آج رات تھیٹر جائیں یا سرکس۔ کوئی دل میں یہ کہہ رہا ہوگا کہ "خدا خیر کرے ظالم پیش امام نے ایک لمبی چوڑی سورۃ شروع کردی ہے۔ معلوم ہے نمازیوں میں کئی ضعیف و نحیف سن رسیدہ بوڑھے ہیں۔ ان کا لحاظ کیا ہوتا۔ یہ "شبینہ" تھوڑی ہے جو۔۔۔۔" وغیرہ وغیرہ غرض جتنے دماغ اُتنے خیالات ٭

اس اثنا میں ایک اور نہایت دلچسپ ڈراما ہو رہا ہوگا۔ پہلے ہی سے بچوں نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنالی تھی۔ اب جو دیکھا کہ کوئی دیکھنے والا نہیں اور اگر ہے تو صرف کنکھیوں سے دیکھنے والا اور بالکل بے بس، تو لگے گل کھلانے اور ہاتھ پاؤں نکالنے۔ وہ اس کو دھکیل رہا ہے۔ یہ اُس کو کہنی سے ٹھیل رہا ہے۔ ایک لونڈا ننھی کی ران میں چٹکی لے رہا ہے۔ وہ منہ بنا کر کہہ رہی ہے کہ "دیکھو باوا سے بولتی ہوں چنّو ستا رہا ہے"۔ چنّو صاحب زبان نکال کر چڑاتے ہیں اور کہتے ہیں "جا۔ بول ابا سے ڈرتا کون ہے؟" اور ابا جو قریب ہی دست بستہ کھڑے ہیں مصنوعی کھانسی کھانس کر اُس کو ڈرانے کی کوشش کر رہے ہیں ـــــ

دوسری طرف کسی کا لال یہ دیکھ کر کہ میدان صاف ہے اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر دڑ دڑ دڑ دوڑتے پھر رہا ہے۔ جیسے آپ والسرائے بہادر ہیں اور نمازی گارڈ آف آنر۔ روکنے ٹوکنے والا کوئی نہیں۔ نمازی بچارے خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتے ہیں اور وہ لونڈا ہے کہ ان کے سامنے سے بڑے مزے مزے بھاگ رہا ہے۔ ایسی آزادانہ تفریح کا موقعہ غریب کو پھر کہاں مل سکتا ہے؟ــ مسجد کے ایک گوشہ سے کسی کے "چاند کے ٹکڑے" کی رونے کی آواز آرہی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ننھا "باوا! باوا!!" پکار کر پیش امام کے سُر میں سُر ملانے کی کوشش کر رہا ہے۔ نمازیوں کا مارے کوفت اور غصّہ کے بُرا حال ہو رہا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ سب مل کر اس چھوکرے کے ساتھ خوب دھاڑیں مار مار کر روئیں۔ بعید خوفناک خیالات دل میں آرہے ہیں۔ مثلاً اس لونڈے کی کھال ادھیڑنا۔ اس کو کچا چبا ڈالنا۔ حوض میں ڈبو ڈبو کر اس کی جان نکال دینا ٭

خدا خدا کر کے پہلی رکعت ادا ہوئی۔ مگر دوسری رکعت میں جب قرأت ختم ہوتی ہے۔ اور امام اللہ اکبر کہتا ہے تو بہت سے نمازی غیب سے رکوع میں چلے جاتے ہیں۔ اور پریشان ہو ہو کر دیکھتے ہیں کہ کیوں دوسرے ابھی کھڑے ہیں۔ یکایک جو اُنہیں یاد آیا کہ ارے ابھی تو تین تکبیریں باقی ہیں! جھٹ سیدھے اُٹھ کھڑے ہوگئے ـــــ انا للہ وانا الیہ راجعون ٭

اِدھر نماز ختم ہوئی اور ادھر پھر ہلچل شروع ہوئی۔ کوئی اپنے بچّے کو ڈانٹ رہا ہے۔ کوئی چمکار چمکار کر سسکتے ہوئے لونڈے کو چپ کرانے کی کوشش کر رہا ہے۔ کوئی ریشمی دستی نکال کر منہ پونچھ رہا ہے۔ حالانکہ پسینہ کا نام و نشان تک نہیں۔ لیجئے جناب خطبہ شروع ہوا۔ یہ اب صرف رسمی طور پر پڑھا جاتا ہے۔ اس کو سمجھنے والے گنتی کے افراد ہوتے ہیں۔ ہاں کہیں کہیں خطبہ کے بعد اس کا ترجمہ سُنایا جاتا ہے۔ جو ہر لحاظ سے بہتر ہے۔ ورنہ بہت سے نمازی تو بھوندو کی طرح بیٹھے پیش امام کا منہ تکتے ہیں۔ بعض چالاک ایسے بھی ہوتے ہیں جو خواہ مخواہ سر ہلا ہلا کر یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ ہم امام کا ایک ایک لفظ سمجھ رہے ہیں۔ چند ایک آلتی پالتی بیٹھے دوسروں پر تنقیدی نظر ڈال رہے ہونگے "دیکھو تو اس شخص کے پائنچے پھٹے ہوئے ہیں۔ ارے توبہ کیسا میل چڑھا ہوا ہے اس کی ٹوپی پر۔ اسکی شیروانی کتنی ڈھیلی ہے۔ شاید مانگ کر پہنی ہے۔ دیکھنا یہ مولوی صاحب کی داڑھی کیسی بے تحاشا اُگی ہے۔ ـــــ اچھا تو یہ صاحب مونچھیں منڈا کر نماز پڑھنے آئے ہیں" کہیں دو تین آدمی کھسر پھسر کرتے دکھائی دیتے ہیں تو کہیں کچھ لوگ صحن سے سڑک کی سیر میں ہمہ تن مشغول نظر آئیں گے۔ پیش امام صاحب کو اپنے نمازیوں کا بڑا خیال ہوتا ہے۔ جانتے ہیں کہ بیچارے بے چین ہو رہے ہیں۔ پہلو پر پہلو بدل رہے ہیں۔ اس لئے وہ پانچ منٹ کے اندر دونوں خطبے فرفر پڑھ ڈالتے ہیں۔ اِدھر خطبہ ختم ہوا۔ اُدھر لوگ سنبھل کر بیٹھ گئے کہ چلو بھئی چھوٹنے کا وقت آگیا۔ پیش امام صاحب دعا مانگ رہے ہیں۔ کچھ لوگ زور زور سے "آمین ثم آمین" کہہ رہے ہیں۔ کچھ منہ ہی منہ میں جلدی جلدی کچھ پڑھے جا رہے ہیں۔ کچھ ادھر "آمین" کہہ رہے ہیں ادھر بچّوں کی طرف گھُرک کر "ہوں!" کی آواز نکال رہے ہیں ٭

دعا ختم ہونے کی دیر تھی کہ سب کے سب منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے یک دم سے اُٹھ کر ممبر کی طرف بھاگتے ہیں۔ ہر ایک یہی چاہتا ہے کہ میں سب سے پہلے امام سے ملوں۔ یہ نہیں سوچتے کہ تھوڑی دیر میں بھیڑ چھٹ جائیگی۔ فرصت سے مل لیں گے۔ جلدی کاہے کی ہے؟ ایک کے اوپر گرا جا رہا ہے۔ دھکا پیل کا دور

ہوتا ہے کہ خدا کی پناہ۔ اگر کوئی دُبلا پتلا بیش امام ایسے نازک موقعہ پر ممبر ایسے محفوظ مقام پر کھڑا نہ ہو تو مشکل پڑ جائے۔ میل آنے کے بعد اسٹیشن کی جو کیفیت ہوتی ہے۔ یا کسی زبردست پروگرام کی شام سینما کے ٹکٹ گھر پر جو منظر نظر آتا ہے۔ اس سے سب واقف ہیں ہی۔ مگر یہ نظارہ ان سے بڑھ چڑھ کر ہی ہوتا ہے ـــــ دوسری طرف دیکھو تو کوئی کسی سے گلے مل رہا ہے۔ کوئی مصافحہ کر رہا ہے۔ کوئی چھوٹا اپنے بڑے کے پیٹ میں "مُنڈی" ڈال رہا ہے۔ جیسے بکرا سینگ مارتا ہے۔ کوئی دفتری ملازم اپنے عہدہ دار کو جھک جھک کر فرشی یا فرشی سلام کر رہا ہے اور ہاتھ جوڑ جوڑ کر دفتر کے قضیوں یکھیڑوں کا رونا رو رہا ہے۔ یہ تو رہی اندر کی کیفیت۔ باہر کا کچھ اور ہی حال ہے۔ پھاٹک پر فقیروں اور فقیرنیوں نے وہ شور و غل مچا رکھا ہے کہ کان پڑی آواز سُنائی نہیں دیتی۔ ہر ایک اپنی اپنی ڈپلی بول رہا ہے۔ چند ایک فقیر تو مسجد میں بھی گھس آتے ہیں۔ اور اپنے کشکول میں پیسے اُچھال اُچھال کر ہر ایک سے سوال کرتے ہیں اور جب تک کچھ وصول نہ کر لیں پیچھا نہیں چھوڑتے۔ اس غل غپاڑہ میں ان لوگوں کی چیخ پکار بڑا مزہ دیتی ہے جن کے جوتے کہیں نہیں دکھائی دیتے۔ کوئی لاحول پڑھ پڑھ کر اپنا جوتہ ڈھونڈ رہا ہے۔ کوئی رونی صورت بنا کر کہہ رہا ہے کہ "ہائے میرا نیا جوتہ چوری گیا"۔ کوئی غصہ سے لال پیلا ہو کر چیخ رہا ہے کہ "کمبخت میرا قیمتی جوتہ پہن کر چلتا بنا اور یہ پرانا سلیپر چھوڑ گیا"۔ ـــــ عید کی نماز تو ہو گئی اب کچھ لوگ تو قبرستان کی طرف سدھارتے ہیں۔ کچھ اپنے گھونسلوں کی طرف رحلت کر جاتے ہیں۔ اور کچھ اپنے دوست احباب کے گھروں کو ہجرت کرتے ہیں +

دیکھا! میں پہلے ہی سے جانتا تھا کہ آپ لوگ بُرا جائیں گے۔ ہم لوگوں میں یہی تو بُرائی ہے کہ جب کوئی دلفگار شخص ہماری خرابیاں بیان کرتا ہے تو ہم ناراض ہو جاتے ہیں۔ اے نیرنگ خیال کے پانچ ہزار دو سو خریدار اور پندرہ ہزار مفت پڑھنے والو! اللہ پاک سے دعا مانگو کہ وہ ہمیں نیک توفیق دے اور اپنے محبوب کی اُمت کے حال زار پر رحم فرمائے۔ اور ہمیں سچا مسلمان بننے کی توفیق دے۔ آمین۔ فاعتبروا یا اولی الابصار +

(خاص) "ناکارہ"

تین تین پیسہ میں ایک ایک تصویر

یعنی نیرنگ خیال کی اُن تصاویر کا انتخاب جو وقتاً فوقتاً نیرنگ خیال میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ اس مجموعہ میں کل چھبیس تصاویر ہیں جن میں سے دس تصاویر سہ رنگی اور بیس تصاویر یکرنگی ہیں۔ تمام بڑے بڑے اور بہترین بلاک انتخاب کر لئے گئے ہیں۔ اور ہر تصویر آرٹ پیپر کے صرف ایک ہی طرف شائع کی گئی ہے یہ مجموعہ اپنی لائبریری میں رکھنے۔ یا آرائش کے لئے چوکھٹوں میں لگوا کر رکھنے کے لئے بہترین اور لاجواب ہے۔ ٹائیٹل بھی خوشنما لگایا گیا ہے۔ اس قسم کے تصویری البم جو کلکتہ کے انگریزی رسایل شائع کیا کرتے ہیں۔ ان کی قیمت دو روپے ہوا کرتی ہے۔ مگر ہم نے اس کی قیمت صرف ایک روپیہ چار آنہ رکھی ہے۔ حالانکہ بعض تصاویر اتنی قیمتی اور نظر فریب ہیں۔ کہ ایک ہی تصویر اس قیمت میں بازار سے دستیاب نہیں ہو سکتی۔ فی الفور طلب کیجئے +

نیرنگ خیال کے خریداروں سے محصول ڈاک معاف +

ملنے کا پتہ:- مینیجر نیرنگ خیال بکڈپو شاہی محلہ لاہور

پنکھڑیاں

مغرب اور مشرق کے جواہر رقم ادیبوں کی ادبی کاوشوں کا لاجواب مرقع ہے۔ تخیل کی پرواز کے ساتھ پند و موعظت کا گرانمایہ شاہکار ہے۔ فلسفہ جوش عمل۔ اخلاق محبت اور قانون فطرت کے متعلق سیکڑوں قیمتی چیزیں لکھی گئی ہیں۔ یہ چیزیں قلم سے نہیں خونِ دل سے لکھی گئی ہیں۔ آپ اس کتاب کو منگا کر لطف اُٹھائیے۔ اس میں ہندوستان کے بیسیوں مشاہیر ادبا کے مضامین درج ہیں۔ قیمت ۱۰ر۔ خریداران نیرنگ خیال سے ۸ر +

ملنے کا پتہ:- مینیجر نیرنگ خیال بکڈپو شاہی محلہ۔ لاہور

مزاحیہ :-

دریا پار شادی

از۔ ہبلچو قلندر آبادی

بجتسم کی شادی نہ ایسی نہ تھی جس میں کوئی دوست "بلا دعو" کئے شامل نہ ہوتا دوست تو دوست ہر ایک شناسا خواہشمند تھا۔ کہ اُس شادی میں ضرور شریک ہو۔ اور ہر فرد بشر کی خواہش بھی یہی ہونی چاہئے تھی کیونکہ بجتسم کو ہر وہ شخص خوش اور متبسم دیکھنے کا آرزو مند تھا۔ جس نے اُس کی سابقہ رفیقۂ حیات کی وفات پر اُس کو ننھے ننھے بچّوں کی طرح بلکتے ہوئے دیکھا ہو +

بجتسم بار بار یہی کہا کرتا تھا کہ اب اُس کی شادی کیا خاک ہوگی۔ اور کہتا تھا کہ بقیہ زندگی حورانِ جنت کی امید ملاقات اور اپنی چاہیتی بیوی کے فراق میں ہی بسر کردیگا۔ لیکن مدت مدید کے بعد اُس کی رگوں میں خون نے جوش مارا اور ہر محب سے ملتمس ہوا کہ اُس کی جدید رفیقۂ حیات تلاش کرنے میں مدد دے۔ لیکن اپنی ہونے والی بیوی کا "حدود اربعہ" وہ ایسا پیش کرتا تھا کہ سوائے حورانِ جنّت کے اس دنیائے ناپیدا کنار میں ایسی سیمتن کا ملنا دشوار تو کیا بلکہ ناممکن معلوم ہوتا تھا۔ فرض کیجئے کہ وہ ایسی عورت کا خواہشمند تھا کہ جس کے حُسن کی مثال آجتک اُس نے یا اُس کے کسی دوست نے اپنے ہوش وحواس کی قائمی میں کبھی نہ دیکھی ہو نہ سُنی ہو۔ صاحبِ ثروت ایسی ہو کہ اُس کو فکرِ معاش سے بے نیاز کردے۔ اور وہ نہایت امیرانہ بلکہ شاہانہ زندگی گذارے۔ صاحبِ فہم ایسی ہو کہ کسی معاملہ خود اس کو رائے زنی کی ضرورت نہ پڑے۔ یا اگر بھولکر کبھی بول بھی اُٹھے تو یقیناً اس کی بات دلائل سے غلط ثابت ہو اور اُس کو اعترافِ کم عقلی کرنا پڑے۔" وغیرہ ذالک"۔ القصہ وہ ایسی بیوی چاہتا تھا۔ جس کے ورودِ مسعود کے بعد وہ محض (شہد کی مکھی کے) نکھٹو کی طرح کا ہلانہ زندگی بسر کرے۔

"ایام بیوگی" یا "رنڈاپے" میں وہ ایسا مقبول ہوا کہ ہر معقول اور "نامعقول" شخص اُس کے خانۂ بے تکلف میں ہی اپنا فالتو وقت گذارنا چاہتا تھا۔ اور احباب کے لئے تو اُس کا مکان اچھے خاصے کلب گھر یا "رٹائرنگ ہاؤس" کا کام دیتا تھا جہاں کسی شخص کی بیوی گھر سے گئی اور وہ سیدھا بجتسم کے یہاں پہنچ گیا۔ غرض تمام محلہ کے مجرد اُس کے مکان میں مستقل طور سے رہا کرتے تھے۔ اور "رنڈووں" کے لئے تو اس سے بہتر ٹھکانا ہی اور کہاں میسّر تھا +

نسبت کے بعد بجتسم کی خسرال پورہ کے "بڑے مولوی صاحب" تشریف لائے اور ہر اُس شخص کو شادی میں دعو کر گئے۔ جو اُن کی زیارت کے لئے آیا۔ اور بجتسم کی بارات کو بہترین موقعہ قرار دیتے ہوئے ایسے مُصر ہوئے کہ گویا کل بارات اُنہی کے دولتسرا پر مقیم ہوگی۔ اس لئے ہر شخص دست بدعا تھا۔ کہ اے ربّ العزّت بجتسم کی شادی جسقدر جلد ممکن ہو بہتر ہے۔ تاکہ "بڑے مولانا" کی زیارت "سرکاری سفر خرچ" پر میسّر ہوسکے +

کبھی احباب تجویز پیش کرتے تھے کہ ایک ڈیپوٹیشن بجتسم کی خسرال میں بھیجا جاوے۔ جو شادی کی قریب ترین تاریخ لے کر واپس آئے۔ لیکن کوئی شخص تنہا اپنی جان بقائمی ہوش وحواسِ خمسہ ایسے خطرناک سفر کے لئے پیش کرنا نہ چاہتا تھا۔ جس میں کہ اُس کو علاوہ بادیہ پیمائی کے ایک دریا بھی عبور کرنا پڑے +

سَب آوڈ سیر کا تو یہ حال تھا کہ "بھئی بارات میں ضرور چلنا"۔ "دیکھنا یار کبھی وقت پر انکار کر بیٹھو"۔ "بھئی چھٹی وغیرہ کا ضرور انتظام کر لینا چاہئے"۔ "اتنی مدت رنڈوا رہنے کے بعد تو اب اُس کی شادی کا وقت آیا ہے۔ اُس کی خوشی میں ضرور شریک ہونا چاہئے"۔ ہر ایک کے گھر جا جا کر ایسے کہتے پھرتے تھے کہ گویا "بجتسم کورٹ آف وارڈس" کے یہی جنرل منیجر ہیں۔ حالانکہ سوت نہ کپاس جولاہے سے لٹھم لٹھا۔ یعنی ابھی خود رنڈوے دولھا نے بھی یہ فیصلہ نہیں کیا تھا۔ کہ کس کس کو بارات میں لے جائے گا اور کب بارات ہوگی +

جب احباب جمع ہوتے یہی چرچا رہتا۔ کوئی کہتا کہ ایسا نفیس سہرا بنانا چاہئے کہ تمام باراتی اور خسرال والے خوش ہی تو ہوجائیں۔ کوئی کہتا۔ کہ یار سب کے سب جبتک نہ چلیں لطف نہ آئے گا۔ غرض ہر وقت بجتسم کی شادی ہی کا تذکرہ زبان پر رہا کرتا تھا۔ اور اسی کے منصوبے دماغ میں گونجتے رہتے۔ یہاں تک کہ "چھوٹے مولوی صاحب"

نے بھی کہدیا کہ بھئی وعدہ تو ہم نے بھی "بڑے مولوی صاحب" سے کیا ہے کہ بارات میں ضرور آئیں گے۔

غرض اسی طرح دن اور رونوں کے بعد ہفتے گذرتے گئے۔ آخر کار وہ وقت آپہنچا۔ جبکہ تمام احباب اپنے بہتر سے بہتر کپڑے زیب تن کئے ایک دوسرے کو جمع کرتے ہوئے پھرنے لگے۔ کہ "بھئی چلو نا۔ موٹر بالکل تیار کھڑی ہے۔" بھئی جلدی کرو تم ہر ایک بات میں ٹلنے ہی کی فکر کیا کرتے ہو۔" "نہ بھئی چلنا ضرور ہوگا۔ تکلیف تو بیشک ہوگی۔ کیونکہ سفر ذرا بیہودہ سا ہے۔ اگرچہ آرام کے کُل ذرائع اختیار کئے جائیں گے۔ لیکن اُن گھنے جنگلوں اور ناہموار راستوں کا کیا بندوبست ہو سکتا ہے۔ جن پر سفر کرنا کسی حاملہ عورت یا دائم المریض یا نازک مزاج مرد کے لئے خالی از خطرہ نہیں ہو سکتا۔" بزدل تو ان خطرات سے ڈر کر شرکتِ بارات کا ارادہ ترک کر بیٹھے لیکن اکثر بے میرے سر بکف اپنی جان جوکھوں میں ڈالنے کے لئے "مرگِ انبوہ جشنے دارد" کے مصداق بالکل تیار ہو کر ساتھ ہو لئے۔ اور مزید اطمینان کے لئے "آتشین اسلحہ بھی ساتھ لے لئے۔

تمام راستے کوئی کہتا تھا کہ "بھئی انڈوں کا حلوہ کھانا چاہیے۔ تمام تکان دور کردے گا۔" کوئی کہتا تھا کہ "بھئی یہ بندوقیں کیوں ساتھ لی ہیں۔ کیا دُلہن بندوق کے سایہ میں آئے گی"۔ غرض مہذب احباب کی پارٹی جمع ہو کر جائے روانگی پر اس شان سے پہنچی۔ جیسے علاء الدین خلجی مع اپنی فوج ظفر موج کے "پدمنی" کے حصول کے لئے سر بکف میدان میں جا رہا ہو۔ رات بھر آرام کے بعد وہ سفر درپیش تھا جس کے خیال سے بھی آج تک "سرکاری سفر خرچ پہ بڑے مولانا کی زیارت کرنے والوں" کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مولوی لوگ وعظ میں کہا کرتے ہیں کہ سفرِ آخرت میں نہ کوئی بھائی کام آئے گا نہ باپ نہ جورو نہ بچّے۔ غرض کوئی متنفس اُس سفر میں مسافر کا بارِ گناہ ہلکا نہیں کر سکتا۔ بعینہٖ یہی حالت اس سفر میں درپیش آنے والی تھی۔ جس پر یہ "بہادر جانباز" گامزن ہونے والے تھے۔

اُن لوگوں نے جو اپنے آپ کو بارات کی سو بھا خیال کرتے تھے فیصلہ کیا کہ ہم اخیر وقت تک ایک دوسرے کا ساتھ نہ چھوڑیں گے۔ اور باقی بارات سے پہلے آہستہ آہستہ چل پڑیں گے۔ تاکہ منزلِ مقصود تک نہایت آرام کے ساتھ پہنچ جائیں۔

ناہموار کچّی سڑک اور چھکڑے کی سواری۔ خدا کی پناہ۔ سر آپس میں ٹکرا ٹکرا کر جامنوں کی طرح ہو گئے۔ اور اس پر راستہ کے گرد و غبار نے "توتیا باشی" کی کہ کچھ دور چلنے کے بعد ایک دوسرے کو بالکل شناخت نہ کر سکا۔ اور نفسی نفسی کا عالم طاری ہو گیا۔ "ارے میرے پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔" ایک بولا۔ دوسرے نے شکایت کی "ار میاں اس سے تو پیدل ہی اچھے تھے۔" "بیل کمبخت تو خود ہم سے کھنچنے کے متمنّی معلوم ہوتے ہیں۔" اگر کوئی نیچے اُتر جاتا تھا۔ تو گرد و غبار میں دفن ہو جانے کے خوف سے فوراً چھکڑے پر سوار ہو جاتا تھا۔ اور چھکڑے کی سواری عمر بھر کے گناہوں کا کفّارہ وصول کر رہی تھی۔ ایک صاحب بولے "سنگ آمد سخت آمد۔" دوسرے نے تائید کی "بھائی پھنس گئے تو پھڑکنا کیا۔" تیسرے معزز نے گرج کر فرمایا "ارے کم ہمتو! کیوں مرے جاتے ہو ع "شان مردوں کی نہیں کام ادھورا کرنا۔" اب تو گھروں سے باقاعدہ وداع ہو کر آئے ہو۔ دُلہن کو ضرور قبضہ میں لانا ہے۔ زندہ رہے تو غازی بن کر واپس چلے جائیں گے۔ ورنہ "بڑے مولانا" کے قدموں میں ہی جان دیدیں گے۔ اور شہادت کا رتبہ مفت میں حاصل کر لیں گے۔" دولہا صاحب زبان حال سے کہتے تھے "ہو جائیں دفن سایۂ دیوار کے تلے۔" دو ایک زندہ دلوں نے دریا کے گھنے جنگلوں میں پیٹ بھرنے کے لئے قسمت آزمائی شروع کر دی۔ آخر اس دوزخ کو تو بھرنا ہی تھا۔ کسی نے سچ کہا ہے "محنت کا پھل ضرور ملتا ہے۔ میٹھا ہو یا کڑوا۔" دو تین گھنٹوں کے متواتر حملوں کے بعد دو بہادر مبلغ دو عدد "پٹر مول" جان سے مار لینے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن اُن کے بنانے کے طریقہ سے معزز سرفروشان میں سے کوئی بھی واقف نہ تھا۔ آخر کار فیصلہ ہوا کہ ان ہر دو عجیب و غریب شکاروں کو اپنے مرکب کے دونوں طرف لٹکا دیا جائے۔ تاکہ "عروسئین" مرعوب ہو کر دلہن کو رخصت کرنے میں ٹال مٹول کرنے کی جرأت نہ کر سکیں کہ "پھر آکر لیجانا۔"

بعض معقول آدمیوں کو کہتے ہوئے ہم نے خود اپنے کانوں سُنا ہے کہ دریا کا عبور کرنا پل پر سے آسان ہے۔ مگر اس بارات کے معزز شرکاء اس بارہ میں "سخت شبہ" کا اظہار کرتے ہیں۔ کیونکہ ان سب لوگوں نے انہی آنکھوں سے ایک "زنجیر" موٹر مع ایک "نفر" انجینیر صاحب و "ایک راس" لیڈی انجینیر صاحبہ کے اس پل میں اس طرح دھنسا ہوا پایا جیسے دلدل میں تشریف لے جا رہے ہوں۔ ان بزرگ کی اس حالت کو دیکھ کر معزز باراتی اپنی خوش قسمتی پر نازاں تھے کہ شکر ہے ہم "موٹر میں لاد کر" نہیں لائے گئے۔ ورنہ آج مع موٹر کے غائب تھے۔

موٹر والے صاحب پل والوں پر بلے پڑتے تھے کہ ایک ساتھ زور لگاؤ لیکن باوجود تمام مساعی کے موٹر نہ نکلنا تھا نہ نکلا۔ باراتیوں پر عجیب کرب کی کیفیت

طاری تھی کہ یا اللہ! اسقدر مصیبت اُٹھاکر تو "منزلِ جاناں" کا قرب حاصل ہوا لیکن اب یہ موٹر "دیوارِ چین" بن کر حصولِ مدعا میں حائل ہوگئی۔ دریا میں کود نہیں سکتے۔ کیونکہ "عروس آباد" کی بجائے "عدم آباد" میں پہنچ جانے کا اندیشہ ہے۔ اور اگر واپس جائیں تو کس منہ سے۔ اجی منہ تو گیا بھاڑ میں۔ سر سے سے جا ہی کب سکتے ہیں؟ بعض تو گھبرا کر باوضو قبلہ رو ہو بیٹھے اور حلاّل المشکلات سے دست بدعا ہوئے۔ اسی جھمیلہ میں ایک من چلے باراتی نے قسمت آزمائی کی ہمت کی۔ اور خدا کا نام لے کر صاحبِ موٹر کی اس مہم میں زور آزمائی شروع کردی۔ "ہمتِ مرداں مددِ خدا" آخر ایک نکتہ نکل ہی آیا۔ اور موٹر سیٹر سے پل کے اُس پار ہوگئی۔ موٹر والے صاحب اُس انعام و اکرام کی بارش کو جو وہ ملاّحوں پر کرنا چاہتے تھے چار روز کے لئے ملتوی فرماکر "یہ جا وہ جا" ہوگئے۔

بارات کا "ہوائی جہاز" بھی اس پُلصراط سے گذرا اور خوب گزرا۔ اُن نحیف بیلوں کے سب معززین شکر گذار ہیں۔ جنہوں نے اِن کو اس "موٹر آزمائی" میں نہ ڈالا۔ اور صاف بچا کر لے گئے۔ آخر مسلمانوں کی بارات تھی۔ اور علما و اور جنٹلمینوں کا مجمع تھا۔ اگر اس دنیاوی پل صراط پر ہی اُلجھ جاتے۔ تو یوم الدین کے پُل صراط کو عبور کرنے کی اُمید ابھی سے موہوم ہو جاتی +

بعض نازک مزاجوں نے تکالیف کو اعتدال سے گذرتا ہوا خیال فرماکر احتجاجاً چھکڑے سے اُتر کر درختوں کے سایہ میں لیٹ کر استفراغ فرمانا شروع کردیا۔ اور ساتھیوں نے اپنے متفقہ عہد کو فراموش کرکے ان کو وہیں لُڑھکتا ہوا چھوڑ کر "کوئے جاناں" کی راہ لی۔ یہ مصیبت کے مارے بھی کسی نہ کسی طرح بیٹھتے اُٹھتے "بڑے مولانا" کے درِ اقدس پر جاکر لمبی تان ہی پڑے +

دلہن کے مکان سے تو "بڑے مولانا" ایسے غائب رہے گویا وہ کسی کو اس بارات میں آنے کے لئے مدعو ہی نہ کر آئے تھے۔ لیکن درماندگان راہ کی تیمارداری اور باراتیوں کی چارہ رسانی میں وہ اہتمام فرمایا کہ تمام کلفت فراموش ہوگئی۔ اگر بڑے مولانا بیماروں کی دیکھ بھال نہ فرماتے تو بارات کی واپسی پر یقیناً معزز باراتیوں کے رشتہ دار اپنے عزیزوں کو تلاش ہی کرتے پھرتے اور کہتے کہ

ع "ایسے گئے کہ خط بھی نہ بھیجا رسید کا"

غرض دُلہن کے گھر پہنچے۔ کھانے کھائے۔ اور اگلے روز علی الصباح اسی سفر زحمت اثر کی واپسی پر کمر باندھی جسکو کہ بدقت تمام ایک روز پہلے طے کیا تھا۔ دُلہن کے شہر میں باراتی آواز دیتے پھرتے تھے کہ "ہے کوئی اللہ کا بندہ جو آج رات ہمیں اور ٹھہرا لے"۔ "تاکہ ہماری کچھ تکان رفع ہو جائے" اور "ہم زندہ سلامت گھروں پر جانے کی اُمید کرسکیں"۔ لیکن وہ کیا کریں دستور سے مجبور۔ خواہ "کالے پانی" ہی بارات کیوں نہ جائے۔ مگر ٹھیر یگی صرف ایک رات +

اس تاریخی بارات کے شرکاء آجتک اپنے زخموں کے اندمال کی تدابیر دریافت کرتے پھرتے ہیں اور اکثر تو بیروں سے آجتک معذور ہیں یا بہانہ کئے ہوئے ہیں کہ کبھی پھر کوئی ایسی ہی بارات میں مدعو نہ کر بیٹھے۔ قصہ کوتاہ "رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت"+ دولہا بھی توبہ کرتا ہے کہ وہ آئندہ ہرگز ایسی حرکت نہ کرے گا۔ جس سے ایسے ایسے معززین کو دوبارہ بادیہ پیمائی کا موقعہ ملے اور باراتی بھی عہد کرتے ہیں کہ خواہ اُن کی شرکت کے بغیر کوئی شخص رنڈوا یا کنوارا ہی کیوں نہ رہے وہ ہرگز ایسی پُرخطر بارات میں شریک نہ ہونگے۔ اگرچہ کھانے کا نقصان ضرور برداشت کرنا پڑیگا +

اکثر سنا ہے کہ بوڑھا دولہا نوخیز دُلہن پر بُری طرح تصدق ہوا کرتا ہے یہی شکایت اس "پیر نابالغ دولہا" کے احباب کو اس "دریا پار کی شادی" سے پیدا ہوگئی اور ہم کو افسوس ہے کہ احباب نے اپنا ایک پُرانا رفیق خود اپنے ہاتھوں کھو دیا۔ اس لئے مجبوراً ہمیں اپنے معزز ناظرین کی خدمت میں نصیحت پیش کرنے کی ضرورت ہوئی ہے کہ جب تک وہ اپنے احباب سے بالکل تنگ نہ آجائیں اُس وقت تک ہرگز اُن کی شادی میں مدد نہ دیا کریں +

ہاں! احباب ابتک اس بات کے خواہشمند ہیں کہ دولہا سے معلوم کریں یا دیگر ذرائع سے اطمینان کرلیں کہ آیا دُلہن میں تمام مطلوبہ صفات موجود بھی ہیں یا نہیں۔ لیکن "کمر رد دولہا" ہر ایک سوال کے جواب میں ایک پُرمعنی طریقہ پر مُسکرا دیتا ہے۔ اور بس +

(خاص)

ھبلچو

سیّاح عورت کے خط کا جواب
اُس کے فوجی محب کی طرف سے

(طبعزاد)

از جناب کنور محمد یٰسین علی خاں صاحب

[یورپ کے ایک سرد ساحل سے ۔ مورخہ ۶ر دسمبر سنہ ۱ء]

حسین دلنواز و مست ناز!

میرے لئے محبّت کا تبسّم ہمیشہ تمہارے لبوں پر رقصاں رہے !

عرصۂ دراز کے بعد جبکہ میری اُمیدوں کا جہاز ناامیدی کی سنگلاخ چٹان سے ٹکرا کر تباہ ہو چکا تھا ۔ اور تمہاری جہاں نوردی کے شوق نے مجھ کو تمہاری نقل و حرکت سے بے خبر کر رکھا تھا ۔ تمہارا نامۂ اُلفت یکایک پہنچا' دشت ریگزار کے ایک پیاسے مسافر کو آبِ سرد کا ایک لبالب جام اسقدر مسرّت و فرحت نہیں پہنچا سکتا جسقدر تمہارے محبّت نامہ اور تمہاری خیریت دریافت ہونے سے مجھکو پہنچائی ؎

نامہ آیا گویا عیسےٰ آیا   تنِ بیمار میں جی سا آیا

خیر، اب بھی پوچھا تو مہربانی کی' غضب خدا کا دو سال کا طویل عرصہ اسقدر تاریکی میں گذر گیا کہ نہ تمہارا کوئی خط آیا اور نہ خیریت دریافت ہوئی ۔ ہر جگہ ڈاک کا انتظام میسّر تھا اور رسل و رسائل خطوط کا سلسلہ موجود ہرابر خط لکھ سکتی تھیں لیکن یہی کہو کہ میری محبّت پر شوقِ سفر غالب رہا' آہ مجھکو اس پر بھی رشک ہوتا ہے ؎

شرکتِ غم بھی نہیں چاہتی غیرت میری   غیر کی ہو کے رہے یا شبِ فرقت میری

ہاں صاحب کسی کی جان جائے یا رہے آپ کی بلا سے غمِ مفارقت کسی کا کام ہی کیوں نہ تمام کر دے مگر آپ کی بیزار سے ۔ بہت اچھا ؎

ستا لو جتنا ستایا جائے مٹا لو جتنا مٹایا جائے
بلا سے بن جائے جاں پہ اپنی قدم نہ پیچھے ہٹائیں گے ہم

توبہ توبہ کیسی کیسی ہَولیں اُٹھتی تھیں ۔ خوفناک توہمات گھیرے رہتے تھے ۔ تمہارے یکایک غائب ہو جانے اور خط نہ آنے سے کبھی خیال ہوتا تھا کہ نصیب اعدا سفر میں کہیں نازک طبیعت تو ناساز نہیں ہو گئی یا خانہ بدوش وحشی اور ظالم بادیہ نشینانِ دشت کے ہاتھوں میں گرفتار تو نہیں ہو گئیں ۔ خیالات کا سلسلہ اگر اس سے بھی آگے بڑھتا تو وہ روح فرسا وہم پیدا ہوتا کہ جس کو لکھتے ہوئے قلم بھی لرزتا ہے ۔ اور جس کا نتیجہ یہی ہوتا کہ میری نظروں میں عالم فانی کے دلچسپ مشاغل مبدّل بہ رنج و الم ہو جاتے اور رختِ ہستی کا نفرت انگیز بارِ گراں ناقابل برداشت ہو جاتا ۔

مگر خدا کا شکر ہے کہ تم زندہ و سلامت واپس آگئیں ۔ میری دراز شبہائے فراق مسرور روزِ روشن میں تبدیل ہو گئیں ۔ کیا تم یقین کرو گی اگر میں کہوں کہ کوئی لمحہ ایسا نہیں گذرتا تھا جس میں تمہاری یاد نہ آتی ہو' ہر وقت میری آنکھوں میں تمہاری حسین و جمیل شکل و صورت' اور معمور تھی میری ہر رات تم کو خواب میں دیکھنے کے لئے عجب کبھی بیتا ۔ سحر کی ہلکی روشنی اُفق مشرق میں پھیلتی ہوئی نظر آتی تھی تو تمہارا دلفریب نورانی تبسّم (جو خاص میرے لئے وقف تھا) یاد آ جاتا' طلوع ہونے والے آفتاب پر تمہارے رخساروں کا گمان ہوتا ۔ اور شام کو شفق رنگین کی طلائی تحریر دیکھ کر تمہارے لب ہائے نازک کی سرخی آنکھوں میں پھر جاتی ۔ ہاں میں تمہاری یاد سے کبھی غافل نہیں تھا ۔ حتیٰ کہ جب ملک اور پیارے وطن کی خدمت کا مقدس فرض، نمکحلالی اور وفاداری کا پاک جذبہ اُس حشر انگیز معرکۂ دار و گیر میں پہنچا دیتا جہاں موت کی دیوی انسانی ہستیوں کا قیمتی خون اپنے قدموں میں بہا دیتی ہے تو وہاں بھی میں تمہاری شکل کو دل میں اور تمہارے خیال کو دماغ میں

31613

لئے ہوئے جاتا ۔

میدانِ جنگ کی بہادرانہ سرگرمیوں اور سرفروش کارگذاریوں میں بارہا ایسا ہوا ہے کہ تم کو اپنی جمال خیز صورت میں روبرو کھڑا ہوا پاتا۔ جس سے میری ہمّت دوگنی ہو جاتی اور رائفل کا ایسا سچّا نشانہ لگتا کہ دشمن خاک و خون میں دم توڑتا نظر آتا۔ دست بدست لڑائی میں بھی یہی خیال میرا معین و مددگار ہوتا تھا۔ میرے پنجہ کی گرفت قبضہ پر اور زیادہ مضبوط ہو جاتی اور شمشیر دشمن کے کاسہ سر سے گذرتی ہوئی درمیان میں سے اُس کے دو ٹکڑے کر دیتی اور میرے خاردار سنگین کے ایک ہی زبردست حملہ سے پیٹ کی آلائش باہر آ پڑتی تو بالآخر میں مظفر و منصور تحسین و آفرین کے غلغلۂ شادمانی کے درمیان اپنے وطن کے پُر استقبال بازاروں میں خیر مقدم کے پُر جوش نعروں کو سنتا ہوا واپس پہنچا۔

میری سدا بہار گلستانِ محبّت کے خوبصورت پھول!! تم سمجھ سکتی ہو کہ میری اس طویل تحریر کا ماحصل سوائے اس آرزو کے اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ میں عرض و گذارش اور التماس جیسے عاجزانہ الفاظ میں تم جیسی ملکۂ حسن کی بارگاہ میں درخواست پیش کروں کہ آئندہ تغافل کو خیر باد کہہ کر جہاں کہیں بھی ہو اپنی خیریت کے مختصر لفظوں سے یاد و شاد کرتی رہو گی۔ میں اس کا ضرور مشکور ہوں کہ وطن پہنچتے ہی فرصت اولین میں سب سے پیشتر تم کو اس دور اُفتادہ کا خیال آیا۔ اور تمہارے اُن اشعار نے جو عنوانِ خط کو زیب دے رہے ہیں، میری تمام ہجر کی کلفت اور فراق کے آلام کا خاتمہ کر دیا ۔

اگر خدا کو منظور ہے تو محبّت کے پروں پر اُڑتا ہوا بہت جلد تمہارے پاس پہنچنے کی کوشش کرونگا۔ تم سمجھ سکتی ہو کہ میری خدمت کی اہم ترین ذمہ داریاں بہت کم یہاں سے مجھ کو علیحدہ کرتی ہیں ۔

میرے اشتیاق کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ اور ان مسرّت آگیں لمحات کا بے تابانہ منتظر ہوں کہ جب قندیل فلک کی نقرئی روشنی کے سیلاب میں ہم دونوں دست بدست باغ میں فوّارہ کے پاس بیٹھے ہوئے ہونگے اور تم اپنی سامعہ نواز آواز میں سیاحت کے افسانے سُنا رہی ہوگی۔ اور انتظار ہے پُر کیف فضا کی اُس بہار افروز ہر ایک شام کا جس میں گل افروز گلشن کے نزہت آگیں کنج بہاری گلشت سے لبریز ہوں اور تمہارے کاکلِ عنبریں روئے تاباں کے گرد ایک آبنوسی حلقہ بنائے ہوئے ہوا کی شوخیوں سے دوشِ بلوریں پر منتشر ہوں اور ہر ایک صبحِ خنداں کو صحنِ لالہ زار ہمارے استقبال کے واسطے گل بداماں نظر آئے اور ہم ایک دوسرے سے ایامِ جدائی کے قصص بیان کرتے ہوئے چہلقدمی میں مصروف ہوں ۔

وطن میں پہنچنے سے جو خوشی تم کو ہوئی وہ حیرت انگیز نہیں۔ بے شک ؎

حُبِّ الوطن از ملکِ سلیماں خوشتر خارِ وطن از سنبل و ریحاں خوشتر

لیکن وطن کی قدر بھی پردیس کی مصیبتیں اور تکالیف اُٹھانے کے بعد ہی ہوتی ہے ہر چیز کی قدر و قیمت اپنے مامن سے علیحدہ ہونے کے بعد معلوم ہوتی ہے، جواہرات کان سے نکل کر تاجِ شاہی میں جگمگاتے ہیں۔ موتی دریا سے باہر آ کر کسی ماہوش کے گلوئے مصفّٰی کی زیب و زینت ہوتا ہے اور گل خوشرنگ چمن چھوڑنے کے بعد گلے کا ہار ہوتا ہے ۔

ایک زمانہ میں جبتک میری خدمات اپنے پیارے وطن کے لئے وقف نہیں ہوئی تھیں۔ میں نے بھی برّاعظم یورپ و افریقہ کا سفر کیا تھا جس کے حالات بروقت ملاقات تم کو سناؤں گا۔ میں یورپ کے معروف شہر اور شہروں کے مشہور مقامات کو دیکھتا ہوا فرانس سے گذر کر کوہسار پیرنیز کی سدا بہار اور ہری بھری گھاٹیوں کو عبور کر کے اسپین پہنچا۔ وہ اسپین کہ جس کا ذرہ ذرہ اپنے ملک کی عظمت شہرت اور اُس میں حکومت کرنے والے جلیل القدر اور اولوالعزم فرمانرواؤں کی کشورستانی اور آئین جہانبانی کی داستانوں سے معمور ہے۔ غرناطہ، طلیطلہ اور قرطبہ جیسے شہروں کی سیر کی جہاں شاہانِ اسلام کے بنائے ہوئے فلک بوس محلات دیکھے۔ جن کے خوبصورت نقش و نگار اور وسعت و پختگی ماہرِ فن اور ہوشیار صنّاعوں کی دستکاری کا اعلیٰ نمونہ ظاہر ہو رہے تھے۔ میرے پاس سب کی تصاویر موجود ہیں جو تم کو دکھاؤنگا اور تم سے مشرقی ممالک کا حال سنونگا ۔

تم نے ہندوستان بھی دیکھا ہوگا۔ وہ ہندوستان جو موسمی اعتبار سے اعتدال پسند واقع ہوا ہے۔ سنا ہے وہاں گرمی بھی ہوتی ہے اور سردی بھی۔ موسلا دھار بارش بھی ہوتی ہے اور آفتاب بھی چمکتا ہوا نکلتا ہے۔ اور ماہتاب بھی خندۂ ضیا بار سے اُس حصّہ زمین کو منوّر کرتا ہے، تم نے راجپوتانہ کے تپتے ہوئے ریگستان، بادِ سموم کی لپٹیں اور آندھیوں کے طوفان بھی اُٹھتے ہوئے دیکھے ہونگے۔ اور کشمیر جنّت نظیر کی پُر فضا وادیاں، فرحناک باغات۔ اور مصفّٰی آبشاروں کی بھی سیر کی ہوگی۔ دہلی کا لال قلعہ اور جامع مسجد۔ آگرہ کا تاج محل اور ایسی ہی بہت سی عمارتوں کو بھی دیکھا ہوگا۔ اور وہاں کے باشندوں کی بود و باش، تمدّن و ارتقا کا بھی بغور مطالعہ کیا ہوگا۔ باشندگانِ ہند کے متعلق عجیب روایات سُنی ہیں کہ چونکہ وہاں مختلف اقوام مختلف مذاہب کو ماننے والی آباد ہیں۔ اس لئے کبھی مذہبی اختلافات جذبات نفسیہ کی کشمکش اور منافرت کا سبب بن کر ایک دوسرے کو خون کا پیاسا بنا دیتے ہیں اور ذرا ذرا سی بات پر فسادات رونما ہو جاتے ہیں۔ اور کبھی یہ بھی سُنا جاتا ہے کہ سب

متفق ہوکر باہم شیر وشکر ہوجاتے ہیں۔ اور اتفاق واتحاد کی ایک ایسی روح اس میں سرایت کر جاتی ہے کہ دیکھنے والا خیال کرتا ہے کہ یہ وہ بھائی بھائی ہیں جو آپس میں برسر جنگ ہونا جانتے ہی نہیں۔ بھلا تم ایسی ذہنیت کو کیا کہو گی؟

جی تو نہیں چاہتا کہ اپنے نامۂ شوق کو ختم کردوں۔ اظہار مدعا اور عرض مطلب کے واسطے دفتر بے پایاں درکار ہے۔ لیکن خیال ہے کہ کہیں یہ طویل تحریر تمہاری طبع نازک کو مکدر نہ کردے۔ لہٰذا خط کو ختم کرتا ہوں۔ اور جواب کے انتظار میں آنکھیں برابر سرکارۂ فلک کی طرف نگراں رہینگی ٭

کہیں ایسا تو نہ ہوگا کہ اس مرتبہ بھی دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں اور مہینے سال میں تبدیل ہوجائیں۔ اور اس خط کے جواب کو تمہاری طرف سے جواب ہوجائے۔ اور میں عالم وحشت میں چلاّتا پھروں ؎

ہم آن کو نامے ہزار لکھتے جو کچھ بھی چشم امید ہوتی
جواب تقدیر دیچکی ہے۔ جواب ہم لیکے کیا کرینگے

(خاص) (دکنوری) محمد یسین علیخاں

”وہ واپس کیوں نہیں آتے“

اُنہوں نے دبی آواز میں کہا ”میری پیاری! نگاہ تو اونچی کرو“ میں نے کرخت لہجہ میں جواب دیا:۔

”بس یہاں سے چلے جایئے“ لیکن وہ قطب از جانمی جنبد کا مصداق بنے میرے سامنے کھڑے تھے۔ میرے دونوں ہاتھ ان کے ہاتھوں میں تھے۔ میں نے کہا ”مجھے چھوڑ دو“ لیکن اُنہوں نے نہ چھوڑنا تھا نہ چھوڑا اور نہ جانا تھا نہ گئے ٭

وہ اپنا چہرہ میرے کانوں تک لائے۔ میں نے اُن کی طرف دیکھا اور کہا ”تم کو شرم نہیں آتی؟“ لیکن اُن کے ہونٹوں کو جنبش نہ ہوئی ٭

اُن کے لبوں نے میرے رخساروں کو چھوا۔ میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ بدن میں جھرجھری پیدا ہوئی۔ اور میں نے اُن سے کہا ”تم بڑے نڈر ہو“ مگر اُن کو شرم کہاں ٭

اُنہوں نے میری چوٹی میں پھول گوندھے۔ میں نے کہا ”یہ سب بیکار ہے“ لیکن اب وہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ نہ تھے ٭

اُنہوں نے میری گردن سے پھولوں کا ہار اُتار لیا اور چلدیے۔ میں دل ہی دل میں پچھتاتی ہوں۔ آٹھ آٹھ آنسو روتی ہوں اور سوچتی ہوں کہ ”وہ واپس کیوں نہیں آتے“ ٭

(ٹیگور) (خاص) اظہر فاروقی اوڈے پرتاپ کالج بنارس

بچوں کیلئے مفید کتابیں

قرآن کے سبق	قیمت ۶ر	بچوں کی گلستاں	قیمت ۶ر	اولیاء اللہ کی کہانیاں	قیمت ۶ر	بچوں کا مکتب	قیمت ۶ر
قرآن کی کہانیاں	۶ر	بچوں کی بوستاں	〃 ۶ر	بچوں کی تعلیم و تربیت	〃 ۶ر	بچوں کی خطوط نویسی	〃 ۶ر
بچوں کی حدیثیں	۶ر	پیغمبروں کی کہانیاں	〃 ۶ر	بچوں کے اخلاقی سبق	〃 ۶ر		

ملنے کا پتہ۔ منیجر نیرنگ خیال نمبر ۲ پوشاہی محلہ لاہور

اِس میں میرا کیا قصور ہے

از جناب محمد حکیم جعفری ۔ بی ۔ اے ۔ انڈر گریجویٹ ۔ جونپور

ہماری بھی عجیب عادت ہے ۔ جہاں کسی ایسے شخص کو دیکھا جس میں حماقت کے جراثیم موجود ہوں ۔ فوراً اُس سے بغض للّٰلہ ہو جاتا ہے اور خواہ مخواہ اُس کی صورت دیکھ کر خون کھولنے لگتا ہے ــــــــ قسمت بھی ہم نے وہ پائی ہے کہ جہاں ریل کا سفر ہم نے کیا چاہے ایک ہی اسٹیشن جانا ہو ۔ ایک نہ ایک ایسا شخص مل ہی جاتا ہے ۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ میرا قصور ہے ۔ اور خود مجھے بھی شبہ سا ہو چلا ہے ۔ جس کی وجہ سے میں نے سفر کرنا ہی چھوڑ دیا ہے ۔ اور بالکل "غیر منقولہ" ہو گیا ہوں ۔ مگر بتقاضائے بشریت کبھی کبھی قطبیت کو بالائے طاق رکھنا ہی پڑتا ہے ۔ اگر ایسی صورت میں بھی کسی ایسے شخص سے مڈبھیڑ ہو جائے تو آپ ہی انصاف فرمائیے کہ اسمیں میرا کیا قصور ہے ؟

شامتِ اعمال سے مجھے سہارنپور سے بنارس کا سفر درپیش ہوا ۔ لاکھ لاکھ کوشش کی کہ ٹالا بتادوں ۔ مگر ضرورت بھلا کیوں ماننے لگی ۔ مجبوراً سنگ آمد و سخت آمد سمجھ کر تن بہ تقدیر چل کھڑا ہوا ۔ اور یہ تہیّہ کر لیا کہ چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہو میں کسی ایسے شخص کا خیال بھی دل میں نہ آنے دونگا جس سے مجھے نفرت ہو ۔ چنانچہ سارا زور صرف کرکے ذہن کو ہر طرف سے خالی کر لیا ۔ اور ڈیوڑھے درجے کے ایک چھوٹے ڈبہ میں جس میں صرف تین بنچیں ہوتی ہیں ۔ جا کر بیٹھا کہ نہ زیادہ آدمی آئیں گے نہ کسی ذاتِ شریف سے ملاقات ہوگی ۔ اس ڈبہ میں پہلے سے ایک بنچ پر ایک بنگالی بابو معہ اپنے "زنانہ" کے جلوہ فرما تھے ۔ دوسری بنچ پر ایک سکھ صاحب رونق افروز تھے ۔ صرف ایک بنچ خالی تھی ۔ جس پر خاکسار نے ڈیرا ڈالا ۔ اللہ اللہ کرکے لکھسر تک راستہ بخیر و خوبی کٹ گیا ۔ مگر گاڑی کا لکھسر اسٹیشن پر پہنچنا تھا کہ ایک جم غفیر نظر پڑا ۔ میری بدقسمتی سے صاحب لوگ منصوری پہاڑ سے اتر رہے تھے اور اپنی اپنی جگہ واپس جا رہے تھے ۔ میرا ماتھا دیکھتے ہی ٹھنکا کہ یہاں سے بخیریت گذرنا محال ہے ۔ اس خیال کا آنا تھا کہ دروازہ پر ایک میلہ سا لگ گیا اور وہ شور برپا ہوا کہ خدا کی پناہ ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سارا ہجوم اسی ایک درجہ میں بھرنا چاہتا ہے ۔ بہت بہت لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی کہ بھائی اس ڈبہ میں جگہ نہیں ۔ آگے والا درجہ بالکل خالی پڑا ہے ۔ مگر کون سنتا ہے ۔ ایک صاحب نہایت چراغ پا ہوئے کہ "جناب ! آپ ہی اس خانہ میں چلے جائیے " اس مسکت جواب کے بعد کسی سے کچھ کہنے کی ہمت مجھ میں باقی نہ رہی اور ایک کونے میں خاموش بیٹھ رہا اب کیا تھا ۔ وہ طوفان برپا ہوا کہ الاماں ۔ گویا انگریزی خندق میں جرمن گھس پڑے یا دوبارہ سنہ ۵۷ء کا غدر مچ گیا ۔ گاڑی تھی کہ نہ اب چلنے کا نام لیتی تھی نہ تب ۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ انجن ڈرائیور افیم کھا کر پینک میں آ گیا یا گارڈ نوکری سے علیحدہ کر دیا گیا ۔ یا شاید سوراج ہو گیا ۔ انتظار کرتے کرتے میں عاجز آ گیا ۔ بارے خدا خدا کرکے گاڑی چلی ۔ باہر کی یورش بند ہوئی اور اندر کا تلاطم کم ہوا تو سانس لینے کی مہلت ملی ۔ جو سین نظر پڑا اس کو دیکھ کر ہوش و حواس دونوں غائب ہو گئے ۔ کم و بیش دو درجن اور کئی درجن بکس ۔ بستر بھاری لاٹھیوں کے بنڈل ۔ سب اس طرح تلے اوپر دھرے ہوئے تھے کہ سواریوں اور اسباب میں فرق کرنا مشکل تھا ۔ اور سب پر طرّہ یہ کہ میری بنچ پر بغل ہی میں ایک ذات شریف موجود ۔

ذرا حضرت کا حلیہ ملاحظہ ہو ۔ چھ فٹ کے تو آپ خود ۔ اس پر کم از کم ایک فٹ کے بال جو سر پر بالکل کھڑے کھڑے تھے (میں نے بچپن میں ایک تصویر کہیں دیکھی تھی ۔ جو شیطان کی کہی جاتی تھی ۔ اُس کی خصوصیت صرف اتنی یاد ہے کہ اُس کے سر کے چاروں طرف لمبے لمبے بال عمود کی طرح کھڑے تھے ۔ چنانچہ میرے ذہن میں شیطان کی یہی صورت قایم ہے اور میرے نزدیک اس کی پہچان بھی یہی ہے ۔ کسی شخص کے سر کے بال اگر کھڑے ہوں تو میرے دل میں فوراً خیال گزرتا ہے کہ کہیں یہی شیطان نہ ہو) نہایت پتلی اور لمبی ٹانگیں جس میں آپنے نکر (انگریزی وضع کا گھٹنا) اور ہوز (لمبا موزہ) پہن رکھا تھا ۔

جس سے آپ کی لمبائی میں معتد بہ اضافہ معلوم ہوتا تھا۔ قابلیت آپ نے یہ فرمائی تھی کہ باوجودیکہ اکتوبر کی شام تھی اور اندھیرا ہو چکا تھا۔ مگر عینک جناب نے وہ لنگار رکھی تھی جو مئی جون میں دھوپ سے حفاظت کے لئے لگائی جاتی ہے۔ گویا جتنی روشنی اس وقت تھی خیر سے وہ بھی آپ کے لئے زیادہ تھی۔ پھر آپ ہی بتائیے کہ مجھے ان بزرگوں سے کیسے پڑھ نہ ہوتی اور اسمیں میرا کیا قصور تھا +

حضرت کا قرب ہی سوہان روح تھا۔ مگر معاملہ یہیں پر ختم ہو جاتا۔ تو میں مان لیتا کہ میرا ہی قصور تھا۔ حضرت نے حرکتیں وہ شروع کیں کہ ہر شخص کا پیمانۂ صبر لبریز ہو کر چھلک جائے۔ میری جگہ کوئی دوسرا شخص ہوتا تو وہ بھی یقیناً وہی کرتا جو میں نے کیا +

وہی (نہایت کرخت اور تحکمانہ لہجہ میں) کہئے صاحب کہاں جائیے گا +

جی میں تو آیا کہ اُن کے لہجہ کا خیال کرتے ہوئے کچھ ٹیڑھا سا جواب دوں۔ مگر اس ڈر سے کہ کہیں میرا ہی قصور نہ ہو بہ سہولت جواب دیا:۔

میں۔ مجھے بنارس جانا ہے +

وہی۔ آہا۔ خوب۔ تو آپ بھی میرے ساتھی ہیں +

بتائیے اسمیں میرا کیا قصور تھا۔ اگر میں نے اپنے دل میں کہا کہ "خدا نہ کرے میں آپ کا ساتھی بنوں" اور اس سلسلہ میں حفظ ماتقدم کی جتنی دعائیں یاد تھیں سب پڑھ ڈالیں اور آفات و بلیّات سے بچنے کے جتنے ٹوٹکے معلوم تھے سب کر ڈالے +

وہی۔ (آپ ہی آپ) مجھے جانا تو دراصل ہے گورکھپور۔ مگر چونکہ راستہ معلوم نہیں تھا میں نے اپنا سارا اسباب بنارس کو بک کرا دیا ہے +

مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے مسکرا کر کہا: "بہتر تو یہ ہوتا کہ آپ اپنا اسباب ہوڑا اسٹیشن کے لئے بک کرا دیتے" +

وہی۔ مگر اس میں وقت یہ تھی کہ ہم لوگ گورنمنٹ سروس والے بڑے مجبور ہیں۔ آئے دن تبادلہ ہوتا رہتا ہے۔ اور اسباب کے لئے کرایہ ہمیشہ نا کافی ملتا ہے۔ اس لئے ہم لوگ سب سے قریب کا راستہ اختیار کرتے ہیں ـــــ میں سب رجسٹرار ہوں۔ میرا تبادلہ منصوری سے گورکھپور کو ہو گیا ہے۔ اسباب میرے ساتھ بہت ہے۔ آپ کے ساتھ بہت تھوڑا اسباب ہے۔ آپ کیا کام کرتے ہیں +

میں۔ وکالت کرتا ہوں +

وہی۔ کہاں +

میں (اپنے جی میں ـــ اسوقت تو جہنم میں) لکھنؤ میں +

وہی۔ کتنی ماہوار آمدنی ہوگی +

آپ ہی بتائیے اسمیں میرا کیا قصور تھا۔ اگر میں نے بیٹھے بیٹھے آنکھیں بند کر لیں اور سو تا بن گیا۔ ذات شریف نے اپنے سوال کو دہرایا۔ مگر یہاں صدائے برنخاست۔ پھر آپ ہی آپ یہ کہہ کر کہ "اچھا آپ سو گئے"۔ دوسری طرف مُڑ گئے۔ اور میری جان میں جان آگئی +

حضرت کی بغل میں دوسری طرف ایک بیچارے صورت شکل کے بھلے آدمی بیٹھے تھے۔ بغیر کسی تمہید کے آپ نے اُن سے فرمایا +

وہی۔ آپ کیا کام کرتے ہیں +

بھلے آدمی۔ میں ریلوے میں انجنیر ہوں +

وہی۔ اخاہ۔ آپ بھی میری طرح گورنمنٹ سروس میں ہیں +

انجنیر۔ جی ہاں یہی سمجھ لیجئے +

وہی۔ کیا تنخواہ پاتے ہیں +

انجنیر۔ میں ابھی مقرر ہوا ہوں۔ ساڑھے چار سو پاتا ہوں +

وہی۔ کہاں سے آپ نے پاس کیا ہے۔ گورنمنٹ سروس میں تو باقاعدہ ڈگری کی ضرورت ہوتی ہوگی +

انجنیر۔ لندن سے +

وہی۔ کس درجہ میں +

انجنیر۔ اوّل درجہ میں +

وہی۔ اسی وجہ سے گورنمنٹ سروس میں لئے گئے۔ کہاں جا رہے ہیں +

انجنیر۔ نینی تال +

وہی۔ کیوں +

انجنیر۔ سرکاری کام سے +

وہی۔ یعنی گورنمنٹ سروس پر جا رہے ہیں۔ تو آپ کے پاس تو ریلوے کا پاس ہوگا +

انجنیر۔ جی ہاں +

وہی۔ تو آپکو اسباب بک کرانیکی زحمتوں کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے +

انجنیر۔ خوش قسمتی یا بدقسمتی سے اس وقت میرے پاس زیادہ سامان نہیں ہے +

وہبی۔ (درجہ کے سارے اسباب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) مجھے دیکھئے کہ اتنا سامان تو ساتھ ہے اور مال گاڑی کا ایک پورا ڈبہ اسباب بک کرا چکا ہوں +

انجنیر۔ تو آپ اتنا سامان کیوں رکھتے ہیں کہ زحمت ہو +

وہبی۔ جی۔ ہم لوگ گورنمنٹ سروس والے اتنا سامان رکھنے پر مجبور ہیں +

انجنیر۔ (مسکرا کر) میں تو ایسا کوئی قاعدہ نہیں جانتا +

وہبی۔ (نہایت متانت سے) کوئی سرکاری قاعدہ نہیں۔ بلکہ اپنا رعب قایم رکھنے کے لئے +

جب غریب انجنیر پر جرح ہو رہی تھی۔ میں بار بار ارادہ کرتا تھا کہ حضرت سے کہدوں کہ ایک سوال باقی رہا جاتا ہے۔ یعنی انجنیر صاحب بدھ کے دن انڈے کھاتے ہیں یا نہیں۔ مگر اس ڈر سے کہ کہیں میرا ہی قصور نہ ہو خاموش ہی ہو رہا۔ ایک گھنٹہ سر کھپانے کے بعد جس میں کم از کم سیکڑوں مرتبہ گورنمنٹ سروس کا لفظ ذات شریف نے استعمال کیا ہوگا۔ انجنیر صاحب خاموش ہو رہے۔ اور آن کی خوش قسمتی سے بریلی کا اسٹیشن بھی آگیا۔ جہاں نینی تال جانے کے لئے انہیں گاڑی بدلنی تھی۔ اس طرح آن کی گلو خلاصی ہوگئی

ذات شریف نے دو ایک حملے سامنے والی سکھ بنج کے سکھ مسافر پر بھی کئے۔ مگر اس نے سنی ان سنی ایک کردی۔ شاید اس اثنا میں وہ ان سے واقف ہوگیا تھا۔ بنگالی بابو کو حضرت نے مخاطب کرنا چاہا۔ مگر خوش قسمتی سے وہ ان کی زد سے باہر تھے اور اپنے "زنانہ" سے باتوں میں اسقدر منہمک کہ ہمارے ذات شریف کو مداخلت بیجا کرنے کی ہمت نہ پڑی اور اپنا سا منہ لے کر رہ گئے +

کوئی اور شکار پھنستا نہ دیکھ کر یا کسی اور کو لائق خطاب نہ پا کر ہمارے بزرگوار نے سونے کی اور مجھ پر آفت ڈھانے کی ٹھیرائی یعنی اس چھوٹی سی بنچ پر جس پر صرف ایک آدمی سو سکتا ہے۔ باوجودیکہ دو آدمی آپ کے سرہانے ابھی بیٹھے تھے اور میں پائنتی کونے میں بیٹھا تھا۔ آپ نے لمبی تانی۔ جوں جوں گاڑی آگے بڑھتی گئی۔ آپ کا پاؤں بھی پھیلتا گیا۔ یہانتک کہ آپ تقریباً کل بنچ کے مالک تھے۔ میں سکڑتے سکڑتے کونے میں اسقدر چپک گیا تھا کہ میرا عدم اور وجود دونوں برابر تھا +

لوگ کہتے ہیں کہ سولی پر بھی نیند آتی ہے۔ پہلے اگر مجھے اس میں کچھ شبہ رہا ہو تو وہ دور ہوگیا۔ اور اس روز کے بعد یقین ہوگیا یعنی باوجود اس کوفت کے بھی میری آنکھ لگ گئی +

شاہجہانپور کے اسٹیشن پر ایک کرومین (ٹکٹ کلکٹر) نے آکر ٹکٹ مانگا۔ اندازاً رات کے تین بجے ہونگے۔ میں نے اپنا ٹکٹ حوالے کردیا۔ جب ذات شریف سے ٹکٹ مانگا۔ تو لگے جھگڑا کرنے +

وہبی۔ آپ لوگوں کی یہ کیا عادت ہے کہ رات ہی کو آکر جگاتے ہیں +

کرومین۔ میں مجبور ہوں میری ڈیوٹی یہیں سے شروع ہوتی ہے +

وہبی۔ تو آپ کو معلوم نہیں کہ رات کو جگانے کا حکم نہیں ہے +

کرومین۔ یہ قاعدہ صرف اونچے درجہ کے مسافروں کے لئے ہے +

وہبی۔ کیا معنی۔ ہم آدمی نہیں۔ آپ جانتے نہیں کہ میں گورنمنٹ سروس میں ہوں +

کرومین۔ تو آپ اوّل یا دوئم درجہ میں کیوں سفر نہیں کرتے کہ رات کو جگائے نہ جائیں

اس کے بعد میں سو گیا۔ مگر جھگڑا جاری رہا +

یکبارگی کان میں ایک ہونہ کی آواز آئی جیسے کسی نے گھونسہ چلایا ہو اور دوار خالی گیا ہو۔ آنکھ کھول کر دیکھتا ہوں کہ ذات شریف کھڑکی میں سے نصف سے زیادہ جسم نکالے کرومین سے گتھم گتھا کی مشق کرنے کی سعی بلیغ فرما رہے ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ چلاتے بھی جاتے ہیں۔ "مکہ جو خالی گیا تو آپ نہایت تیزی سے باہر نکلے۔ اور کرومین ہاتھ پکڑ کر گھسیٹنا شروع کیا۔ کہ "چلو گارڈ سے تمہاری شکایت کرتا ہوں۔ کہ میں نے ساڑھے چار ٹکٹ تمہیں دیئے اب تم ساڑھے تین ہی واپس کر رہے ہو

کرومین۔ آپ گارڈ سے شکایت کریں یا جس سے جی چاہے۔ جتنے ٹکٹ آپنے مجھے دیئے تھے۔ میں نے اُتنے ہی واپس کئے۔ بھلا میں آپ کا ٹکٹ لیکر کیا کرتا +

وہبی۔ میں نہیں مانونگا تمہیں چلنا ہوگا +

غرضکہ نہایت شد و مد سے وہ بزرگوار کرومین کو گھسیٹ کر لیگئے۔ اور تھوڑی دیر بعد ہانپتے ہوئے گاڑی میں آکر پھر بیٹھ گئے اور گاڑی روانہ ہوگئی۔ میں پھر سو گیا۔

ہردوئی کے اسٹیشن پر جب گاڑی رکی تو وہی کرومین پھر آیا۔ اور کہا کہ "جناب اپنی جیبوں میں پھر تلاش تو کیجئے۔ شاید کوئی ٹکٹ رہ گیا ہو۔ ہمارے بزرگوار نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور نہایت زور سے انگریزی میں چیخ پڑے +

"آئی بگ یور پارڈن" (میں آپ سے معافی مانگتا ہوں)

بتایئے اگر ایسے شخص سے بغض للہ ہو جائے تو

اسمیں میرا کیا قصور ہے

(خاص) "مظلوم"

ننھا ادیب

از جناب صوفی مصفوۃ اللہ بیگ صاحب دہلوی

(۱)

میرے دوست ارشاد کا گھر آجکل خوشی کا منبع اور مخزن بنا ہوا ہے۔ ہر ایک شخص کے چہرے پر انتہائی خوشی کے نشان ہویدا ہیں۔ دیکھنے والوں کو اشتباہ ہوتا ہے کہ یا تو کارکنان قضا و قدر ان کے گھر کو اپنی فہرست میں درج کرنا بھول گئے ہیں۔ یا ان کے دل میں بھی اتنا رحم پیدا ہو گیا ہے کہ وہ اس خوشی کو جو ننھا ارشد اپنے ساتھ لے کر اس دنیا میں آیا ہے۔ اپنی بے جا دست درازیوں سے ملیامیٹ کرنا نہیں چاہتے۔ بچے سب کے ہاں ہوتے ہیں۔ بچے سب کو پیارے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن ننھا ارشد جس دلفریبی اور کشش کا مالک ہے۔ وہ ضرور غیر معمولی ہے +

دن گذر گئے اور گذر رہے ہیں۔ ننھا ارشد اب خاصا بڑا ہو گیا ہے۔ اس کی صحت نے اس کی خوبصورتی کو اور بھی چار چاند لگا دیئے ہیں۔ وہ اپنے پنگوڑے میں لیٹ کر اور اپنے انگوٹھے کو اپنے منہ میں لیکر جب اِدھر اُدھر غور سے دیکھا کرتا ہے تو میں محسوس کیا کرتا ہوں کہ وہ اس دنیا کا جائزہ لے رہا ہے جس وقت وہ اپنی بڑی بڑی گول گول آنکھوں سے مجھے دیکھتا ہے تو میرا دل مرعوب ہو جاتا ہے۔ جب میں اُسے دیکھتا ہوں تو مجھے خود تعجب ہے کہ کیوں میرا دل انتہائی خوشی محسوس کرتا ہے +

(۲)

آج ارشد کی پانچویں سالگرہ ہے۔ تمام گھر ابھی تک خوشی کا مخرج بنا ہوا ہے۔ آج اس کے دوست۔ جو کہ بہت ہی ننھے ننھے سے خوبصورت بچے ہیں۔ جمع ہو رہے ہیں۔ ارشد کی میز تحفوں سے بھری ہوئی ہے +

وہ خوش ہے اور اپنے کھلونوں اور تحفوں کو کنکھیوں سے دیکھ رہا ہے اس نے اپنے ایک دوست حمید کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور کہنا شروع کیا۔

"تم مدرسہ جاتے ہو نا۔ ہماری امّی تو ہمیں کہیں نہیں بھیجتیں۔ کہتے ہیں مدرسے میں کھلونے ہوتے ہیں۔ اچھے اچھے دوست ہوتے ہیں۔ پڑھنے کے لئے خوبصورت تصویروں والی کتابیں بھی ہوتی ہیں۔ ہمارے ماسٹر صاحب بڑے اچھے ہیں۔ کہہ رہے تھے کہ بڑے ہو جاؤ گے تو تمہیں ہم رسالہ نمگادیں گے۔ ویسا ہی جیسا ابا پاس آتا ہے۔ اور کہتے ہیں کہ تمہیں اردو پڑھنی آجائے تو ہم بھی ابا کی طرح کہانیاں لکھ لکھ کر تصویروں والے رسالے میں بھیجنا۔ کیوں نا کیسی اچھی بات ہوگی ——— میں نے ایک کتاب ا۔ ب۔ ت کی لکھی ہے۔ اس میں اپنا سبق۔ ہندسے۔ نام سب لکھا ہے۔ اسے چھپا کر رکھ چھوڑا ہے بڑا ہو جاؤں تو چھپواؤنگا۔ سب کہیں گے بھئی واہ میاں ارشد تو بڑے پکے رستم نکلے۔ چپکے ہی چپکے کتاب چھپوا لی۔ پھر کیسا مزا آئیگا۔ ہاں جی ہاں"

"ہمیں تو دکھاؤ"

"اچھا"

(۳)

ارشد آج صبح سویرے اُٹھا۔ اب وہ ساڑھے چھ برس کا ہے۔ آج اس کا دل کسی آنے والی خوشی کا انتظار کر رہا ہے۔ اس کا چہرہ اس بات کا ثبوت دے رہا ہے۔ کہ وہ انتہائی خوش ہے۔ وہ اِدھر اُدھر اچھلتا پھرتا ہے۔ وہ خود متحیر تھا۔ کہ وہ کیوں اتنا خوش ہے۔ اور اس کے لئے اس کی خوشی خود ایک معمہ تھی۔ ڈاکیہ روز آتا تھا اور کہتا تھا "خط منگا لیجئے صاحب" لیکن آج جب وہ آیا تو ارشد کو اس کی آواز موسیقی سے زیادہ دلکش معلوم ہوئی۔ وہ دوڑا ہوا گیا۔ اور اس سے ڈاک لے لی +

"آہا! پھول آگیا" اس نے جلدی سے کہا۔ پھول کو کھول کر وہ فرطِ خوشی سے چلّا اُٹھا "امّی میری کہانی بھی چھپ گئی۔ دیکھو کیسی اچھی معلوم ہوتی ہے۔ ننھی کی کہانی ننھی کی زبانی اور آگے میرا نام بھی لکھا ہے" +

وہ خوشی سے ناچ رہا تھا۔ اس کا دل رقص کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں دنیا خوشی سے لبریز نظر آرہی تھی +

(۴)

میرا تبادلہ ہوگیا۔اس لئے میں اپنے دوست ارشاد اور اپنے ننھّے مُنّے عزیز ارشد سے وداع ہوکر چلا گیا۔کبھی کبھی اِکّا دُکّا ایک آدھ خط آجاتا اور میں خوش ہوتا کہ ابتک ننھا ارشد مجھے یاد کرتا ہے +

مجھے آئے ہوئے کوئی چھ سات مہینے ہوگئے۔میں اپنے آفس میں بیٹھا تھا کہ ڈاکیہ ایک کارڈ لایا جس میں لکھا تھا:۔

پیارے دوست صوفی،

آہ! کیسے لکھوں۔کس قلم سے لکھوں۔کہ تمہارا دوست۔تمہارا عزیز اس دنیا میں نہیں ہے۔اور وہ ہم سب کو داغِ مفارقت دے چکا۔آہ اُس نے کیسے پیارسے مرتے وقت تمہارا نام لیا۔میرا کلیجہ منہ کو آرہا ہے۔قلم کانپ رہا ہے۔آہ۔رخصت +

غمزدہ ارشاد

میری آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔میں نے قلم رکھدی میرا سر جھکا رہا تھا۔اور مجھے اس دنیا کی خبر نہ تھی +

(۵)

دن۔دن سے مہینے۔اور مہینوں سے سال گذر گئے۔اب کے عید پر میں دہلی گیا۔شام کو جبکہ تمام شہر جامع مسجد پر عید کی سیر کرنے زرق برق کپڑے پہنے جمع ہو رہا تھا۔میں شہر سے باہر ٹہلتا ٹہلتا چلا گیا۔میں جا رہا تھا۔اور بہت تیز جا رہا تھا۔میں ضرور کہونگا کہ میں ایک کشش محسوس کر رہا تھا۔جو کہ مجھے کھینچ رہی تھی۔میں قلعہ کے پیچھے دور تک غیر آبادی اور گھانس میں چلا گیا۔وہاں ایک قبر دکھائی دی۔ حوادثات زمانہ نے اُس کو توڑ دیا تھا۔یہ نہایت چھوٹی سی قبر تھی نیم کے پتے اُڑ اُڑ کر اُس پر پڑ رہے تھے۔اور آرام کرنے والے کو مبارکباد دے رہے تھے کہ اب اُس کو اُن کی طرح خوفِ خزاں نہیں ہوتا اب دنیا کی کوئی طاقت اُس کو برباد نہیں کرسکتی۔اب وہ حیاتِ جاودانی کا مالک ہے۔میں آگے بڑھا۔ہوا تیزی سے چل رہی تھی۔میری نظر کتبہ پر پڑی۔اور میرے منہ سے بے اختیار ایک چیخ نکل گئی +

"ننھا ادیب"

ارشد

۶ ۔۔۔ ۱۹۲۸

میرے اوپر پھر جنون طاری تھا۔آہ! میرے پیارے۔میرے دوست۔میرے ——— تو یہاں اسقدر آرام کی نیند سو رہا ہے۔جبکہ تمام دنیا عید کے مزے لوٹ رہی ہے۔لیکن تیرا دل۔مجھے یقین ہے اُن سے زیادہ خوش ہوگا۔اے بے لوث فرشتے! اے معصومیت کے سرتاج!! اے اقلیم سکون کے بادشاہ!!! سو اور آرام سے سو۔لیکن میرے دل۔اندوہگیں دل کا خیال رکھ ——— لا فاتحہ پڑھ لوں ——— پھول یہاں کہاں سے لاؤں ——— آہ! تو تو خود پھول تھا۔پھول سے زیادہ نازک تھا۔کلی سے زیادہ جوان تھا۔تیری لحد جنّت کے پھولوں سے بھری ہوئی ہوگی ——— پھر تو اس دنیا کے مرجھانے والے پھولوں کی کیوں قدر کرنے لگا ———

——— آج عید ہے ——— عید نمبر نکل رہے ہیں ——— لوگ خوش ہیں۔برقاش ہیں ——— اسلامی دنیا میں چہل پہل ہے ——— لیکن تو گواہ رہیو کہ میری آنکھیں تیرے سوگ میں خونچکاں ہیں ——— ننھے ادیب! اب رخصت ——— پھر آؤنگا ——— تو خود ادیب تھا۔تو کسی عید نمبر کے لئے تیرے حال سے زیادہ کیا کوئی چیز خوش ہوسکتی ہے؟

صفوۃ اللہ بیگ

(خاص)

تاریخ اسلام

پانچ ضخیم حصوں میں

اسلام کی سیاسی وتمدنی ترقیوں کی دلچسپ تاریخ ابتدائے اسلام سے لے کر موجودہ زمانہ تک پانچ ضخیم جلدوں میں تیار ہوچکی ہے۔پانچوں حصوں کے مکمل سیٹ کی قیمت پانچروپے (ـ۵ـ) ہے۔ہر اسلامی اور تاریخ وتمدن سے دلچسپی رکھنے والے گھر میں یہ کتاب موجود رہنی چاہئے +

ملنے کا پتہ:۔ مینیجر رسالہ نیرنگ خیال شاہی محلہ لاہور

نیرنگ خیال ۔ عید نمبر

"شاہجہان کی رحلت"

پروفیسر جادوناتھ سرکار کا ایک تاریخی مقالہ

مترجمہ جناب ظفر قریشی دہلوی ۔ متعلم بی ۔ اے

باب اوّل

بادشاہ اور زنداں کی سلاخیں

فرزند بیٹے کی قیادت میں جب شاہجہان نے آگرے کے دروازے کھول دیئے تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عمر کے بقیہ حصّہ کے لئے ایک "شاہی قیدی" بنا دیا گیا۔ "بادشاہوں کے بادشاہ" کے لئے یہ فوری انقلاب بیحد صبر آزما اور تلخ تھا۔ اور گو ابتدا میں اُس نے "مشرف" سے احتراز کرنے کی انتہائی جدّ و جہد کی ۔ مگر بیٹے کے آہنی ارادہ کے آگے ایک نہ چلی اور مجبوراً مقید ہونا ہی پڑا۔ ابتدا ہی سے حالات نے کچھ ایسی صورت اختیار کی تھی کہ شاہجہان کے لئے فرار یا آزادی بالکل ناممکن ہو گئی تھی ۔ بوڑھا تھا۔ ضعیف و نحیف تھا۔ امرا و اکابر فاتح سے جا ملے تھے۔ اب سوائے حرم کی عورتوں ۔ اور خواجہ سراؤں کے اسکا نہ کوئی مشیر تھا اور نہ صلاح کار۔ چاروں طرف مظفر بیٹے کی فوج گھیرے پڑی تھی ۔ اور اِرد گرد جاسوسوں کی نگرانی دن رات ہو رہی تھی۔ وفادار لڑکا دارا شکوہ بھی اس سے دور تھا۔ علاوہ ازیں خطوط اور پیغامات پر بھی اورنگ زیب نے سخت محاسبہ کر رکھا تھا۔ اس لئے بیرونی دنیا سے اسے کسی امداد کی توقع نہ تھی ۔ نہ بازوؤں میں دم تھا کہ میدان میں نکل سکے۔ اور نہ پشت پناہی کے لئے جانباز و وفادار امرا تھے۔ جو آڑے آ سکتے ۔ غرض ایک "مغل اعظم" فطرت کی ستم ظریفی کا مرکز بنا تھا۔ اور ضرورت تھی کہ وہ سٹیج سے اب رخصت ہو جائے ۔ مگر وہ اس قانون کی سنجیدگی کو محسوس کرنے میں بہت سہل انگاری سے کام لے رہا تھا+

جب ۸ جون ۱۶۵۸ء کو شہزادہ محمد سلطان اپنے باپ کے ایما سے مفتوح شاہجہان سے قلعۂ آگرہ میں ملنے آیا تو بوڑھے دادا نے بہت التفات اور محبت سے استقبال کیا اور مشہور ہے کہ اُس نے اس نوجوان کی تعریف و توصیف کے بعد اُسے ورغلانے کی کوشش بھی کی تاکہ وہ شاہجہان کے نائب کی حیثیت سے تخت پر بیٹھ جائے اور اورنگ زیب کے خلاف علم بغاوت بلند کر دے ۔ جس کی امداد کے لئے شاہجہان اپنے شاہی وقار کو کام میں لانے کی کوشش کرنے کا وعدہ کر رہا تھا+

نہیں کہا جا سکتا کہ فی الحقیقت ایسی کوئی تجویز نوجوان شہزادہ کو پرچانے کے لئے پیش کی بھی گئی تھی یا نہیں ۔ لیکن اگر فرض کر بھی لیا جائے ۔ تو یہ ظاہر ہے کہ شہزادہ نے اسے فوراً رد کر دیا ہوگا۔ کیونکہ اورنگ زیب کے ایلچی اور باپ بیٹے کے درمیان ذریعہ پیام رسانی کے علاوہ شہزادہ کی علیحدہ کوئی حیثیت نہ تھی ۔ اس کا کام صرف یہ تھا کہ قلعہ کی ایک ایک منٹ کی حالت سے اورنگ زیب کو باخبر کرے ۔ شاہجہان کی ہر نقل و حرکت اور گفتگو اور ارادہ سے باپ کو خبردار کرتا رہے ۔ اس کے علاوہ اُسے کچھ اختیار نہ تھا ۔ فوج کا کامل اختیار اورنگزیب کے ہاتھ میں تھا ۔ اس لئے کسی بغاوت کا خیال لاحاصل تھا ۔ علاوہ ازیں قلعہ کے مکین بالکل بے دست و پا تھے ۔ کیونکہ کوئی شخص اس میں داخل نہ ہو سکتا تھا جبتک اورنگ زیب کی اجازت حاصل نہ کر لی گئی ہو اور وہ قلعہ کی آمد و رفت پر سخت احتساب قایم کئے ہوئے تھا ۔ اگر اُس کا لڑکا باغی ہو بھی جاتا تو باپ کا عتاب اور اُس کی سزا بیحد لرزہ خیز ہوتی+

اُس وقت کی بعض تواریخ میں جن کی حیثیت دویم درجہ کی سمجھی جاتی ہے

یہ بھی واقعہ درج ہے کہ شاہجہان نے قلعہ آگرہ میں ملنے کے لئے اورنگ زیب کو بلایا اور ایک سازش تیار کی کہ جب وہ آئے تو ناری عورتوں سے (جو حرم کی حفاظتی فوج ہوا کرتی تھی) اسے قتل کرا دیا جائے لیکن یہ محض افواہ سمجھی جاتی ہے کیونکہ اس زمانہ میں اس نوعیت کی کسی سازش کا خیال اور اس کے نتائج سے لوگ پہلے ہی سے واقف ہوا کرتے تھے اور احتیاطی تدابیر اختیار کر لیا کرتے تھے۔ چنانچہ مشہور ہے کہ اورنگ زیب نے اپنے مشیروں شیخ میر اور شائستہ خاں سے مشورہ کے بعد اس دعوت کو رد کر دیا۔ اس سازش کا بھانڈا "ناہر دل" نامی ایک غلام نے پھوڑ دیا۔ اسی سلسلہ میں شاہجہان اور دارا کے درمیان ایک خفیہ خط کی ترسیل کا بھی سراغ چلا +

شجاع کا مورخ محمد معصوم جو اس زمانہ میں بنگال میں مقیم تھا۔ اور قلعہ کی اڑتی اڑتی خبریں کبھی کبھی سن پاتا تھا ایک واقعہ لکھتا ہے۔ جو بازاری گپ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ وہ لکھتا ہے کہ شاہجہان نے مراد کو خط لکھا کہ وہ محمد سلطان اور اورنگ زیب کو ایک ضیافت میں بلائے اور قتل کر دے۔ مشہور ہے کہ لاپرواہ مراد نے یہ خط ایک کتاب میں چھوڑ دیا اور بھول گیا۔ اس کے کتب خانہ کے نگراں نے جسے یہ خط ہاتھ لگا۔ فوراً اورنگ زیب کے ہاتھ ایک بڑی بھاری رقم کے عوض بھیج دیا۔ چنانچہ اس نے اپنے چھوٹے بھائی کو قید کر کے اس خطرہ کے امکان کو فوراً دفع کر دیا۔

ہم ان قصہ طرازیوں کو رد کر سکتے ہیں۔ کیونکہ کوئی قابل قبول تاریخی ثبوت ہم نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن اس حقیقت سے تو یقیناً انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شاہجہان زنداں کی سلاخوں سے سر ٹکرا رہا تھا۔ اور آزاد ہونے کی انتہائی جد و جہد کر رہا تھا۔ وہ دارا کو اپنے محبت آمیز خطوط اور مشوروں سے برابر مدد دے رہا تھا۔ خواجہ سرا جو ان خطوط کو دھوکہ دے کر قلعہ کے باہر لے جانے میں کامیاب ہو جاتے تھے اگر اورنگ زیب کے آدمیوں کے ہاتھ میں پڑ جاتے تھے۔ تو بہت ہی عبرتناک سزا پاتے تھے۔ مگر شاہی قیدی برابر پیام و سلام کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھے۔ آزادی کی ایک آخری کوشش شاہجہان نے اس وقت کی جب اسے یہ معلوم ہوا کہ شجاع پٹنہ سے آگرہ کی طرف حملہ کرنے کے لئے روانہ ہو گیا ہے۔ بادشاہ نے اس فعل کی بہت ہمت افزائی کی اور شجاع کو بہت دعائیں دیں۔ اور تمام وفادار رعایا سے درخواست کی کہ وہ شجاع کی مدد کرے اور غاصب کی اعانت سے احتراز کرے۔ لیکن جب یہ خط (ہندی میں لکھا ہوا) شجاع کو پہنچا تو وہ کھاجوہ کے مقام پر پہنچ چکا تھا۔ جہاں اس شہزادہ کی قسمت کا فیصلہ ہو گیا +

باب دوم
قید کی سختیاں

آزادی کی یہ تمام کوششیں کوئی نتیجہ پیدا نہ کر سکیں۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ قید کی سختیاں اور پابندیاں بڑھتی ہی چلی گئیں۔ قلعہ آگرہ کا محاصرہ کرتے ہی اورنگزیب نے چاروں طرف ایک زبردست حفاظتی فوج متعین کر دی تھی۔ شہزادہ محمد سلطان کو قلعہ میں بھیج دیا تھا۔ تاکہ اندر کی دم بدم کی خبریں ملتی رہیں۔ قلعہ کے اردگرد کے تمام مکانات اور عمارتیں گورنمنٹ کے حکم سے خالی کرا دی گئی تھیں۔ تاکہ "فوج قلعہ سے قریب تر رہ سکے اور ہر وقت نگرانی رکھنے میں آسانی ہو"۔

غرض شاہجہان اب بالکل گھر گیا تھا۔ ہر طرف دشمن ہی دشمن نظر آتے تھے دوستوں سے مل بھی نہ سکتا تھا۔ بغیر اورنگ زیب کی اجازت اور محمد سلطان کی معیت اور موجودگی کے شاہجہان کسی نووارد سے بات نہیں کر سکتا تھا۔ قیدی کے ہر جملہ کی رپورٹ اورنگ زیب کو بھیجی جاتی تھی تاکہ وہ ملاقات کی نوعیت سے باخبر ہو جائے۔ غرض آخر تک شاہجہان کی نقل و حرکت، گفتگو اور خط و کتابت پر سخت محاسبہ رہا اور ہر چیز کو شک و شبہ کی نگاہوں سے دیکھا جاتا رہا۔ چنانچہ مشہور اطالوی بندوق ساز "منوکی" اپنی ڈائری میں صفحہ ۷۰ پر لکھتا ہے کہ "میں جب کبھی قلعہ میں گیا شاہجہان کی سخت نگرانی ہوتی دیکھی۔ اسقدر احتیاط رکھی جاتی تھی کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ شاید ہی کوئی دن ہوتا ہوگا کہ میں بادشاہ سے گفتگو نہ کرتا ہوں۔ مگر میرے واپس ہونے سے پہلے ساری رپورٹ خواجہ سراؤں اور جاسوسوں کے ذریعہ سے اورنگ زیب کو پہنچ جاتی تھی"۔

اورنگ زیب نے باپ کو بار بار لکھا کہ وہ بیرونی دنیا سے خط و کتابت کرنا چھوڑ دے۔ کیونکہ "اس سے ملک میں بغاوت اور بدامنی پھیلنے کا اندیشہ رہتا ہے"۔ جس پر شاہجہان غصہ میں بھر کر کہا کرتا تھا۔ "کیوں؟ میں اس کا حکم کیوں مانوں؟ کیا میں اس کا بیٹا ہوں۔ ہرگز نہیں۔ میں اس کے حکم کی کوئی پرواہ نہیں کرتا۔ اور اس فعل سے ہرگز باز نہیں آ سکتا"۔

چنانچہ اورنگ زیب کو ایسی تدابیر اختیار کرنی پڑیں کہ "ملک میں امن و امان قایم رہے۔ اور خواجہ سراؤں کا (جو اس قسم کے بناوٹی خطوط کی ناجائز ترسیل کا واسطہ بنتے تھے) استیصال کر دیا جائے۔ اور شاہجہان کے جلو میں اس قسم کا آلۂ کار کوئی نہ رہے"۔ "وفا" نامی ایک باغی خواجہ سرا کی سزا کے موقع پر اورنگ زیب نے

تمام خواجہ سراؤں کے نام ایک تنبیہ جاری کی کہ "اگر انہوں نے وفا کی طرح کوئی حرکت کی تو انہیں بھی وہ سزا بھگتنی پڑے گی جو وفا کو ملی ہے!"

بادشاہ کو نوشت و خواند کا سامان کبھی نہ دیا جاتا تھا۔ چنانچہ جب اسے کوئی خط لکھنا ہوتا تھا تو ایک خواجہ سرا جو اس کام کے لئے مخصوص تھا اور بطور کلرک کام کرتا تھا بلایا جاتا تھا اور شاہجہان خط کا مضمون بول دیتا تھا۔ قلم دوات اور کاغذ شاہجہان کے ہاتھ میں نہیں دیئے جاتے تھے۔

ہر خط شاہی جیلر کے ہاتھ میں سے گذرتا تھا۔ اس لئے شاہجہان کے لئے بیرونی دنیا سے امداد حاصل کرنے یا اپنے رفیقوں سے اپنی بحالی کے لئے کوشش کرانے کے لئے کوئی پیغام رسانی نہیں ہوسکتی تھی۔ وہ بالکل بے بس تھا۔

یہ تاریخ کا ایک عجیب و غریب واقعہ ہے کہ چالیس سال بعد بالکل اسی قسم کی نگرانی اور احتیاطی تدابیر کا رخ اورنگ زیب نے اپنے ہی بیٹے کی طرف پھیر رکھا تھا! چنانچہ واقعہ ہے کہ جب شاہ عالم نظر بند تھا اور کئی بادشاہوں کے ساتھ ساز باز کرنے کے جرم میں کئی سال تک مقید رہا۔ اس کی ایسی ہی نگرانی کی جاتی رہی۔ جیسے شاہجہان کی ہوئی تھی۔ اور جب وہ رہا کیا گیا اور ملتان کا حاکم بنا کر بھیجا گیا تو اسے اپنے حرم میں قلمدان لیجانے کی اجازت نہ تھی۔ محافظ کو سخت تاکیدی احکام تھے کہ وہ شہزادہ کی خط و کتابت اور ترسیل پیام و سلام پر سخت احتساب و نگرانی رکھے!

باب سوم

حصولِ دولت کیلئے جدوجہد

مغل ہائے اعظم کا یہ جلیل القدر اور پُر شوکت شہنشاہ اورنگ زیب کی قید میں اپنے تمام وقار اور شاہانہ صولت کو کھو بیٹھا تھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ قلعہ آگرہ اور شاہی خزانہ کے بیش قیمت جواہرات کے حصول و تحفظ کے لئے باپ اور بیٹے کے درمیان ایک مسلسل جدوجہد ہوتی رہی۔ شاہجہان گو بے بس اور مقید تھا مگر یہ بے عزتی کسی طرح گوارہ کر سکتا تھا کہ اس کا بیٹا نہ صرف سلطنت کو غصب کرلے۔ بلکہ اس کے ذاتی جواہرات اور خزانہ پر بھی دست تصرف دراز کرے یا سلطنت کے خزانہ پر بیجا مداخلت و تحصیل جائز سمجھے۔ شاہجہان اب تک اورنگ زیب کی اس تمام دستبرد کو سلطنت کے مفاد کے منافی اور قانونی نقطۂ نظر سے بالکل غاصبانہ حرکت سمجھتا تھا۔ اس کے لئے ان جواہرات کو جو اس کے جسم پر تھے یا قلعہ آگرہ کے شاہی خزانہ میں تھے ہرگز اورنگ زیب کے حوالہ نہ کرنا چاہتا تھا۔

شاہجہان کی اس دلیل کے جواب میں اورنگ زیب نے لکھا کہ "چونکہ شاہی املاک و خزانہ پر کوئی "عشر" مقرر نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ رعایا کی فلاح و بہبود کے لئے استعمال ہونا چاہئے۔ زمین پر بادشاہ خدا کا نائب بنکر آتا ہے۔ اس لئے اسے مال و دولت پر بیجا تصرف نہ کرنا چاہئے۔ بلکہ لوگوں کی اصلاح فلاح کے کاموں میں صرف کرنا چاہئے"۔

لہذا نہ صرف شاہجہان سلطنت سے بے دخل کر دیا گیا۔ بلکہ قلعہ آگرہ کے خزانہ پر بھی اس کا کوئی حق باقی نہ رکھا گیا۔ اور چونکہ اب وہ ایک گوشہ نشینی اور خدا شناسی کی مطمئن زندگی بسر کر رہا تھا۔ اس کے لئے اس کے جسم پر بھی کسی قیمتی شے کا ہونا اور دنیاوی مال و اسباب کی محبت اس کی مذہبی زندگی اور آخری ایام کے پر سکون لمحوں کو برباد کرنے والی ثابت ہوسکتی تھی۔ اس لئے اسے اپنے تمام جواہرات اورنگ زیب کے حوالہ کر دینا چاہئے تھے!

گپ باز مورخ معصوم لکھتا ہے کہ اورنگ زیب نے اپنے لڑکے محمد سلطان کو شاہجہان کے پاس "تخت طاؤس" لینے کے لئے ایک دفعہ پھر بھیجا۔ لیکن شاہجہان نے ایک آخری نگاہ اس پر ڈالنے کے بہانہ سے دو تختے اس میں سے نکال لئے۔ جن میں بیش قیمت لعل اور ہیرے بکثرت جڑے ہوئے تھے اور جو تخت کی جان سمجھے جاتے تھے۔ مگر بعد میں وہ تختے بھی محمد سلطان کی درخواست اور کچھ اورنگ زیب کے خوف سے واپس کر دیئے۔

دارا نے قلعہ آگرہ سے فرار ہونے سے پہلے ستائیس لاکھ روپے کے جواہرات جو اس کی بیویوں کی ملکیت تھے۔ حرم کے ایک محفوظ کمرہ میں بند کر دیئے تھے۔ اورنگ زیب نے ان کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ مگر شاہجہان نے دینے سے انکار کر دیا۔ اور حصول زر کی یہ کشمکش عرصہ تک جاری رہی۔ بالآخر شاہجہان کو ہار ماننی پڑی اور وہ جواہرات اورنگ زیب کے حوالہ کئے گئے"۔

مشہور مورخ خفی خان اور اطالوی سیاح منوکائی کے بیانات کے بموجب ہم یہ ماننے پر مجبور ہیں کہ اس تمام جاہ و ثروت کے حصول کے باوجود اورنگ زیب کی حرص بدستور بڑھ رہی تھی۔ اس کی حریص نگاہیں اب اس ہار پر پڑیں جس میں سو لعل ایک ہی جسامت، ایک ہی وزن اور ایک ہی رنگ و وصف کے نسلک تھے اور جن کی مجموعی قیمت چار لاکھ روپے تھی۔ پھر اس ہیرے کی آرسی کا مطالبہ کیا۔ جو ہم

وقت اُس کے باپ کے انگوٹھے میں رہتی تھی۔ اور یہ سب مطالبات اس دلیل کے وزن پر تھے کہ چونکہ شاہجہان اب گوشہ نشین ہوگیا ہے۔ اس لئے مال و دولت کی حرص چھوڑ دینی چاہیئے۔ شاہجہان کو اس مطالبہ کو بھی پورا کرنا پڑا۔

پھر حکم ہوا کہ دارا کی ڈومنیوں کو بھیجا جائے۔ کیونکہ "یہاں کوئی عورت اسقدر ماہر نہیں کہ اپنے گانوں سے مجھے محظوظ کر سکے اور چونکہ ان ایام میں تمہیں گانے بجانے کی طرف کوئی رغبت نہیں۔ اس لئے ان کا یہاں آجانا بہت مناسب ہوگا۔" شاہجہان اس حکم پر آگ بگولہ ہوگیا۔ اورنگ زیب نے جواب دیا "اگر آپ کا اعتراض اس پر ہے کہ وہ دارا کی عورتیں ہیں تو یہ فضول ہے۔ جب میرے پاس اس کی حرم کی عورتیں آگئیں تو خادماؤں کے آنے میں کیا ہرج ہوگا؟"

۸ر جون ۱۶۵۸ء کو جب قلعہ آگرہ محصور کیا گیا۔ اورنگ زیب نے فوراً شاہی محلات کے ان تمام کمروں پر مہریں لگا دیں جن میں قیمتی اشیا۔ جواہرات قابیں۔ سامان آرائش وغیرہ محفوظ تھے۔ خواہ وہ دیوان خاص میں تھے یا اندر حرم میں۔ تمام جواہرات اور خزانوں کی حفاظت کے تاکیدی احکام جاری تھے۔ جواہرات اور مرصع ظروف "غسل خانہ" کے کمروں میں بند کر دیئے گئے تھے۔ قفل سربمہر تھے۔ اور اورنگ زیب کا ایک خاص خواجہ سرا "معتمد" نامی ان پر متعین تھا۔ یہ جواہرات اور ظروف بہت کم نکالے جاتے تھے۔ اور اگر نکلتے بھی تھے تو "معتمد" کی اجازت۔ "داروغہ" کی نگرانی اور "تحویلدار" کی ذمہ داری پر بہ بجد احتیاط کے ساتھ!

ابتدا میں شاہجہان کو اُس کے جذبات کی رعایت سے ان جواہرات کو (جن کی اس احتیاط کے ساتھ حفاظت ہو رہی تھی) دیکھ سکنے کی اجازت دیدی گئی تھی۔ شہزادہ محمد سلطان کو حکم تھا کہ جب کبھی شاہجہان جواہرات کے صندوقچے دیکھنا چاہے تو اُسے دکھا دیئے جائیں۔ لیکن تہدید تھی کہ "خزانوں کو کھولتے وقت جواہرات کی حفاظت اور احتیاط کی کوئی تدبیر فروگذاشت نہ کی جائے۔" مگر یہ بھی آگاہی تھی کہ کوئی پہلو ایسا اختیار نہ کیا جائے۔ جس سے شاہجہان کے جذبات مجروح ہونے کا احتمال ہو۔ چونکہ شاہجہان اب حرم کی چہار دیواری میں ہی اقامت گزیں ہوگیا تھا۔ اس لئے اندرونی کمروں تک اُس کی رسائی اب بہت آسانی کے ساتھ ہو سکتی تھی۔ یہیں اُس کے آلات موسیقی بھی رکھے ہوئے تھے۔

شہزادہ محمد سلطان کے چلے جانے پر قلعہ کا واحد مختار "معتمد" نامی خواجہ سرا (جس کا اوپر ذکر آچکا ہے) بن گیا تھا۔ اور وہ شاہجہان کے ساتھ بہت سخت گیری

اور اغنا کا سلوک کرنے لگا۔ اطالوی سیاح منوکانی اپنی ڈائری کے دوسرے باب کے صفحہ ۹۴ اور ۹۵ پر مندرجہ ذیل اندراج کرتا ہے:-

"یہ خواجہ سرا شاہجہان کے ساتھ بہت بری طرح پیش آتا تھا۔ بالکل اس طرح گویا یہ بادشاہ کوئی غلام حلقہ بگوش تھا...... ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ اُس نے (یعنی شاہجہان نے) خواجہ سرا سے ایک پاپوشوں کی جوڑی کے لئے کہلا کر بھیجا۔ اس بد طینت اور حرام خور خواجہ سرا نے نہ آٹھ روپے والی نہ چار روپے والی بلکہ معمولی چمڑے کی خراب سی پاپوش بادشاہ کو بھجوا دی۔ اور اس فعل پر بہت مسرور ہوا۔ گویا کہ اُس نے کوئی بہت بڑا کام انجام دیا تھا..... ایک دن اُس نے (شاہجہان نے) دو ستار جنہیں وہ استعمال کرتا تھا۔ خواجہ سرا کو بھجوائے تاکہ ان کی مرمت جلد ہو جائے اور جلد ہی اندر بھجوا دی جائیں۔ مگر اس خواجہ سرا نے ان ستاروں کو ایک طرف لاپرواہی سے ڈال دیا۔ اور تاکید کی کچھ پرواہ نہ کی اور جب تین دن بعد شاہجہان نے ان ستاروں کو منگوایا تو وہ غصہ میں آپے سے باہر ہوگیا۔"

جب سابق شہنشاہ کے پوشاک خانہ کے افسر اعلیٰ خواجہ ماموں کا انتقال ہوا تو کپڑوں کے تمام کمرے مقفل کر دیئے گئے اور تبدیل لباس کے لئے شاہجہان کو کئی دن تک دقت پیش آتی رہی۔ اور یہ اس وقت تک رہی جبتک ایک نیا افسر متعین ہوکر نہ آگیا۔

باب چہارم

"باپ اور بیٹے کے درمیان تلخ خط و کتابت"

قید کے اولین سال کے دوران میں باپ اور بیٹے کے درمیان ایک تلخ خط و کتابت ہوتی رہی۔ اس تمام بحث و تمحیص کے دوران میں اورنگ زیب نے اپنے آپ کو ہمیشہ اسلام کا شیدائی مذہب حنفیہ کا پکا پیرو ظاہر کیا نیز یہ کہ خدا نے اُسے لوگوں کی اصلاح اور فلاح کے کام سرانجام دینے کے لئے مامور کیا تھا۔ اور وہ جو کچھ کر رہا تھا خدا کی مرضی اور عین اسلام سمجھ کر کر رہا تھا۔ وہ شاہجہان کی حکومت کو رفیع الناس نہیں سمجھتا تھا بلکہ "شر" سے تعبیر کرتا تھا۔ وہ اپنے باپ کی حکومت کو غیر منصفانہ اور ناقابل برداشت سمجھتا تھا۔ اور اپنے تمام افعال کو پرہیزگاری۔ اتقا

اور ایک سچے مسلم کی صحیح اسلامی پالیسی پر محمول کرتا تھا۔
جب اس پر ایک باغی اور غیر مطیع بیٹا ہونے کا الزام لگایا تو اُس نے جواب دیا
"جب تک عنانِ حکومت آپ کے ہاتھ میں تھی میں نے کوئی کام بغیر آپ کی مرضی کے نہیں کیا اور نہ کبھی اپنی قانونی حدود سے تجاوز کیا۔ خدائے عالم الغیب اس حقیقت کو اچھی طرح جانتا ہے۔ وہ سب ڈھکی اور کھلی باتیں جانتا ہے۔ آپ کی علالت کے دوران میں دارا نے آپکو ہر طرف سے نرغہ میں گھیر لیا تھا۔ آپ بالکل بے بس ہو گئے تھے اور وہ ہر چیز پر تسلط جمانے کے بعد ہندو مذہب کی ترویج و اشاعت کی کوشش کر رہا تھا۔ تاکہ اسلام کا استیصال ہو۔ اُس نے آپ کو ایک طرف کر کے بادشاہی کرنی شروع کر دی تھی۔ سلطنت میں ابتری پھیل گئی تھی۔ عمّال حکومت میں اتنی جرأت نہ ہوئی کہ آپ کو اصل حالت سے باخبر کر سکتے.... ... (خاکم بدہن) اگر اس کافر (دارا) کے ارادے کامیابی کے درجہ تک پہنچ جاتے اور دنیا پر کفر کی ظلمت چھا جاتی۔ اور اسلام کا آفتاب ماند پڑ جاتا ——— تو قیامت کے دن کیا جواب دیتے!"

اس کے بعد ذکر کرتا ہے:-

"آگرہ پر میری چڑھائی کسی باغیانہ جذبہ کے ماتحت نہ تھی بلکہ اس کا محرک یہ جذبہ تھا کہ دارا کی غاصبانہ حرکات کو فوراً بند کر دیا جائے۔ اور اس کے کفر و الحاد کی بڑھتی رَو کو جلد روکا جائے۔ پس اس جہان کا خیال کر کے میں نے اس بوجھ کو اپنے کندھوں پر اُٹھایا ہے۔ اور اس میں محرک یہ جذبہ ہے کہ مزارعین اور رعایا کی بہبودی اور بھلائی ہو!"

برادرانہ خانہ جنگیوں کے متعلق اورنگ زیب کہتا ہے کہ اُس نے یہ لڑائیاں طاقت حاصل کرنے یا جاہ و ثروت کے حصول کے لئے نہیں لڑی تھیں بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ شاہجہان اپنے بڑے بیٹے کا بیجا پارٹ لے رہا تھا۔ اور اس کے بھائیوں کو اس سے خاص حاسدانہ اور منتقمانہ جلن تھی۔ اور اُسے خواہ مخواہ جنگ میں گھسیٹا گیا تھا۔ ورنہ وہ خود برادر کشی کے خلاف تھا۔ اُسے حالات نے مجبور کیا تھا۔

چنانچہ لکھتا ہے:-

"گو مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ آپ مجھ سے سخت ناراض ہیں اور سلطنت میں ابتری اور ہنگامہ کا ذمہ دار مجھے ٹھیرایا جا رہا ہے۔ اور یہ کہ میرے بھائی آپ ہی کے ایما سے میرے خلاف ریشہ دوانیاں کر رہے ہیں..... لیکن میں ان خبروں سے بھی مطلق متاثر نہ ہوا۔ اور اس وقت تک آپ کا فرمانبردار رہا جبتک مجھے یہ یقین نہ ہو گیا کہ آپ میری بجائے کسی اور بھائی کو طاقت سپرد کرنے والے ہیں اور مجھ سے آپ کو بالکل محبت نہیں ———"

"اگر آپ اپنے بڑے لڑکے کی بیجا حمایت نہ کرتے اور اس پر بھروسہ کرنے میں اسقدر غلو کا اظہار نہ کرتے۔ اور نہ اسے اسقدر اعلیٰ مراتب پر فائز کرتے۔ تو بدمزگی پیدا ہی نہ ہوتی (اور اب تو غالباً اس کی خدا ترسی اور نیکوکارانہ سیرت کا اندازہ آپکو بھی ہو گیا ہوگا) ——— اگر میرے دوسرے بھائیوں کو آپ خواہ مخواہ اشتعال نہ دیتے اور میرے خلاف تلخی نہ پیدا کرتے تو ہم سب بھائی صلح و آشتی کے ساتھ زندگی بسر کر سکتے۔ اور یہ خانہ جنگی ہرگز نہ ہوتی"

اورنگ زیب کو یقین کامل تھا کہ ملک میں اس وقت تک امن و امان نہیں ہو سکتا جبتک دارا اور شجاع ملک بدر نہ کر دیئے جائیں۔ یا مراد کی طرح مقید نہ کر دیئے جائیں چنانچہ مجبوراً سے ایسی پالیسی اختیار کرنی پڑی کہ "خدا اور عامۃ الناس کے نزدیک" سرخرو ہو۔ اور جس بارِ گراں کو اُس نے محض انسانی ہمدردی اور فلاح عوام کے لئے اُٹھایا تھا کامیابی کے ساتھ تکمیل تک پہنچے۔ چنانچہ اُس نے افسروں کا انتخاب خطابات اور عہدوں کی تقسیم اور اسی قسم کے دیگر شاہانہ کام شروع کر دیئے۔ اور اپنے آپ کو ملک کا واحد مالک اور حقیقی محسن کی طرح ظاہر کیا۔

تاج و تخت کے قبول کرنے کے متعلق ایک جگہ لکھتا ہے:-

"تاج و تخت کی گراں ذمہ داریاں حصول جاہ کے لئے نہیں محض بہت ضرورت سے مجبور ہو کر اختیار کر رہا ہوں۔ تاکہ ملک میں امن و امان قایم ہو۔ اسلام کا قانون ملک میں جاری ہو تاکہ روز شمار کو میں جوابدہ ہو سکوں۔ عامۃ الناس کے جان و مال کی حفاظت رہے۔ ان کی فلاح اور میری آبائی سلطنت میں ابتری اور ہنگامہ پیدا نہ ہو"

ایک بادشاہ کی ذمہ داریوں اور فرائض کے متعلق اورنگ زیب کا خود کیا عقیدہ تھا

اس کا اندازہ خود اسی کے الفاظ سے ہو سکتا ہے :-

"بادشاہت سے مراد عامتہ الناس کی بہبود اور اُن کی بہبود اور انکی جان و مال و عزت کی حفاظت ہے۔ ملک میں امن و امان قایم رکھنا ہے۔ نہ کہ جسمانی خواہشات اور نفسانی آرزوؤں کی تسکین و تکمیل"

باب پنجم

اورنگ زیب کی نیکوکاری

اورنگ زیب اپنی کامیابی اور فتوحات کو خدا کی مہربانی اور اپنی نیکوکارانہ زندگی سے منسوب کرتا ہے۔ اور ان کامیابیوں کو اس ثبوت میں پیش کرتا ہے کہ اُس کا تمام رویہ خدا کی نگاہ میں برگزیدہ اور قابل ستایش رہا تھا ورنہ وہ کامیاب نہ ہوتا۔ چنانچہ ایک جگہ کہتا ہے :- "چونکہ میرے ارادے تھے۔ اس وجہ سے باوجود قلیل التعداد ہونے کے مجھے دونوں لڑائیوں (یعنی دھرمٹ اور سموگڑھ) میں خدا کے فضل سے فتح نصیب ہوئی۔ اگر خدا کی مرضی شامل حال نہ ہوتی تو مجھے کامرانی کیونکر نصیب ہو سکتی تھی۔۔۔۔ اور فتحمندی تو صرف خدا ہی کا انعام ہے۔ جسے چاہے دے!"

اس حکم خداوندی اور مرضئ الٰہی کے سامنے شاہجہان جیسے دانشمند بادشاہ کو سوائے سر تسلیم خم کرنے کے اور کیا چارہ رہ گیا تھا۔ اس سلسلہ میں اورنگزیب کا نظریہ دیکھئے :-

"خدا کے حکم کے بغیر کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے آپ اپنی موجودہ زندگی کے تغیر اور انقلاب کو کیوں کسی مادی طاقت اور ارضی حکم سے متعلق کرتے ہیں۔ یہ تو سب کچھ خدا ہی کی مرضی سے ہوتا ہے۔ اور وہی بڑھاتا اور گھٹاتا ہے۔ خدا کی پرچلو۔ اُس نے جو فیصلہ کر دیا ہے اور جو ہو چکا ہے اُس پر ٹھنڈے دل سے غور کرو۔ یہ طبیعت کا انتشار یہ ذہنی افکار اور غم و ملال سکون قلب میں مبدل ہو جائیگا۔ اگر تم اس کے فیصلہ کو "امر واقعہ" سمجھ لو"

معزول شدہ بادشاہ نے اسے "امر واقعہ" سے بھی زیادہ سمجھا۔ بلکہ اپنے بیٹے کا اُسے شکر گذار ہونا چاہئے تھا۔ کیونکہ خود اورنگ زیب کے الفاظ میں :-

"میں نے آپ کو ایک بڑی ذمہ داری سے سبکدوش کر دیا ہے اگر آپ نظر انصاف سے دیکھیں تو میں نے آپ کے افکار و آلام میں کمی کر دی ہے۔ اب آپ کو حوادثات اور پریشانیاں نہیں ستائینگی مجھ جیسے آزاد اور بے فکر انسان نے آپکی ذمہ داریوں کو قبول کر کے آپکو ایک گونا تسلی دیدی ہے۔ اور اپنے لئے افکار و پریشانیوں کا ایک بار خواہ مخواہ مول لے لیا ہے"

شاہجہان ان تمام نظریوں کو محض ظاہرداری سے تعبیر کرتا ہے۔ اور اورنگزیب کو غاصب بتاتا ہے کہ باوجود اپنے آپ کو مسلمان کہنے اور اسلام کے احکام پر اس شدت و غلو کے ساتھ عمل پیرا ہونے کے وہ دوسروں کی ملکیت پر جابرانہ اور غاصبانہ تغلب کرتا ہے۔ اس کے جواب میں اورنگ زیب وہی انداز اختیار کر کے کہتا ہے :-

"آپ مجھے غاصب و جابر بتاتے ہیں۔ میرے رویہ کو تغلب سے تعبیر کرتے ہیں اور دوسروں کی ملکیت پر قبضہ کرنے کو اسلام کے خلاف بتاتے ہیں لیکن آپ کو یہ یاد رکھنا چاہئے کہ سلطنت کے خزانے اور ملک کی دولت عامتہ الناس کے فائدہ کے لئے ہے نہ کہ عیش و عشرت کے لئے۔ ایک بادشاہت موروثی املاک نہیں ہوتی کہ باپ کے بعد بیٹا یقیناً مالک ہو۔ بلکہ یہ تو خدا کی امانت ہے۔ جو اہین ہوتا ہے اُسے ملتی ہے۔ یہ مال و دولت لوگوں کی فلاح میں صرف ہونی چاہئے"

جب نوبت یہانتک پہنچ گئی تو شاہجہان اورنگزیب کو تنبیہ کرتا ہے کہ جو سلوک اُس نے اپنے باپ کے ساتھ کیا ہے۔ وہی اُس کی اولاد اُس کے ساتھ روا رکھیگی۔ لیکن اس پر بھی اورنگزیب پرہیزگارانہ سپرٹ اور اپنی پالیسی کی مدافعت میں وہی جواب دیتا ہے :-

"جو کچھ ہوتا ہے خدا کے حکم سے ہوتا ہے۔ میں جو کر رہا ہوں وہی میرے اگلوں نے بھی کیا تھا۔ پھر تعجب کی بات کیا ہے۔ اگر خدا کی مرضی یہی ہوگی تو میرے بیٹے بھی مجھ سے ایسا ہی سلوک کرینگے میں خدا کی مرضی اور اُس کے حکم سے سر مو تفاوت نہ کرونگا۔ میری نیت بخیر ہے اور نیک نیتوں پر خدا کی مہربانی ہوتی ہے۔ اس لئے مجھے توقع رکھنی چاہئے کہ میرے بیٹے میرے ساتھ اچھا ہی سلوک کریں گے"

بوڑھا بادشاہ اورنگزیب کے ان خطوط سے سخت ناراض ہوتا تھا۔ جن میں وہ اپنے بھائیوں شجاع اور دارا کا بار بار حوالہ دیتا تھا۔

بادشاہ جل کر اورنگ زیب کو بہت سخت سست لکھتا۔ جس کے جواب میں وہ

بھی ایسی ہی زبان استعمال کرتا اور لکھتا :-

"آپ مجھے کیوں بُرا کہتے ہیں۔ کیا آپ اپنے بھائیوں خسرو اور پرویز کو بھول گئے۔ باوجودیکہ انہوں نے آپ کو کوئی گزند نہیں پہنچایا تھا مگر یاد کیجئے کہ آپ نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا !"

لیکن اس سلسلہ میں شاہجہان کی پیشینگوئی اورنگ زیب کی تخمین سے زیادہ صحیح ثابت ہوئی۔ کیونکہ جب ۱۶۸۱ء میں اُس کے چوتھے بیٹے محمد اکبر نے بغاوت کی اور یہ اُس کے تنزل کا باعث ہوئی۔ ان دونوں کے درمیان بھی ویسی ہی تلخ خط و کتابت ہوئی جیسی اورنگ زیب اور اُس کے باپ کے درمیان ہوئی تھی ان خطوط میں شہزادہ اپنے باپ کو ملکی انتظام کے ناقابل بتاتا ہے۔ اور مشورہ دیتا ہے کہ اپنے باپ کے عزل اور بھائیوں کے قتل کا کفارہ ادا کرنے کے لئے بہتر یہی ہے کہ وہ سلطنت سے سبکدوش ہو جائے۔ اور باقی عمر یادِ الٰہی میں بسر کردے۔ جب اورنگ زیب نے اپنے بڑے بیٹے شاہ عالم پر خاص الطاف و کرم کی بارش کی اور دوسرے بیٹوں کو یکسر بھلا دیا۔ تو شہزادہ اکبر نے بھی وہی کیا جو اُس کے باپ نے کیا تھا۔ اُس نے بھی اپنی بغاوت کو بالکل قرین انصاف بتایا کیونکہ بغیر اس کے اورنگ زیب کی خراب حکومت کا خاتمہ نہیں ہو سکتا تھا اور ملک برباد ہو رہا تھا !! وہ بھی اپنے رویہ کو عین اسلام بتاتا ہے۔ اور حکومت کی ذمہ داریاں محض رفاہ عام اور ملک کی بھلائی کے لئے اُٹھانے کو تیار رہتا ہے۔ غرض تاریخ اپنے آپ کو حرف بحرف دُہراتی ہے۔ اور ایک ہی سٹیج پر دو معمولی تبدیلیوں کے ساتھ ایک ہی ڈراما کھیلا جاتا ہے ! - جب اورنگ زیب اپنے بیٹے کو باغی اور بے وفا کہتا ہے۔ تو وہ بھی پلٹ کر یہی کہتا ہے کہ تم نے اپنے باپ کے ساتھ کیا کیا تھا ؟!!

شاہجہان اور اورنگ زیب کے درمیان خط و کتابت کی تلخی اور بدمزگی بڑھتی ہی چلی گئی۔ اب اورنگ زیب نے باپ کو خود لکھنا بالکل چھوڑ دیا۔ گاہے گاہے منشیوں سے کچھ لکھوا کر بھجوا دیتا تھا۔ لیکن بعد میں یہ سلسلہ بھی محض "اس بیکار جھگڑے کو ختم کرنے کے لئے" بند کر دیا گیا۔

شاہجہان اورنگ زیب سے نہ تو تلوار کی جنگ میں عہدہ برآ ہو سکا اور نہ قلمی جنگ میں۔ کچھ عرصہ کے بعد قدرت کے فیصلہ کے آگے جھک گیا۔ کیونکہ اس کے بغیر کوئی چارہ کار ہی نہ تھا --- اب قسمت کا بھی گلہ نہ کرتا تھا !

بابِ ششم

"شاہجہان کا مذہبی شغف"

شاہجہان کے لئے اب سوائے اس کے کوئی چارہ کار نہ تھا کہ خدا کی بھیجی ہوئی "مصیبت" پر صبر اور رضا کے ساتھ سرِ تسلیم خم کردے۔ اورنگزیب نے پہلے دارا شکوہ۔ پھر مراد بخش۔ اور پھر سلیمان شکوہ کو قتل کیا۔ جس سے بوڑھے باپ کا دل بالکل ٹوٹ گیا۔ شجاع اور اُس کے بال بچوں کو مگدھ کے خوفناک جنگلوں کی خاک چھاننی پڑی اور بوڑھا باپ ان تمام مصائب و آلام کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لئے مجبور کیا گیا۔ اس پر ستم یہ ہوا کہ وہ بے بس مقید و محبوس کر دیا گیا ۔

لیکن ان تمام صبر آزما جراحتوں کے باوجود شاہجہان کا دل خدا کی تسبیح و تحمید کرتا رہا۔ وہ شاکی نہ تھا۔ اُسے خدا کی مرضی پر بھروسہ تھا۔ سات سال تک محبوس رہا۔ مگر ابتدائی ایام کے بعد اُس کی زبان پر حرف شکایت نہ آیا۔ اوس کے رفقا اور ملازمین پر پے بہ پے مصیبتیں پڑیں۔ کئی گھرانے اُس کی آنکھوں کے سامنے برباد ہوئے اور وہ ان تمام مصیبتوں کو سہنے کے لئے مجبور کیا گیا۔ ان تمام ہمت شکن مصیبتوں اور حوادثات کے باوجود آخر وقت تک شاہجہان کا دل خدا کی محبت سے لبریز اور صبر و رضا کے جذبات سے معمور رہا۔ استقلال کو آخر دم تک نہ چھوڑا ۔

عمر کے آخری ایام میں اُس کا مذہبی شغف بہت بڑھ گیا۔ صرف مذہب ہی ایک ایسی چیز تھی کہ جس کی آغوش میں وہ تسکین پا سکتا تھا۔ ایک نیک پارسا فرشتہ سیرت بزرگ جناب سید محمد قنوجی ہر وقت اُس کے پاس رہتے تھے۔ یہ بزرگ اخلاق حکایات۔ مذہبی روایات اور احادیث کے درس سے ناکامران بادشاہ کے دل کو ڈھارس دیتے اور اُس کی طبیعت کو پریشان و پراگندہ ہونے سے بچاتے تھے۔ بادشاہ کو مسائل اسلام سکھانے اور سکونِ قلب پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ قرآن کی تلاوت اور حدیثوں کے درس سے شاہجہان بہت خوش ہوتا تھا۔ اور ایک گونہ تسلّی پاتا تھا۔ سید صاحب شاہجہان کی خیرات باہر لے جا کر غربا اور مساکین میں تقسیم کر دیتے تھے۔ ایصال ثواب کی دیگر تدابیر بھی کرتے تھے ۔

اب سابق بادشاہ کا زیادہ وقت عبادت الٰہی میں گذرتا تھا۔ قرآن اور حدیثیں یا تو خود پڑھتا تھا یا سنتا تھا۔ قرآن کی آیات لکھنے وظائف و درود کی تلاوت کرنے اور دیگر مراسم مذہبی میں شاہجہان کی طبیعت بہت سکون پاتی تھی ۔

تاریخی مطالعہ اور مذہبی شغف کے علاوہ شاہجہان اپنی چھوٹی لڑکی جہان آرا سے بہت محبت کرتا تھا۔ جہان آرا اپنے ضعیف باپ کی خدمت بڑی مذہبی اور محبت و شفقت کے ساتھ کرتی تھی اور شاہجہان کے لئے اس عمر میں یقیناً عصائے پیری تھی۔ بلکہ دوسری اولاد کے تلخ تجربہ کا ازالہ کر رہی تھی ۔

جہان آرا - ایک نیک سیرت خاتون جو میاں میر جیسے ولی کی مرید تھی اپنے ضعیف باپ کی اس شفقت اور محبت کے ساتھ خدمت کرتی تھی۔ کہ وہ اپنے تمام مصائب و

آلام کو بھول گیا۔ جہاں آرا قلعہ میں ایک پاکباز راہبہ کی سی زندگی بسر کر رہی تھی۔ دارا اور مراد کے یتیم بچوں کو بھی اپنے ہی سایۂ عاطفت میں لے لیا تھا۔ اور ان کی پرورش بھی بڑے انہماک سے کرتی تھی ۔

غرض شاہجہان ایسے مذہبی اور پُرسکون ماحول میں اپنے پچھلے مصائب کو بالکل بھول گیا۔ اور آخر عمر میں دنیاداری اور افکار زندگی کو بالکل فراموش کر دیا۔ وہ اب ایک دوسری دنیا کے لئے اپنی راہ صاف کر رہا تھا۔ موت اُس کے لئے کوئی خطرناک چیز نہ تھی۔ بلکہ وہ منتظر تھا جسقدر جلد دنیا کے افکار اور جھگڑوں بکھیڑوں سے اُسے نجات مل جائے اُتنا ہی اچھا (حالانکہ اُسکی آخری زندگی تمام ایسے افکار سے چھٹکارا پا چکی تھی) وہ اکثر موت کے مسئلہ پر گفتگو کیا کرتا تھا اور عالم بالا کے حالات وغیرہ تو اس کی گفتگو کے خاص موضوع تھے ۔

باب ہفتم

"وفات کا منظر"

افکار و حوادث زندگی سے نجات حاصل کرنے کی یہ خواہش جس کا عرصہ سے بے تابی کے ساتھ انتظار ہو رہا تھا۔ بالآخر جنوری ۱۶۶۶ء میں مل ہی گئی اُس سال کی جنوری کا ساتواں دن تھا۔ شاہجہان نے ایک ادویات آمیز تیل اپنے جسم پر ملوایا تھا۔ جس سے اُسے بجائے فائدہ کے نقصان ہوا۔ بخار چڑھ آیا۔ اور تشنج دور دمعدہ بھی ہو گیا۔ عارضہ کے نویں دن ایک وید بندرابن نامی نے شکم کے جملہ امراض دور کر دیئے اور شاہجہان کو تب سکون ملا۔ مگر ضعف و نقاہت کسی طرح دور نہ ہوئی۔ زندگی کے چوہتر سال پورے ہو چکے تھے۔ اس عرصہ میں فتح و ظفر بھی دیکھی تھی۔ ناکامی و نامرادی سے بھی سابقہ پڑا تھا۔ تخت پر بیٹھنے سے پہلے جنگلوں کی خاک چھانی تھی۔ لمبے لمبے سفر کئے تھے مشقتیں برداشت کی تھیں تکلیفیں اُٹھائی تھیں اور اب آخر عمر میں آ کر بیوفائی کے چرکے بھی سہے تھے۔ غرض زندگی میں ہر قسم کے نرم و گرم تجربات اُٹھا چکا تھا۔ اب وہ راضی برضا تھا ۔

سردی بلا کی پڑ رہی تھی۔ شربت پیتے پیتے لبوں پر پپڑیاں جم گئی تھیں۔ ضعف و ناتوانی کی کوئی حد نہ رہی تھی مرض بڑھ رہا تھا۔ ادویات و اغذیہ کوئی فائدہ نہیں کر رہی تھیں ۔

دوشنبہ ۔۔۔ ۲۲ جنوری ۱۶۶۶ء ۔۔۔ کی رات کے ابتدائی حصہ ہی سے زندگی کی آس ٹوٹ گئی تھی۔ اور اب ہر شخص اس جلیل القدر بادشاہ کی مخلصی کے لئے دست بدعا تھا۔ جب شاہجہان کو یہ معلوم ہوا کہ اُس کی زندگی کے آخری لمحات پورے ہو رہے ہیں اور اب اُس کے بچنے کی کوئی اُمید نہیں ہے۔ تو اُس نے سب کے سامنے خدا کا شکر ادا کیا ان انعام و اکرام پر جو خدا نے اُسے زندگی میں بخشی تھیں ۔

مرنے سے پہلے بادشاہ نے اپنے ہوش و حواس مجتمع کئے اور اپنی بیویوں کو جو اُس وقت زندہ تھیں سامنے بُلایا ۔۔۔ اکبرآبادی محل اور فتحپوری محل پیش ہوئیں۔ اور دم بہ لب بادشاہ نے بہت تسلی و تسکین دی۔ جہاں آرا اور دیگر حرم کی عورتوں کو بھی جو اُس کے پلنگ کے گرد کھڑی رو رہی تھیں بہت تشفی دی ۔

جہاں آرا کو وصیت کی کہ اپنی سوتیلی بہن "پُرہنر بانو" اور محل کی دیگر عورتوں کی جو اُس کی موت سے لاوارث ہو جائینگی پرورش اور ان کا خیال رکھے۔ اس کے بعد اپنی وصیت تیار کرائی۔ محل کی تمام عورتوں اور ملازمین کو اپنے ہاتھ سے آخری انعام بخشا۔ اور سب کو بادل ناخواستہ رخصت کر کے اپنے سرہانے تلاوت قرآن کا حکم دیا ۔

بستر مرگ کے گرد عورتوں کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں۔ کنیزیں اور خادمائیں رو رہی تھیں۔ غرض محل میں ایک کہرام مچ رہا تھا۔ شاہجہان ۔۔۔ جسکے اوسان آخری لمحہ تک برقرار رہے ۔۔۔ اس ہنگامہ ہائے و ہو میں پڑا ہوا اپنی چاہیتی بیوی ممتاز محل کی فردوس تمثال آرامگاہ کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ زبان پر کلمہ جاری تھا۔ اور دل ہی دل میں کہہ رہا تھا "اے میرے خدا! دنیا اور آخرت دونوں میں مجھ پر رحم کر اور عذاب نار جہنم سے بچا!"

دعا ختم ہونے کے ایک لمحہ بعد تاج کا مفکر ابدی سکون میں پہنچ گیا ۔

رات کے ساڑھے دس بجے تھے۔ شاہجہان مثمن برج میں ایک خواب گراں میں محو تھا۔ سامنے سے تاج محل کا پورا نظارہ ہو رہا تھا۔ اُس کی وصیت تھی کہ مرنے کے بعد اُسے تاج میں اپنی آرام جان کے پاس ہی سُلایا جائے۔ چنانچہ جہاں آرا کے حکم سے قلعدار "رعد انداز" اور خواجہ سرا ہبلول بُلائے گئے۔ جنہوں نے حرم میں آ کر مثمن برج کی کھڑکی کھول کر باہر حکم بھیجا کہ شہر کے قاضی قربان اور سید محمد قنوجی کو جلد بلایا جائے تاکہ تجہیز و تکفین کے مراسم جلد شروع ہوں ۔

یہ دونوں بزرگ رات کو ۱۲ بجے کے قریب آئے۔ کچھ خیرات و کفارہ دیا گیا۔ شاہجہان کی روح کو ایصال ثواب کرنے اور اُس کی چھٹی ہوئی نمازوں اور روزوں کے عوض میں ۔۔۔ پھر مثمن برج میں پہنچ کر جہاں آرا کو کورنش کی اور شاہجہان کی نعش کو

باہر لاکر غسل دیا۔ پھر کفن پہنا کر ایک صندلی تابوت میں رکھ دیا گیا ؎

باب ہشتم
"شاہجہان کا جنازہ"

جہان آرا کا ارادہ تھا کہ شاہجہان کا جنازہ تاج محل تک اس شان و شوکت کے ساتھ جائے جو ایک شاہ دہلی کے شایانِ شان ہو۔ جس کی صورت یہ ہوتی کہ "آگرہ اور نواح آگرہ کے تمام امرا، رؤسا، علما و مشائخ، دارالخلافہ کے تمام عمائد اکابر و شرفا جنازہ کے گرد ہوں۔ تابوت ان کے کندھوں پر باری باری جا رہا ہو۔ اس کے پیچھے پیچھے شہر کے لوگوں کا اژدہام ہو۔ ہر ایک ننگے سر آہستہ آہستہ جا رہا ہو۔ آہ و بکا ہو رہی ہو۔ کلمات پڑھے جا رہے ہوں۔ فقیر و یتامیٰ پر سیم و زر کی بارش ہو رہی ہو۔ ہر طرف یہی چرچا ہو۔ اور پھر یہ پُر شوکت شہنشاہ سپردِ خاک کر دیا جائے ؎

مگر ایسا نہ ہوا۔ اورنگ زیب باپ کے مرنے کی خبر سُن کر نہ آیا اور نہ جنازہ پر ہی آیا۔ بلکہ شہزادہ معظم جسے اُس نے اپنا نائب بنا کر بھیجا تھا۔ وہ بھی جب پہنچا جب جنازہ روانہ ہو چکا تھا۔ سارے کام ایسے لوگوں کے ہاتھ میں تھے جو جہان آرا کی مرضی کے مطابق کچھ نہ کر رہے تھے۔ اس لئے وہ سوائے کفِ افسوس ملنے کے اور کیا کر سکتی تھی۔ اُس کے بس میں نہ تھا۔ ورنہ وہ شاہجہان کا ایسا جنازہ تیار کراتی جو اُس کے شایانِ شان ہوتا۔ اُس کے خاندان کی ناموس کے منافی نہ ہوتا۔ مگر ہوا وہی جو ہونا تھا" شاہجہان کا جنازہ نہایت معمولی حالت میں تیار ہوا۔ چند لوگ شریک ہوئے۔ معمولی حیثیت کے آدمیوں اور خواجہ سراؤں کے واویلا کے درمیان مغلوں کا یہ جلیل القدر بادشاہ! یہ پُر شوکت شہنشاہ! یہ "دُنیا کا بادشاہ!" یہ تاج کا خالق! معمولی مراسم کے ساتھ (جو نہ اُس کے شایانِ شان تھیں اور نہ اُس کے آبا و اجداد کے) سپردِ خاک کر دیا گیا۔ وا حسرتا! عبرت! عبرت!! عبرت!!!

مسمن برج کی سیڑھیوں کے نیچے کا دروازہ جس پر شاہجہان کی قید کے زمانہ سے تیغہ لگا ہوا تھا۔ افسروں نے توڑا۔ اور جنازہ باہر نکالا گیا۔ بیرونی احاطہ سے نکل کر جو اس دروازہ کے آگے واقع ہے۔ جنازہ قلعہ آگرہ کے دروازہ سے باہر لایا گیا۔ اور اُس میدان میں رکھ دیا گیا جو قلعہ کے سامنے ہے۔ اس موقع پر آگرہ کا صوبہ دار ہوشدار خاں بھی اپنے افسروں کے ساتھ آملا اور یہ مختصر مجمع صبح صادق کے وقت جمنا کی جانب آہستہ آہستہ روانہ ہو گیا ؎

دریا پر لے جا کر جنازہ ایک کشتی میں رکھ دیا گیا۔ اور تاج محل کی طرف یہ جلوس روانہ ہو گیا ؎

تاج میں شہر کے عمائد۔ قاضی القضاۃ۔ علما و مشائخ اور دیگر اکابرانِ شہر پہلے ہی سے جمع تھے۔ دوپہر کے قریب نماز جنازہ پڑھائی گئی۔ اور جنازہ ممتاز محل کے گنبد میں لیجایا گیا اور شاہجہان کے جسدِ خاکی کو ممتاز محل کے پہلو میں بحفاظت تمام محو استراحت کر دیا گیا ؎

شہر میں شاہجہان کی موت ایک ایسا سانحۂ غم انگیز تھی کہ بچہ بچہ چشم پُرنم تھا۔ کوئی زبان نہ تھی جس پر شاہجہان کے اوصافِ حمیدہ کا ذکر نہ ہو۔ لوگ اُس کی اچھائیاں ایک ایک کر کے یاد کرتے تھے اور روتے تھے۔ اُس کی چند غلطیوں کو لوگوں نے جلد بھلا دیا تھا۔ وہ ایک ایسا حکمران تھا کہ جس نے رعایا کو اپنی اولاد سمجھ کر حکومت کی تھی۔ اُن کے دکھ درد میں ہمدردی کا اظہار کرتا تھا۔ ان کی خوشی اپنی خوشی اُن کی تکلیف اپنی تکلیف سمجھتا تھا۔ وہ لوگوں کے دلوں پر حکومت کرتا تھا۔ اس لئے ہر ایک اُس کے لئے آبدیدہ تھا۔ اُس کا زمانۂ حکومت ایک پُر امن زمانہ تھا۔ وہ رعایا پر کسی قسم کا ظلم ہوتا نہ دیکھ سکتا تھا۔ اگر کہیں ٹیکس کلکٹر جابر اور ظالم ہوتا تھا اور اُسے خبر ہو جاتی تو اُس کو سزا دینے میں مطلق نرمی کا اظہار نہ کرتا تھا۔ ہر شخص اُس کے طرزِ حکومت کا مداح تھا۔ پھر آج وہ کیوں نہ روتے؟! اُس کا دربار دنیا کا ایک پُر شوکت دربار تھا۔ اُس کی تعمیرات دنیا میں لاثانی تھیں اور اپنے زمانہ کے لئے باعثِ فخر۔ غرض یہ وہ تاثرات تھے جو شاہجہان نے اپنے مرنے کے بعد لوگوں کے دلوں پر چھوڑے۔ یہی وجہ تھی کہ "ہر گلی کوچہ اور ہر مکان سے آہ و بکا کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ آگرہ کے ہر گھر میں کوئی موت ہوئی ہے!!!"

باب نہم
"اورنگ زیب کا رویّہ اور رائے عامہ"

سانحہ کے تقریباً ایک مہینہ بعد اورنگ آگرہ میں داخل ہوا۔ اور جہان آرا سے بہت خوش اخلاقی اور خندہ پیشانی سے ملا۔ بلکہ اُسے یقین دلایا کہ باپ کے زمانہ میں اُسے جو مراعات اور آسائش حاصل تھیں ان میں سرِ مو فرق نہیں آنے پائیگا۔

یہ جہان آرا ہی کی مصالحانہ مساعی تھیں کہ وفات سے چند روز قبل اُس نے منت سماجت کر کے شاہجہان سے ایک ایسے کاغذ پر دستخط کرا لئے تھے۔ جس میں اُس نے

لہ مترجم کا فاضل مورخ سے متفق ہونا ضروری نہیں ؎

اپنے منغضانہ غصّہ کو خیرباد کہہ کر اورنگ زیب کی تمام حرکتوں کو درگذر کر دیا تھا۔ اور اسے بالکل معاف کر دیا تھا +

اورنگزیب کے رویّہ نے نہ صرف اخلاقی اصول حیات کو مجروح کیا تھا بلکہ زمانہ کی عام روِش اور سوسائٹی کے مروّجہ قوانین کو بھی صدمہ پہنچایا تھا +

گو یہ صحیح ہے کہ برسرِ حکومت باپ کے خلاف بیٹے کی بغاوت مغلوں کے شاہی گھرانے کی ایک عام بدبختی تھی۔ مگر دیکھا یہ گیا تھا کہ جب جہانگیر نے اکبر کے خلاف یا خود شاہجہان نے جہانگیر کے خلاف علم بغاوت بلند کیا یا باپ اور بھائیوں کو قتل کر کے عمائد و اکابر سلطنت کا قلع قمع کیا اور خود میدان میں آکر باپ کے خلاف برسرِ پیکار رہا۔ اور سامنے بادشاہ بذات خود مقابلہ کے لئے آیا تو باغی شہزادہ یا تو شرمسار ہو کر مطیع ہو گیا یا فرار ہو گیا۔ لیکن اورنگ زیب نے ایسا نہ کیا۔ اس کی توقعات بہت بلند اور اس کے ارادے بہت پرجوش تھے خواہشات ملک گیری اور جوع ارض و زر نے اُسے سوسائٹی کے عام اصول اور خیر و شر کے عام امتیاز کو بھی پس پشت ڈالنے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ لوگ اُسے ایک بڑا مگر بُرا آدمی سمجھتے تھے۔ بےخوف و بےحجاب +

عامتہ الناس کی عزّت اور اصولی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے اورنگزیب نے اسلام کے ایک ہیرو کا جامہ پہنا۔ اور اپنے آپ کو خدا کے ایک زبردست مشن کا علمبردار ظاہر کیا۔ مذہب میں جو نقائص پیدا ہو گئے تھے اُن کی اصلاح اور ترویج و اشاعت اصول اسلام کا بڑا یگّا آلۂ کار بننے کے لئے جدّ و جہد کی یہی وجہ تھی کہ اُس نے اسلام کے شدید اصول کی اس شدّت کے ساتھ اشاعت و توسیع کرنی شروع کی اور ان میں اسقدر انہماک و سرگرمی کا اظہار کیا تاکہ عامتہ الناس اُس کے برادرانہ اور فرزندانہ رویّوں کو بھول جائیں اور اُسے اس سپرٹ میں دیکھیں جس میں اُس کے دربار کے ایک شاہی مورّخ نے اس طرح دیکھا تھا:-

"اُس کی سلطنت کی شاہی پوشاک کے نیچے بہت عریاں —— ایک درویش کی گلیم بھی جھلکا کرتی تھی!"

ظفر قریشی

(خاص)

عید

دوش میگفت ہلالِ خندہ رو
دوستاں را رسد پیام عید

عید

ازمہ عید بعالم خبر عید رسید — روح تازہ بہ تنِ مُردہ عالم برسید
روزِ عیداست بہارست بمیخانہ بیا — ساقیِ میکدہ صہبائے شفق رنگ کشید

گلچیں کرنالی

ایڈیٹر نیرنگِ خیال کی تصویر پر ہندوستان کے دو مشہور ادیبوں کے خیالات

(۱)

مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی اسسٹنٹ ہوم سکرٹری حیدرآباد لکھتے ہیں:-

مکرمی۔ تسلیم۔ نیرنگ خیال کا سالنامہ ملا۔ کیا کہنا ہے۔ آپ خوب کام کر رہے ہیں۔ تمام ہندوستان کے پرچے آپ کی وجہ سے کشمکش میں پڑ گئے ہیں۔ خیر۔ پرچہ کے اوپر کا کاغذ پھاڑا۔ شروع ہی میں ایک زبردست آدمی کی تصویر نظر آئی۔ خیال ہوا کہ امان اللہ خاں کا فوٹو ہوگا۔ ایک دفعہ ہی کونہ پر نظر پڑی اور خونی حرفوں میں لفظ "ایڈیٹر" دکھائی دیا۔ یقین مانئے کہ اچھل پڑا۔ بھلا یہ اور آپ۔ اللہ رحم کرے۔ جو نقشہ اب تک آپکی شکل کا دل میں بیٹھا تھا۔ وہ یکقلم محو ہو گیا۔ سمجھتا تھا کہ حکیم ہیں۔⁵ دبلے پتلے آدمی ہونگے لمبی ڈاڑھی ہوگی۔ چندھیائی ہوئی آنکھیں ہونگی۔ اوپر موٹے تالوں کی آٹھ آنہ والی عینک ہوگی جسم پر کشمیری کام کا چوغا ہوگا۔ اُس کی گھنڈی نابات اور تکمہ ٹوٹا ہوا ہوگا۔ غرض عین مین حکیم جی ہونگے مگر حضرت آپنے تو غضب کر دیا۔ خدا کے لئے یا تو اپنے نام کے سامنے سے "حکیم" کا لفظ نکال لیئے۔ یا حکیموں کی سی شکل بنائیے۔ ورنہ اور نہ سہی۔ میں تو یہی سمجھونگا کہ حکمت کی سند آپ نے کہیں سے اُڑائی ہے۔ یا نقل کر کے امتحان میں پاس ہوئے ہو۔ آپ کے خطوں میں حرفوں پر باقاعدہ نقطے ہوتے ہیں۔ اُس نے شبہ میں ڈالدیا تھا کہ بس یونہی سے کچھ حکیم ہیں لیکن آپ کی تصویر نے اور رہے سہے خیالات آپکی طرف سے خراب کر دیئے۔ یقین مانئے کہ آج سے میں آپ کے نام کے ساتھ "حکیم" کا لفظ کبھی نہیں لکھونگا۔ ایسے فیشن ایبل آدمی کے لئے "حکیم" کا لفظ استعمال کرنا اگر ایک طرف اس لفظ کی توہین کرنا ہے تو دوسری طرف خود اس شخص پر پھبتیاں اڑانا ہے۔ اس لباس اور اس شکل میں آپکو ایڈیٹر بننے کا یقیناً حق حاصل ہے۔ لیکن حکیم بننے یا حکیم کہلانے کا کوئی حق نہیں ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ میرا ارادہ مونچھیں بھی منڈا دینے کا ہے۔ ضرور بسم اللہ کیجئے۔ مگر اپنی اس نئی صورت کا فوٹو ضرور شایع کیجئے اور نیچے میرا یہ شعر لکھدیجئے۔ ڈاڑھی تو منڈاتے تھے مونچھیں بھی صفا کردیں ابنکلی ہوا اے فرحت کچھ صورت مردانہ۔ بہرحال کچھ بھی ہو کام اچھا کر رہے ہو۔ بشرطیکہ ایسے خاص نمبر نکالتے نکالتے دیوالہ نہ نکل جائے۔

آپ کو یہ تو معلوم ہوگا کہ میں آفات ارضی و سماوی سے میں یکایک شاعر ہو گیا ہوں۔ جب لکھنے بیٹھتا ہوں تو یقین جانئے بالکل یہ معلوم ہوتا ہے کہ میر نے دوبارہ جنم لیا ہے ایک غزل بھیجتا ہوں۔ ذرا تعریف کیجئے اور کسی پرچہ میں چھاپ دیجئے۔ تاکہ لوگوں کو بھی معلوم ہو جائے اور شاگردوں کا ہجوم اور اُن کی نذریں کم سے کم نوکری سے مجھکو بے نیاز کر دیں۔

کمترین مرزا فرحت اللہ بیگ

طلبگار جور و جفا ہو گیا ہے — الٰہی مرے دل کو کیا ہو گیا
تڑپ یوں دل ہوگی شرمندگی — اگر تیر اُس کا خطا ہو گیا
قیامت میں کیا آیا وہ سامنے — کہ اک حشر سب میں بپا ہو گیا
یہ آنے لگیں کیوں مجھے ہچکیاں — کوئی نالہ شاید رسا ہو گیا
رواں ہوتا ہے روح کا کارواں — ہر اک سانس بانگ درا ہو گیا
شب غم میں آتی نہیں موت بھی — مجھے زہر آبِ بقا ہو گیا
یہ کیا بھید ہے تو ہی واعظ بتا — کہ جو اُس نے منہ سے کہا ہو گیا
تعلق سے انسان۔ انسان ہے — نہ ہو یہ تو مجھو خدا ہو گیا
میرے دل کا تو دیکھ پاس ادب — کہ نالہ بھی اُس کا دعا ہو گیا
ذرا جا کے دیکھ اپنے فرحت کا حال — کہ بیچارہ اب کیا سے کیا ہو گیا

فرحت

⁵ طبابت شروع کرنے سے قبل میری صحت آپکی ذہنی تصویر تھی۔ یہ صرف حکمت کا ہی اثر ہے کہ میں ایک تندرست اور مضبوط آدمی بن گیا ہوں۔ وہ شخص طبیب بننے کا حق نہیں رکھتا جو خود مریضوں سے بدتر ہو۔ کیا آپ نے قبلہ حکیم فقیر محمد صاحب چشتی نظامی کو نہیں دیکھا۔ جو خاکسار کے بڑے بھائی معلوم ہوتے ہیں۔ ایڈیٹر

ایڈیٹر نیرنگِ خیال

کی تصویر پر ایک نظر

(۲)

از حضرت خواجہ حسن نظامی مدظلہ العالی

میں بت شکن قوم کا بیٹا۔ تو کافری بُت نئے زمانہ کا۔ دیکھوں تو موجود۔ ہاتھ لگاؤں تو نابود۔ تو ہے؟ یا نہیں ہے؟

آنکھ جانتی ہے تو ہے۔ ہاتھ کہتا ہے نہیں ہے۔ اگر ہو تو انگریز ہوگا۔ کیونکہ رخ انگلش دل تُرکانہ داری ؛

پیشانی ایسی جیسے مومن کا دل۔ صاف۔ بلند۔ کشادہ۔ بھویں بھیلوں کے تیر کی کمان۔ آنکھیں قاف کی پریوں سے چُرائی ہوئی۔ ناک۔ رخسار مونچھیں ایسی جیسے جرمن فوج کا بندوقچی۔ تھوڑی میں کنواں نہیں ہے جس کو غب غب کہتے ہیں۔ البتہ مصوّر قدرت نے تصویر بناتے وقت چاہِ یوسف کا سایہ دکھایا ہے۔ اوپر ظلمت نیچے نور۔ گویا رات دن کا فرق ایک جگہ جمایا ہے ؛

اس بت کے کان ایک ہی ہے۔ یہ بولتا نہیں چپ ہے تو سنتا بھی نہ ہوگا۔ اور سنتا ہوگا تو فقط ایک کان سے۔ کیونکہ دوسرا کان کٹی لاکھ کوس سے فقط اپنا ماتھا دکھا رہا ہے۔ کپڑے اس کے بدیشی۔ بائیکاٹ کا ہدف۔ سینہ پر بے رنگ پھول۔ نہیں نیرنگ کی ایک بے رنگی۔ آخر میں لال لال ایڈیٹر۔ اور پھر ختم ؛

حسن نظامی

افکارِ اسد

(جناب محمد اسد خاں صاحب بی۔ اے ملتان)

تیرے اندر جذب ہو جانے پہ دل آمادہ ہے
عزمِ سجدہ اک خیالِ پیش اُفتادہ ہے

دیکھنے کرتا ہے عشق ان میں سے کس کو انتخاب
دل ہے عرفاں آفریدہ عقل حیرت زادہ ہے

یاں خوشی پر ہے قناعت اور نہ غم پر اکتفا
قلب دونوں حالتوں میں انقلاب آمادہ ہے

دن کو رندِ آفتاب آشام ہوں اور رات کو
کہکشاں ہے سبحہ میرا۔ آسماں سجادہ ہے

خضر اور میں ہمسفر ہیں صرف اتنا فرق ہے
میں تو ہوں آزادہ رو اور وہ اسیرِ جادہ ہے

دیکھتا ہوں اسمیں داغِ حسرتِ صہبائے عشق
ساغرِ مہتاب کس محفل سے دور اُفتادہ ہے

کس کی آمد کے لئے پتّوں سے ہر نخلِ چمن
آج پھیلائے ہوئے دستِ دعا استادہ ہے

حضرت ناصح کے چہرے پر جو ہیں آثارِ کیف
پندِ ترکِ مے میں بھی شاید سرورِ بادہ ہے

کم سوداوں کو پھنسائیں دلبرانِ شوخ و شنگ
اے اسد اپنا تو دل صیدِ بتانِ سادہ ہے

اسد

(خاص)

اورنگ زیب

(علامہ اقبال کی فارسی نظم کا ترجمہ)

از پروفیسر تاثیر مدظلہ

نام جاری ہے زباں پر سب کی عالمگیر کا
دبدبہ ہر دل پہ ہے اُس صاحبِ شمشیر کا

کون عالمگیر؟ وہ فرماں دہِ دنیا و دیں
وہ کہ ترکش میں ہمارے تھا خدنگِ آخریں

وہ کہ میدانِ وغا میں دن کو گر استادہ تھا
سر بسجدہ شب کو۔ رہینِ خرقہ و سجادہ تھا

ایکدن وہ صاحبِ زیبائشِ تاج و سریر
وہ کہ سلطانوں کا سلطاں تھا فقیروں کا فقیر

صبح صبح سیر کی خاطر۔ اکیلا چل دیا
جانے کس عالم میں تھا! جنگل کا رستہ لے لیا

شہر میں گو نور و ظلمت میں ابھی پیکار تھی
صبح اُس جنگل میں لیکن مطلعِ انوار تھی

ٹہنی ٹہنی پر پرندے وجد میں تسبیح خواں!
عظمت و جبروتِ خالق ذرّے ذرّے سے عیاں!

شاہِ رمز آگاہ کا سر جھک گیا بہر نماز
لے گیا حسنِ حقیقت کی طرف حسنِ مجاز

ناگہاں اک شیر آنکلا شجر کی آڑ سے
چرخِ گردوں کانپ اٹھا جسکی اک چنگھاڑ سے

بوئے انساں سوئے انساں جنگئی خود رہنما
شیر نے اک جست کی اور پشتِ شاہ پر آگرا

شاہِ عالمگیر نے مڑ کر نظر تک بھی نہ کی
ہاں مگر تیغ دو دم قبضے سے باہر کھینچ لی

ڈر کی گنجائش کہاں قلبِ شہِ جرّار میں!
شیرِ قالیں شیرِ بیشہ کو کیا اک وار میں

پھر ہوا جاری اُسی انداز سے دورِ صلوات
پھر ہوئے قائم رکوع و سجدہ والتّحیات

مردِ مومن کا ہے دل یوں خودنما و خودشکن
سر رہینِ سجدۂ حق۔ دست و بازو تیغ زن

نام جاری ہے زبانوں پر تو عالمگیر کا
دل بھی سینے میں ہے کیا اُس صاحبِ شمشیر سا!

دل ترا لبریز خوفِ حق سے ہو گر زندہ ہے
مُردہ ہے تو غیر کی ہیبت سے گر لرزندہ ہے

(نامس) جلوہ فرما ہو سکے حق جسمیں وہ دل چاہئے
ایسے دلبر کے لئے ایسا ہی محل چاہئے

تاثیر

فرانسیسی طرزِ انشا کے دس نادر نمونے

(از جناب حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی مدظلہٗ العالی)

مصطفےٰ کمال پاشا

تو میرا بھائی ہے۔ یورپ شکن ترکی ہے۔ خلافت شکن جمہوری ہے۔ دُبلا ہے لمبا ہے۔ یورپ کی آنکھ میں تنکا ہے۔ ترکی قصر کا شہتیر ہے ٭ کوچۂ عشق کے سودائی۔ رسوائی سے نہ ڈر عشق بازوں کی صف میں آیا ہے تو جھوٹی تہمتوں کو اٹھا۔ کوئی کہے گا اسلام کا دشمن ہے۔ کوئی کہے گا پردہ شکن ہے۔ عربی حروف کو مٹاتا ہے۔ عورتوں کو نچاتا ہے۔ دین کی عظمت کو گھٹاتا ہے ٭ سب جھوٹ ہے۔ تو ایشیا کا دمساز ہے۔ تو ترکی کا ہلال ہے۔ اسکو بدر بنا کر چمکاتا ہے ٭ تیرا یورپین لباس اور تیرا یورپین خیال ایک سپاہی قوم کو حریفوں کے حرم میں ایسے بھیس میں تقسیم کرتا ہے جو ہر شیطانی قوت کو مغلوب کر سکیں ٭ من اندازِ قدرت را می شناسم ٭ کچھ ہی نہیں۔ کچھ ہی نظر آ۔ اندر سے تو وہ ہے جو تھا۔ اور جو ہونا چاہئیے ٭ آ۔ قریب آ کر سن۔ اور پاس آ کر کان جھکا۔ ایشیا۔ ایشیا۔ اتحاد۔ اتحاد۔ کمال۔ کمال۔ پھر زندگی تیری اور ہم سب کی ٭

غازی مصطفےٰ کمال پاشا

رضا شاہ پہلوی

ویران شدہ ایران کو سرسبز و متحد ایران بنانیوالے۔ امام رضا علیہ السلام کی برکت اسمی سے بہرہ ہونے والے۔ او چپ چاپ مگر خوب بولنے والے مجھ سے بات کر۔ اپنی کہہ۔ میری بھی سن۔ ایران ہی ایشیائی تہذیب کا دل تھا۔ اور ایران ہی اسکا دماغ بھی تھا۔ ایران ہی کیا جا رہا تھا۔ اور ایران ہی ایشیا کی تقسیم و تفریق کو ختم کرنے والا ہوگا ٭

کھڑا ہو گھوڑا منگا۔ میں تجکو سوار ہونے اور منزل پر پہنچنے کی خبر دینے آیا ہوں۔ تو جبتک گھوڑے پر سوار رہے گا میں کھوں گا سامنے ہو۔ اور جب تو گھوڑے سے اُترے گا تو نعرہ لگاؤنگا کہ منزل آگئی۔ اب جھک کر کہ منزل آجانیکے بعد جھکنا اور اترنا ضرور ایشیائی قوم تجھ میں ہو اور تو اس میں ہو بول اور کہہ من تن شدم تا کہ وہ جواب دے من جاں شدم۔ پھر ایک تن اور جان ہو کر ایشیا نعرہ لگائے:۔

من تن شدم تو جاں شدی
تا کس نگوید بعد ازیں
من دیگرم تو دیگری

شہنشاہ رضا شاہ پہلوی۔ والئ ایران

سلطان نادر شاہ

سلطان نادر شاہ

دروازہ کے پاسبان۔ او افغانستان! دیکھ اپنے سلطان کو نادر ظل رحمٰن کو سیف اللہ قلم علیم و حکیم کو ٭ جو ربانی تائید سے تیرا حکمراں اور فرمانروا ہوا یزدانی حکمت و اسباب سے تاج پوش تاجدار بنایا گیا ٭

دل کو غبار کو وسوسے سے پاک کر کہ تیری سلامتی اور تیری عزت ایک مرکز وحدت پر جمع ہو جانے میں ہے اور وہ مرکز نادر شاہ کا وجود ہے ٭ او نادرا! او خاکپاک افغانی کے نادر ذرہ! اخوت عالم کو زندہ کر جو عرب کے پہاڑوں میں تیرہ سو برس پہلے پیدا ہوئی تھی۔ اسکو پھر نمودار کر او نیچے اونچے پہاڑ۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے تجکو پکار رہے ہیں کہ نادر اخوت اسلام کا رہبر بن۔ اور افغانستان کو جاپان بنا دے ٭ افغان قوم آسمانی بشارتوں کے موافق ایک نہما قوم ہوگی جو ایشیائی قوموں کو راستوں کی بھول سے بچا کر ایک سیدھے راستہ پر لائیگی۔ تو اس قوم کا مجدد بن۔ اور خدا کی قوتوں کو انسانی سعی کے قریب دیکھ۔ نادر! یاد رکھ۔ غور کر۔ تو خود نہیں آیا ہے۔ تجکو غیبی قوت نے بھیجا ہے ٭

عرب قومیت سے خطاب

دلنواز حجاز۔ محبوب و مطلوب مکہ اور مدینہ۔ مقدس محترم کعبہ و زمزم۔ دلربا گنبد خضرا۔ زلف نما جالی جو مزار رسول ہاشمی کے رخ انور پر بل کھاتی ہے ۔ ابن سعود ملک الحجاز عربی قدامت و سادگی کی تہذیب کے سرتاج۔ قوم اخوان کی روح۔ نظم ملکی کے پیکر احسن۔ طویل القامت عقیل السیاست ۔ فلسطین کے رہنما مفتی اعظم۔ مسجد اقصیٰ اور حرم اول کے خادم یہودی یاجوج ماجوج کے سد سکندر۔ عرب قومیت کے دماغ ۔ مصر کے فواد (دل) الملک (بادشاہ) ملک یوسف کے عزیز۔ ارواح وطنی کے تجدید کنندہ مصری احرار۔ ازہر کے فضلا و خطباء۔ اہرام کی قدامت و استحکام کے زیر سایہ اور نیل کی گنگا کے کنارے آباد ۔ عراق کے فیصل ابن حسین ہاشمی۔ آل نبیؐ۔ اولاد علیؑ۔ بغداد و کربلا و نجف کے سیف و قلم کے امین ۔ مراکو کے فاطمی سادات سفید نورانی قباؤں والے۔ جری۔ حسین۔ رعنائی اور شہ سواری میں یکہ تاز۔ فرانس سے مقصور۔ حریت سے معمور ۔ تونس اور الجزائر کے جری و فطین یہ فرانس سے مزین ۔ شام کے صف شکن۔ حریت نواز۔ عسکریت مآب۔ ولولہ جہاد سے مست و سرشار ۔ عرب قومیت کا وجود واحد ہو ۔ دیکھنے میں الگ حقیقت میں ایک ہو ۔ تَحْسَبُهُمْ فُرَادًا وَقُلُوبُهُمْ وَحْدَہ

آؤ عرب قومیت کو ایشیائی قومیت سے متحد کر دو ۔

شاہ فواد والئ مصر

سلطان نجد وحجاز

ایشیائی قومیت سے خطاب

آؤ چین۔ او جاپان۔ او ترکی۔ او ایران۔ او تاتاری۔ او افغانی۔ او عرب۔ او ہندوستانی اپنی ایشیا کو نہ بھول۔ اپنی اصلیت سے بے رخ نہ بن ۔ بکھرنے کا وقت ختم کر دے۔ ملنے اور ایک ہو جانے کا زمانہ بلاتا ہے ۔ ایسا ہو سکتا ہے۔ ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔ اور ایسا ہی ہوگا ۔ آؤ ایسا کریں۔ آؤ ایسا ہوتا دیکھیں۔ آؤ ایشیا کو اپنے گاندھی اور اپنے جواہر لال کو دکھائیں۔ جو ایشیا کے تن من دھن کو ایک کرنیوالے ہیں۔ اللہ۔ یزداں۔ اوم۔ بدھ کے متحدہ علم کو بلند کرو۔ اور دنیا میں بلند اور اونچے ہو جاؤ۔ ان سے بھی اونچے جو تم کو سب سے نیچا بنانے کے رات دن کام کرتے رہتے ہیں۔ صبح ہوئی ایشیا جاگی

ایشیا کا آفتابی جھنڈا

مسلم قومیت سے خطاب

تو رنگ اور نسل سے آزاد ہے۔ تو لباس اور دولت کے امتیاز سے بدتر ہے۔ تو ازلی ہے۔ ابد تک رہنے والی ہے تو سیراب کرنیوالی آگ ہے تو جلانیوالا پانی ہے۔ تو زندہ کرنیوالی تلوار ہے۔ اور حیات ابد دلانیوالی موت ہے ۔ الحمرا بس سو چکی بغداد۔ بہت رو چکی۔ ہندوستان میں کھڑی ہو کر وہ تیرا وطن ہے۔ ہندو سے معانقہ کر کہ اس میں تیری یاد ہے ۔ تو اپنے وطن کے بادل کی گرج اور چمک سے مل۔ گنگا جمنا کی لہروں کو آنکھوں میں لا۔ ہمالہ کی بلندی اور چوٹیوں کی برف سے دل کو اونچا اور ٹھنڈا کر ۔ تو کاشی اور ہردوار۔ متھرا۔ اور اجودھیا۔ رام و کرشن۔ گیا اور گوتم بدھ سے اخلاص و پریم بڑھا۔ اور سب کے میل سے اپنی مسلم قومیت کا ایک مقناطیس اور ایک کہربا بنا ۔

اسلامی ہلالی جھنڈا

ہندوستانی قومیت سے خطاب

مسلم عرب ایران سے آنیوالے مسلم ہندوستانیں بس جانیوالے مسلم جیں ہیں میں رہتا ہے اسکا بھیس تجکو مضبوط اور سربلند کرنیوالا ہوگا ۔ میری سن اپنی من کہ میں تیری باتیں زبان کی چپ چپ گیا اور ہو گیا ۔ گنگا کنارے جھل مل پانی کے دوارے۔ ہرے ہرے پیپل کی چھاؤں میں اے ہندوستانی میری اکاش بانی کو کان میں لا ۔ دوئی کا میل پریم کی گنگا میں لہر کی پڑی پراشنان کرکے دور کر دے ۔ نہ تو بڑا ہے۔ نہ چھوٹا ہے۔ نہ تو ادنے ہے نہ اعلےٰ ہے۔ مگر تو ہر وقت بڑا ہے۔ ہر حال میں اعلےٰ ہے کیونکہ تو ہندوستانی ہے۔ سب سے قدیم اور سب سے نرالا ۔ گیتا اور رامائن تیرے کان ہیں گنگا جمنا تیری آنکھیں ہیں اور ہمالہ تیرا سر ہے اور بھارت کی زمین تیرا دل ہے۔ اور جوتی سروپ ایشور کی بھگتی تیرا دھرم اور من کی جوت ہے ۔ اپنے پڑوسیوں سے مل۔ انکو اپنا بنا۔ اور دیس کو ایک تن۔ ایک من۔ ایک دھن کی جاتی بنا کر مکتی و شانتی و نروان حاصل کر ۔ دنیا تجھ کو لالچ سے دیکھتی تھی۔ ایسا بن کہ دوسروں کے لالچ سے آزاد ہو اور اب سب تجکو ادب و عزت سے دیکھیں۔ تجھ پر ہاتھ اٹھانے کی جرأت نہ کرسکیں ۔

ہندوستان کا کانگرسی جھنڈا

[illegible]

روپے سے خطاب

آجا تجھے ڈالوں جیب میں۔ ہندو کے لئے لکشمی بنا۔ اس کے سر کو معبود بن کر اپنے سامنے جھکوایا۔ مسلمان کے عقیدہ میں نجس دنیا بن کر اس کے طالب کو کتے کا خطاب دلوایا۔ مجھ کو ان دونوں سے الگ ہو کر تجھ سے نہایت دبدبہ کے ساتھ کہنا ہے۔ کہ آجا۔ تجھے ڈالوں جیب میں۔ تو بے وفا ہے۔ سب کو دغا دیتا ہے۔ اِس جیب سے اُس جیب میں بھاگتا رہتا ہے۔ تو اپنی عادت کو نہ بدل۔ نہ تجھ میں عادت بدلنے کی طاقت ہے۔ مگر میں ہندوستانی اور مسلمان ہندوستانی ہوں۔ میں تیری محبت و نفرت سے آزاد ہو کر قوم و ملک کی ضرورت کا پھندہ تیری گردن میں ڈال کر کہتا ہوں کہ بس اب تو پھنس گیا۔ آجا تجھے ڈالوں جیب میں۔

وقت سے خطاب

مبلغ علیہ السلام"

خدا نے عربی زبان میں اپنے رسول محمدؐ کی زبانی کہا تھا۔ لَا تَسُبُّوا الدَّہْرَ۔ اَنَا الدَّہْرُ۔ وقت کو بُرا نہ کہو۔ میں وقت ہوں۔ ....

اے وقت کیا تو خدا ہے؟ اگر ایسا ہے تو ہمارا بن۔ ہم کو اپنا بنا۔ ہمارے ساتھ چل۔ ہم کو اپنے ساتھ چلنے دے تو سورج کی طرح قائم ہو۔ اور ہم کُرّوں کی شکل تیرے آس پاس گردش کریں۔ تو نہ جا۔ تو ہر وقت یہاں رہ۔ اور ہم ہر وقت تیرے ساتھ رہیں۔

اے ہر (خدا) تو ہر وقت میں سما جا اور ہم کو ہر وقت بنا جا۔ ....

تو چلے تو ہم بھی چلیں۔ تو رُکے تو ہم بھی رُکیں۔ ....

تو ہر وقت اونچا اور برتر ہے۔ ہم کو بھی اونچا اور برتر رہنے کی ہمت دے۔ آمین۔

وقت کی برق رفتاری

حسن سے خطاب

تو آنکھ میں ہو۔ بال اور رُخسار میں ہو۔ غمزہ اور رفتار و گفتار میں ہو۔ ناز و عشوہ و تبسم و کرشمہ میں ہو۔ کہیں بھی ہو۔ تجھ کو عشق کی قسم دنیا سے چلا جا۔ کیونکہ تو نے ہم کو دوسروں کا محکوم بنا دیا۔ تو نے ہماری آہوں کو اور آنسوؤں کو اور دردِ دل کو فضول اور بے نتیجہ راستہ میں خرچ کرا دیا۔ تو نے مردوں کو عورتوں کی جوتیاں کھلوائیں۔ تو نے عورتوں کو خود پسند اور اوصاف نسوانی سے محروم کر دیا۔ دیکھ اگر تو نہ گیا تو آخر تجھ کو جانا ہی پڑے گا۔ کیونکہ اب ہندوستان کو آزادی کی ضرورت ہے۔ اور تو غلام اور گرفتار رہنا تا ہے۔ اب ہندوستان کو پیٹ بھر کر کھانے اور نیند بھر کر سونے کی ضرورت ہے۔ اور تو انسان کو بھوکا رہنا اور جاگنا سکھاتا ہے۔ ....

اب یاروں نے عشق کو فراموش کر دیا ہے۔ کیونکہ روٹی کی ضرورت ہر یا دپر غالب آگئی ہے۔ اور تیری قدر اسی موذی عشق کی وجہ سے تھی۔ جب وہ دل سے اتر گیا۔ تو اب تیری ضرورت کس کو ہے۔ جو تو یہاں ٹھہرا ہوا ہے۔ ہمیں اب تیری ضرورت نہیں۔ عقل اور قوت کی ضرورت ہے۔ جو تیرے یہاں حُسن ہونے کے سبب پاس نہیں آتیں۔

....

حسن نظامی دہلوی

(خاص)

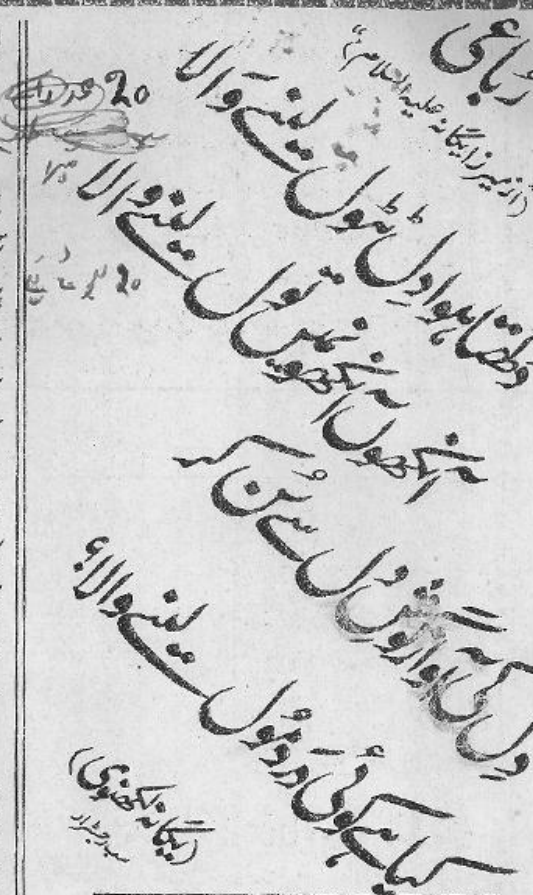

رباعی

(از میرزا یگانہ علیہ السلام مرثیہ)

وہ کیا ہوا دل ٹٹول لینے والا
منہ تکھوں نہیں تول لینے والا
منہ آنکھوں سے سن کر
دل کس کا ہوا آوارہ دل سے لینے والا
کیا ہے کوئی اردو بول سے لینے والا

(یگانہ لکھنوی)

رمضان کا چاند

الٰہی شکر ترا پھر مہِ صیام آیا
مہِ صیام نہیں عید کا پیام آیا

ہزار ماہ سے بہتر ہے ایک رات اسکی
اسی مہینہ میں اللہ کا کلام آیا

گھڑی وہ کیسی مبارک تھی کل جہاں کیلئے
حرائے عرش سے اقرا کا جب پیام آیا

جب اپنی پوری جوانی پہ آگئی دنیا
تو زندگی کے لئے آخری نظام آیا

میں اسپہ بھیجوں درود و سلام کس منہ سے
کہ جسکے نام خود اللہ کا سلام آیا

ہے زندگی تو اسی کی جو مر مٹا دیں پر
وہی ہے کام کا اسلام کے جو کام آیا

(عصمت) (رازق الخیری)

فنِ تنقید پر افسر صاحب کی لاجواب تصنیف

حامد اللہ افسر کا شمار دورِ جدید کے ممتاز ترین ادیبوں اور شاعروں میں ہے۔ اور ان کی بے نظیر مقبولیت اور ہر دلعزیزی کا سبب ان کی تڑپا دینے والی نظمیں اور غزلیں اور ان کے نہایت شگفتہ اور سنجیدہ نثری مضامین ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قلعہ معلےٰ کی ٹکسالی اور مستند زبان میں نئے اور اچھوتے خیالات نہایت سادگی۔ بے تکلفی۔ اور روانی کے ساتھ ادا کر دینا افسر کا حصہ ہے۔ لیکن شاید پرستاران افسر کے وسیع حلقہ میں کم لوگ اس حقیقت سے آگاہ ہیں۔ کہ جس قلم سے افسر ننھے ننھے بچوں کا دل بہلا سکتے ہیں (افسر کی بہت سی کتابیں نہ صرف یوپی بلکہ ہندوستان کے مختلف صوبوں میں درسیات میں داخل ہیں) اور نوجوانوں اور معمر حضرات کی روحوں کو وجد میں لا سکتے ہیں۔ اسی قلم سے وہ اپنے علمی تبحر کی شان بھی دکھا سکتے ہیں۔ اور نازک سے نازک اور پیچیدہ سے پیچیدہ علمی مسائل اور فلسفیانہ نکات کو نہایت دلنشین پیرایہ میں اور غایت درجہ سلاست اور روانی کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں ✦

آج کل افسر صاحب فنِ تنقید پر ایک کتاب تصنیف فرما رہے ہیں۔ جس میں افلاطون کے وقت سے لے کر زمانہ حال تک تنقید کے جسقدر نظریئے قائم ہوئے۔ اور اس فن نے جتنی منزلیں طے کیں ان سب پر عالمانہ بحث کی گئی ہے۔ اس کتاب میں فنونِ لطیفہ۔ تخلیقی ادب۔ ادب اور تفریحِ طبع ارسطو کا نظریہ محاکات۔ نظریہ تحریکِ تخیل۔ جمالیات اور فنونِ لطیفہ جیسے اہم اور نازک مسائل پر مقالات سپردِ قلم فرمائے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ان دقیق اور فلسفیانہ مباحث کو جس خوبی اور جس قدرت کے ساتھ بیان کیا ہے وہ افسر ہی کا کام تھا۔ ہمیں خود اس کتاب کے بعض اجزا کے مطالعہ کا شرف حاصل ہوا ہے۔ اور ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اردو زبان میں یہ لاجواب کتاب ایک معتدبہ اضافہ ہوگی۔ اول تو فنِ تنقید پر اردو میں کتابیں ہی نہیں ہیں۔ لیکن اگر ایک ہزار کتابیں بھی موجود ہوتیں تب بھی ہمیں پختہ یقین ہے۔ کہ یہ کتاب اپنی جگہ پیدا کر لیتی ✦ (ایڈیٹر)

فلاحِ دین و دنیا یہ کتاب تیسری بار چھپی ہے اسے شریعت اسلام کی سائیکلو پیڈیا کہنا چاہیے۔ مذہب اسلام کے متعلق اس میں ہر ایک ضروری مسئلہ موجود ہے۔ حجم ۵۷۵ صفحہ کاغذ وغیرہ بہترین۔ قیمت چار روپیہ آٹھ آنہ للعہ

منیجر نیرنگِ خیال بکڈپو شاہی محلہ لاہور

فاضل

فرانس کے مشہور ڈرامانگار فرونڈائی کا شاہکار

مترجمہ جناب صدیق طبیب بہاری

فرانس کے مشہور ڈرامانویس فرونڈائی کے ڈرامے عوام وخواص کے ہر طبقہ میں اشتیاق اور پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ پیرس کا "مولیر ہاؤس" جو دنیا بھر کے اسٹیجوں پر یہ امتیاز رکھتا ہے کہ اس میں صرف اپنے ڈراموں کی تمثیل کی جاتی ہے۔ جو فن کے لحاظ سے ہر قسم کے معائب سے پاک اور سو فیصدی کامیاب ہوں' فرونڈائی کا یہ ڈرامامتعدد بار اپنے اسٹیج پر تمثیل کر چکا ہے۔ اور ارباب فن فرونڈائی کے کمال فن کا بارہا اعتراف کر چکے ہیں +

فرونڈائی اپنے ڈراموں کی ترکیب وتسنیخ میں متضاد عناصر جمع کر دینے کی جو بے نظیر قابلیت رکھتا ہے۔ ڈراموں کی دنیا میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ زیر نظر ڈرامامیں بھی تمثیل کے تین گھنٹوں میں وہ ایک باکمال خطیب' ایک خیال پرست ادیب' ایک عالم نفسیات' ایک عالم اجتماعیات اور مختلف اقوام وملل کے طبائع اور صنفی معلومات کے ایک بڑے ماہر کی متضاد حیثیتوں میں نظر آتا ہے۔ لیکن وہ اپنے پر عائد کردہ متنوع فرائض جس خوبی سے ادا کرتا ہے۔ وہی دراصل اسکا کمال اور اس کی امتیازی صفت ہے۔ اس ڈراما میں اس نے محبت اور ازدواج کے متعلق مشرق ومغرب کے متضاد مطمح نظر کا تجزیہ کیا ہے اور اس مقصد کے لئے کردار ایسے منتخب کئے ہیں کہ تخیل اور تمثیل دنیا شاید ان سے بہتر کردار نہ پیش کر سکے۔ اسکا ممدوح فاضل صرف ایک غیر متمدن شوہر ہی نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایک کامل مشرقی مرد کی تمثیل کر رہا ہے۔ اسی طرح فابین۔ مغربی عورت کی حقیقی فطرت کا مظہراتم ہے۔ اس لئے ان دونوں کے درمیان محض روحی یا ذہنی کشمکش نہیں ہے۔ بلکہ جنسی وقومی اختلافات کی عمیق خندق اور مشرق ومغرب کا بُعد حائل ہے۔ مشرقی نژاد فاضل ایک عرب اور مسلم ہونے کی حیثیت سے فابین کی آزاد صحبتوں اور اس کے مغربی اطوار کو برداشت نہیں کر سکتا۔ اور مغرب کے آزاد ماحول کی تربیت یافتہ فابین کسی مشرقی عورت کے انقیاد مطلق اور مرد کے تعدد ازدواج کا تصور بھی نہیں کر سکتی +

یہ ڈراما خاصا طویل ہے۔ اس لئے ہم نے اس کا حرف بحرف ترجمہ کرنے کے بجائے۔ اس کا خلاصہ اردو میں منتقل کر دیا ہے۔ مگر اس کا خاص طور پر خیال رکھا ہے کہ پلاٹ میں یا ڈرامانویس کے اسلوب بیان میں کوئی تغیر نہ ہو اور ڈراما کے اہم حصے اپنی حالت پر قایم رہیں۔ ص......

---

(۱)

شب تار اپنے عنبریں گیسوؤں میں منہ چھپائے شرماتی ہوئی حجرۂ عروسی کی طرف بڑھ رہی۔ گویا وہ اس تخیل سے متاثر ہو رہی ہے کہ آج فابین فاضل کے پہلو میں محو استراحت نظر آئے گی +

وہ دونوں گذشتہ شب کی محفل رقص کا تذکرہ کر رہے ہیں۔ فابین کا خیال ہے کہ کیف رقص میں جب دونوں کے جسم متصل ہوتے ہیں اور فرط تواجد سے دونوں کی روح ممزوج ہو جاتی تو سانپوں کے سوا ان کے رقص بدیع کا اور کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا +

فابین اپنی محبوب' نزاکت آمیز گدازیت کے باوجود ایک شعلہ جوالہ معلوم ہوتی ہے جس کی مسرتوں کو گھر کی چار دیواری کے اندر چین نہیں آتا۔ وہ رنگینیوں کی ایک دنیا ہے جس کی رعنائیاں ہر لمحہ کسی نئی شکل میں صورت پذیر ہوتی ہیں۔ ہمارا عرب دوست فاضل اس فرانسی تیتری سے ایک دقیقہ کے لئے بھی جدا ہونا گوارا نہیں کرتا۔ اور وہ بھی اپنا تمام عشوہ وناز فاضل کی دلداری اور نشوۂ عشرت کو دو آتشہ کرنے پر صرف کر رہی ہے۔ غرضیکہ ان کے ماہ عسل کے یہ ابتدائی ایام اسقدر دلچسپیوں اور مسرتوں کے حامل ہیں کہ گویا لطف وعشرت کی تخلیق خاص انہی کے لئے ہوئی ہے +

ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے۔ فابین جبراً و کرہاً فاضل کے پہلو سے یہ کہتی ہوئی اُٹھتی ہے:" کاش ہمارا مخبرِ خفیہ ہوتا اور ان بدتمیزوں کو جو کسی کی مسرت نہیں دیکھ سکتے ہمیں دق کرنے کا موقع نہ ملتا " وہ آواز بدل کر جواب دیتی ہے " وہ کہیں باہر تشریف لے گئی ہیں "۔۔۔۔۔۔۔ " میں خادمہ ہوں "۔۔۔۔۔۔۔ " غالباً وہ آپکی دعوت پر نہ جاسکیں گی "۔۔۔۔۔۔۔ " وہ دوسری جگہ مدعو ہیں " +

فاضل اس تصور سے استلذاذ حاصل کرتا ہے کہ فابین چند دقیقہ کے لئے بھی اُس سے جدا ہونا گوارا نہیں کرتی۔ وہ سرمستانہ فابین کی طرف بڑھتا ہے اور اسے اپنے مردانہ بازوؤں کی مضبوط گرفت میں لے کر اُس کے لب ہائے لعلیں پر مہرِ عقیدت ثبت کرتا ہے +

فابین اپنے زرتار پردوں والے کوچ کی طرف لوٹتے ہوئے کہتی ہے۔ کہ" یہ کاؤنٹ زادیاں بڑھاپے میں بھی جوانی کی یاد تازہ رکھنا چاہتی ہیں" پھر فاضل کے سامنے تجویز پیش کرتی ہے۔ کہ آج شام کا کھانا ہم مُدرِیڈ ہوٹل میں کھائیں گے۔

" اس شرط پر کہ موٹر میں چلاؤنگا " +

" ہاں ہاں ضرور! تمہارا ڈرائیور پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوگا۔ موٹر شہاب ثاقب کی سرعت سے جارہی ہوگی۔ میں تمہارے پہلو میں ہونگی۔ اور خوف سے میرا رنگ اُڑ کر ڈھلی قمیص کی طرح ہوگا۔ کیوں تم موٹررانی میں اپنے بہادر باپ کی تقلید تو ضرور کروگے؟"

(دلنشیں تبسّم کے ساتھ)" میرے باپ نے موٹر کار کبھی نہ دیکھی مگر اسکا گھوڑا دو ہی گھنٹے کی سواری میں خون اُگلنے لگتا تھا +

(متحیر ہوکر) " پھر؟"

(نہایت سادگی سے)" پھر وہ دوسرا گھوڑا بدل لیتا تھا" +

فاضل کے اس جواب سے فابین کی حیرت میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ اور تھوڑی دیر تک شہسواری کے موضوع پر گفتگو ہوتی ہے۔ پھر دریافت کرتی ہے:-

" ابکی ہم گرمیاں کہاں گذاریں گے۔ اِکس میں یا سان سیباستیان میں جہاں میں نے پہلی بار تم کو دیکھا تھا۔ اور پہلی ہی نظر میں تمہیں منتخب کر لیا تھا۔

(طنز آمیز تبسّم کے ساتھ)" تم نے منتخب کیا تھا!"

" بیشک!"

" خیر! منتخب تم نے کیا تھا۔ مگر تمہیں اپنی بیوی میں نے بنایا تھا" +

" اف اس پرلطف سرگذشت کو تم کسقدر وحشیانہ اور متشددانہ الفاظ میں یاد کرتے ہو۔ بس تمہاری یہی وحشتیں مجھے نہیں بھاتیں " +

فاضل معذرت کرتا ہے۔ اور وعدہ کرتا ہے کہ آئندہ اس لہجہ سے اجتناب کرے گا +

" اچھی طرح یاد رکھو ایک مہذب مرد کے لئے ضروری ہے کہ عورت کا احترام کرے۔ اور اُس سے تخاطب کے وقت اپنی آواز کو پست اور اندازِ گفتگو کو عاشقانہ بنائے "

— (تمسخرانہ قہقہہ کے ساتھ) تملق اور تصنع! ایک " غیر مہذب" بدوسے اس کی امید فضول ہے۔ کیا تم چاہتی ہو کہ تمہاری ملت والوں کی طرح میں بھی عورت کو مرد سے برتر تسلیم کرلوں۔ اور تمہارے قدموں سے اس طرح لگ کر بیٹھوں۔ جس طرح ایک عورت دوسری عورت کے قدموں میں بیٹھتی ہے "

" گویا اس طرح!"

فاضل اُسے اپنی کشادہ آغوش میں لے کر اپنے لبہائے آتشیں سے اُس کے رخسارِ احمریں کی روح جذب کرتے ہوئے دریافت کرتا ہے:-

" اور یہ؟"

(فاضل کی آہنی گرفت سے نکلنے کی جدّوجہد میں)" اُف! تم تو زور آزمائی شروع کردیتے ہو +

فاضل اپنے بازو ڈھیلے کردیتا ہے۔ اور فابین کے نازک ہاتھ اپنے ہاتھ میں دباتے ہوئے کہتا ہے:-

" تمہاری پُرسحر اُنگلیاں سب کچھ جانتی ہیں۔ ان کی برق فشانی میرے مشاعرِ حیات کو زیر و زبر کردیتی ہے۔ اور اُن کا بار دلکش مجھ پر ایک کیف پر غنودگی طاری کردیتا ہے "

(اپنے تمثال نما مرمریں بازو فاضل کی گردن میں حمائل کرتے ہوئے)" تمہارا کشادہ شانہ کسقدر حسین اور تمہاری لمبی گردن کتنی جمیل ہے! ـــــ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ تم پر فریفتہ ہوں اور تمہاری طرح اظہار محبت کو معیوب نہیں سمجھتی " +

" کیونکہ تم فرانس کی ایک متمدّن خاتون ہو!"

" اور تم مراکش کے ایک "وحشی اعرابی" ہو!"

فاضل کمرہ سے باہر جاتا ہے اور جان دی بیھوپی داخل ہوتا ہے۔ یہ فابین کے بچپن کے دوستوں میں سے ہے۔ کبھی اس سے شادی کا بھی متمنّی تھا۔ لیکن دولت جمع کرنے کی خاطر امریکہ چلا گیا۔ اور اُس کے کالج فیلو فاضل عرب نے اُس کی آرزو کو سرخرو نہونے دیا +

فابین خندہ جبینی کے ساتھ اُس کو خوش آمدید کہتی ہے اور ایک دیرینہ رفیق کی طرح بے تکلفانہ اس سے باتوں میں مشغول ہوجاتی ہے +

"تم نے اپنی قوم اور اپنی جنس کے بیسیوں چاہنے والوں پر اس اجنبی کو کیوں ترجیح دیا۔ کیا اُن کی گرمی عشق کا درجہ اس برف سے کچھ کم تھا"۔

(معنی خیز تبسم کے ساتھ) مجھے تمہاری یا تمہارے ہم ملت احباب کی طرف سے مخلصانہ محبت کا احساس نہیں ہوا اور اس کے برعکس موسیٰ سے محبت کے نورانی چشمے اُبلتے دیکھے۔ میں پہلی بار اُس سے سان سیباستیان میں ملی تھی۔ تمہارے احباب مجھے اپنے حلقہ میں لئے ہوئے تھے۔ ان کی ہوس اور ان کی بے باک آرزوؤں سے میری جان ضیق میں پھنسی ہوئی تھی۔ مگر فاضل دور کھڑا مجھے اور میرے ہم جنس عاشقوں کو حیرت و استعجاب کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ اُس کے لب ساکت تھے۔ اُس کی زبان صامت تھی۔ مگر اُس کے اعماق قلب سے نکلنے والی صدا مجھے صاف سُنائی دے رہی تھی۔ میں نے احساس کیا کہ محبت کا دیوتا آسمان سے اُتر پڑا ہے ـــــ مجمع منتشر ہونے پر میں اُس کے منتظر آغوش کی طرف بڑھی ـــــ جنسیت و قومیت کے لایعنی قیود سے بے پروا ہو کر میں نے اُسے بوسہ دیا اور اوّلین محبت پر مُہر توثیق ثبت کر دی"۔

اس تذکار رقابت سے جان کا چہرہ علائم کرب و الم کی آماجگاہ بن گیا ہے۔ اور اُس کے لئے بیٹھنا دشوار ہو رہا ہے۔ وہ فابین سے رخصت کی اجازت لیتے ہوئے کھڑا ہو جاتا ہے۔

(بیخودانہ انداز میں اُسے پکڑتے ہوئے) "نہیں۔ یوں بددل ہو کر نہ جاؤ۔ بیٹھو!

ہم اپنے دلوں سے ماضی کا خون ٹپک جانے دیں کہ ہمارے پارینہ زخم مندمل ہو جائیں اور ہم پہلے کی طرح پھر دوست بن جائیں"۔

جان اس کے پہلو میں بیٹھ جاتا ہے۔

(بطور اظہار محبت اپنا ہاتھ جان کے ہاتھ میں دیتے ہوئے) "شام کا کھانا ہمارے ساتھ کھانا!"

جان جھک کر اُس کے ہاتھ کو بوسہ دے رہا ہے۔ عین اسی لمحہ میں فاضل اس کمرہ میں قدم رکھتا ہے اور یہ منظر دیکھ کر مبہوت رہ جاتا ہے۔ فرط غیظ سے اُس کے جسم میں آتشین سوئیاں چبھنے لگتی ہیں۔ اس کی روشن آنکھیں آتش سیال میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ مگر وہ فوراً ہی سنبھل جاتا ہے۔ غصہ کو پی کر چہرہ سے آثار غضب دور کرتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ اور مصنوعی تبسم کے ساتھ جان سے تبادلۂ سلام کرتا ہے"۔

جان فاضل سے یہ معذرت کر کے رخصت ہوتا ہے کہ "میں شام کے کپڑے بدلنے جا رہا ہوں۔ کیونکہ فابین نے شام کے کھانے کی دعوت دی ہے"۔

فابین زینہ تک اُس کی مشایعت کرتی ہے مگر فاضل اپنی جگہ پر بے حس و حرکت مبہوت سا کھڑا رہتا ہے۔ گویا اُسے دفعتہً کوئی سخت ضرب لگی ہے۔ اور اس کا دماغ ہل گیا ہے۔

(واپس آتے ہوئے) "مجھے ابتک اس کا علم نہ تھا کہ جان تمہارا کلاس فیلو ہے۔ آج اس سے یہ سُنکر بیحد مسرور ہوئی کہ آکسفورڈ میں وہ اور تم ساتھ ہی پڑھتے تھے"۔

"خوب! اگر پانچ منٹ کے بعد ٹیلیفون پر اُسے مطلع کر دو کہ وہ نہ آئے"۔

(دہشت زدہ ہو کر) "یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

(غصہ سے کانپتے ہوئے کرخت آواز میں) "یہی کہ میں اُسے دوبارہ نہیں دیکھنا چاہتا!"

"تمہیں جنون تو نہیں ہو گیا ہے؟"

"بہر حال میں اُسے دوبارہ دیکھنے کا روادار نہیں ہوں!"

فابین اس سے وجہ دریافت کرنے پر مصر ہے۔ مگر وہ کمرہ میں خاموش ٹہل رہا ہے۔ اُس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے ہیں اور چہرہ انگاروں کی طرح دہک رہا ہے۔ اپنی مٹھیاں اتنے زور سے بند کر رکھی ہیں کہ رگیں نیلے فولادی تاروں کی طرح اُبھر آئی ہیں۔ پانچ منٹ کے بعد وہ کہتا ہے:-

"بہتر۔ میں ہی قابل ملامت سہی۔ مگر مجھے یقین ہے کہ جان کبھی تم سے محبت کرتا تھا"۔

"محبت ہی نہیں بلکہ ایک زمانہ میں وہ میری پرستش کرتا تھا۔ اور اب بھی میری توجہ کا طالب ہے"۔

(منحوس آواز میں) "پانچ منٹ گزر گئے۔ اُسے کہدو کہ نہ آئے"۔

(ٹیلیفون کی طرف جاتے ہوئے) "اُسے روکنے کے بجائے فوراً آنے کو کہتی ہوں"۔

(تحکمانہ لہجہ میں) "خبردار فابین! خبردار!"

(واپس ہوتے ہوئے ترشروئی کے ساتھ) "میں تمہاری انانیت اور یہ درشت لہجہ نہیں پسند کرتی۔ اور نہ تمہاری حکومت برداشت کر سکتی ہوں۔ جیسا کہ تمہیں معلوم ہے۔ بیشک مجھے تم سے محبت ہے۔ مگر مجھے اپنی کامل آزادی بھی محبوب ہے۔ تم نے مجھ سے شادی کی درخواست نہایت شیریں اور ترنم ریز آواز میں کی تھی۔ پس میں ہمیشہ وہی آواز سننے کی آرزومند ہوں!"

مگر اب تک میں نے چند اس غیر معمولی طرز گفتگو یا سخت الفاظ تو نہیں استعمال کیے ہیں!"

"اس سے بھی بدتر! میں نے اُسے دعوت دی ہے اور تم کہہ رہے ہو کہ "میں اُسے دیکھنا نہیں چاہتا" اس سے زیادہ تلخ گفتاری اور کیا ہو سکتی ہے!"

فاضل لکڑی کے ایک مجسمہ کی طرح خاموش اور بے حس و حرکت بیٹھ جاتا ہے۔ اس کی آنکھیں سامنے فرش پر گڑی ہوئی ہیں +

فابین اُس کے مایوسانہ انداز سے متاثر ہو کر اپنے طرز عمل پر پشیمان ہوتی ہے اور محبوبانہ ادا کے ساتھ اُس کے پہلو میں بیٹھ جاتی ہے اور اُس کے رخساروں پر ہاتھ پھیرتی ہوئے کہتی ہے:-

"احمقانہ غیرت کا بُرا ہو! یہ مسرتوں کا دشمن ہے۔ میں اب کے در گزرتی ہوں۔ مگر پیارے آیندہ کم سے کم میری خاطر یہ لب و لہجہ نہ اختیار کیا کرو!"

(فابین کے ہاتھ کو بوسہ دیتے ہوئے حزیں آواز میں) "لیکن اُسے کہہ دو کہ یہاں پھر کبھی آنے کا ارادہ نہ کرے" +

(اپنا ہاتھ کھینچکر اُس کے پہلو سے جدا ہوتے ہوئے) "ہرگز نہیں! یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ تمہاری بیجا ضد کی وجہ سے اُس کے احسانات فراموش کر دوں +

سان سیباستیان میں جو فاضل مجھ سے ملا تھا میں اُسے چاہتی ہوں۔ مگر تم جیسی شاید رائے رکھنے والے فاضل کو نہیں چاہتی۔ اس سے وعدہ کرو کہ آیندہ تم ایسی تشدد اور بیجا ضد کے مظاہرہ سے اجتناب کرو گے!"

(بیمار بچے کی طرح مغموم مگر معنی دار تبسم کے ساتھ) اب مجھ سے کسی وعدہ کی بابت کچھ نہ کہو" +

فاضل یہاں سے اُٹھ کر دوسرے کمرہ میں چلا جاتا ہے +

خادمہ فابین کو اطلاع دیتی ہے کہ "مسیو جاک دی بریز اور اُسکی بیوی ہیلن ملاقات کے منتظر ہیں" +

جاک "ریس" کے شائقین میں سے ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اُسے ریس کا خبط ہے اور کسی دوسری جہت توجہ منعطف کرنے کا اُسے کبھی احساس نہیں ہوتا وہ فلسفیانہ غور و فکر یا فاضل عرب کی طرح مقتضیات غیرت سے اپنی یا ہیلن کی خوش عیشیوں کو تلخ نہیں کرتا +

ہیلن جاک سے بھی زیادہ آزاد ہے۔ وہ اپنی مسرور زندگی کی تعبیر خود یوں کرتی ہے کہ "جاک دن بھر ریس کے چکر میں رہتا ہے اور میں بلا استثنا جو چاہتی ہوں کرتی ہوں۔ تفریح گاہوں کی سیر۔ احباب کی ملاقات۔ جلسوں کی شرکت اور کبھی دن دن بھر رقص۔ غرضیکہ مجھے نظام اوقات اور اپنی مصروفیتوں میں کامل آزادی حاصل ہے"۔ اور وہ اپنی ان رنگین مصروفیتوں کو اپنے فضل و کمال پر محمول کرتی ہے۔ د جنبک جب عورت گھر کے کام دھندے سے فاضل ہو تو اس نوعیت کے مشاغل اُس کے فضل و کمال کی علامت ہوتے ہیں!

فابین دونوں سے فاضل کی احمقانہ غیرت اور تلخ گفتاری کا شکوہ کرتی ہے۔ ہیلن ذمہ لیتی ہے کہ "میں فاضل کو راضی کر دونگی اور اُسے سمجھا دونگی کہ آیندہ اس قسم کی خفیف الحرکتی کا ارتکاب نہ کرے" جاک بھی اُس کی تائید کرتا ہے۔ لیکن فابین کو یہ مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ اپنے خانگی معاملات کی رودبراہی کے لئے کسی ثالث کی امداد لے۔ مگر ہیلن اس میں کوئی ہرج نہیں سمجھتی اور فاضل سے ملنے پر اصرار کرتی ہے +

فابین کپڑے بدل کر باہر چلی جاتی ہے اور ہیلن اور جاک فاضل کے کمرہ میں داخل ہوتے ہیں +

ہیلن نہایت سہولت سے فاضل کو اس طرز عمل کے نتائج و عواقب سے مطلع کرتی ہے +

"میں نے اور فابین نے نیویارک کے آزاد ماحول میں پرورش پائی ہے جہاں مرد عورتوں کا احترام اور بلا چون و چرا اُن کی اطاعت کرتے ہیں" +

جاک اپنی بہن کی مثال پیش کرتا ہے:-

"اُس کے احباب کا حلقہ بیحد وسیع ہے۔ وہ اُن سے آزادانہ ملتی ہے۔ بلکہ تفریح کی خاطر بسا اوقات اکس چلی جاتی ہے۔ اُس کا شوہر اپنی کاروباری مصروفیت کی وجہ سے اس کے ساتھ نہیں جا سکتا۔ مگر وہ تمہاری طرح احمقانہ غیرت کے زیر اثر اپنے یا اُس کے پُر کیف لمحات کو تلخناک نہیں کرتا۔ اُسے معلوم ہے کہ عورت کی کامل آزادی مبادی تہذیب میں داخل ہے۔ علاوہ ازیں اسے اس حقیقت کا بھی علم ہے کہ میری کم سن بہن باایں ہمہ آزادی ایک مہذب خاتون کی طرح اپنی عصمت کو اپنی عزیز ترین دولت تصور کرتی ہے۔ تم فابین پر جو قیود عائد کرنا چاہتے ہو اگر وہ ان میں مقید ہو جائے اور اپنے دیرینہ احباب سے مراسم قطع کر لے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اُس نے اپنی آبائی تہذیب کا قصر منہدم کر دیا۔ میرے عزیز دوست! تم ہی انصاف کرو کہ وہ اس کے لئے کیونکر تیار ہو سکتی ہے۔ اور تمہاری خاطر اپنی فطرت کو کس طرح بدل سکتی ہے؟"

"اگر یہی معیار ہے تو بتاؤ میں اپنی فطرت بدل دینے پر کیونکر قدرت حاصل کر سکتا ہوں؟" (جواب کا انتظار کئے بغیر گلوگیر آواز سے) میں جا رہا ہوں۔ تمہارے "نورانی شہر" سے رخصت ہو رہا ہوں۔ تمہاری تہذیب اور مدنیت کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہتا ہوں۔ فاتین سے کہدینا کہ اب وہ آزاد ہے۔ اور جو چاہے کر سکتی ہے!"

ہیلن اُسے اس ناعاقبت اندیشانہ اقدام سے باز رکھنے کی کوشش کرتی ہے *

"یہ تم کیا کر رہے ہو؟ تمہارے لئے عیش و عشرت کے تمام سامان مہیا ہیں..... "

(بات کاٹ کر) "لیکن یہاں نہیں!"

ہیلن کی التجاؤں کے باوجود فاضل کمرہ سے نکل جاتا ہے۔ جاک کو فرطِ حیرت سے یقین نہیں آتا کہ وہ واقعی ہمیشہ کے لئے چلا گیا۔ لیکن ہیلن کو کامل یقین ہوگیا کہ اب وہ واپس نہیں آئے گا *

کمرہ میں فاتین داخل ہوتی ہے اور پہلی ہی نظر میں فاضل کو نہ پاکر مشکوک سی ہو جاتی ہے۔ فاضل کے آخری زہرناک تبسم کی یاد اور ہیلن اور جاک کا ماتمی سکوت اُس کے خیال کی تصدیق کرتے ہیں۔ وہ زار و قطار رونے لگتی ہے۔ گویا اُس کا بچہ فوت ہوگیا ہے۔ وہ مجنونانہ کمرہ کا طواف اور بدحواسی کے عالم میں فاضل کو پکار کر نوحہ کر رہی ہے *

اسی دوران میں خادمہ کاؤنٹ جان دی بیوپی کے آنے کی اطلاع دیتی ہے!

(۲)

فاضل اپنے آبائی وطن فاس میں پہنچ گیا۔ اور فراک کے بدلے اُس نے اپنا قومی لباس شال اور سروال اختیار کر لیا۔ وہ اپنے اجداد کے عالی شان قصر میں سکونت پذیر ہے جو مغربی عربوں کے بیس قبائل کے سردار تھے۔ وہ قدیم مشرقی اعزاز اور حشم و خدم کے ساتھ اپنی پری تمثال کنیزوں کے جھرمٹ میں مشرقی ریاست کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ وہ جب شکوہ کرتی ہیں کہ اُس نے یورپ کی رنگینیوں میں اُنہیں بالکل فراموش کر دیا تھا۔ اور جب ان میں سے کوئی شوخ کنیز اس کی گردن میں اپنی باہیں حمائل کر کے اُس کے سینہ سے چمٹنا چاہتی ہے۔ تو فاضل کا خون منجمد ہونے لگتا ہے۔ اور وہ ایک مرمریں مجسمہ کی طرح اُن کی گرمجوشی کا کوئی جواب نہیں دیتا *

حاجی اسمٰعیل فاضل سے ملنے آتا۔ یہ فاس کے معزز ترین شیوخ میں سے ہے اور فرانس سے موالات کرنے والے مراکشی رہنماؤں میں خاص وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ وہ فاضل سے فاس اور مراکش کے اہم واقعات بیان کرتا ہے جو اُس کی غیبوبت میں رونما ہوئے *

"ہم تمہارے قصر کی طرف سے گزرتے تھے تو اسے خالی پاکر دل پر چوٹ سی لگتی تھی" *

"مگر ہمارا قصر ہمیشہ خدم، حشم اور فوج سے بھرا رہتا تھا" *

"اس سے کیا ہوتا ہے۔ صاحبِ قصر موجود نہ ہو تو قصر سنسان نظر آتا ہے"

"کیا کہوں یورپ کے سراب آسا تمدن کی جھلکیوں نے مجھے غلط فہمی میں مبتلا کر دیا تھا۔ بچپن اور جوانی کے عزیز ترین بیس سال میں نے ان کی ظاہرداری اور تصنع کی لاحاصل تقلید میں ضایع کر دیئے۔ پھر بھی خدا کا شکر ہے کہ جلد ہی رستگاری نصیب ہوئی۔ اب اپنے اسلاف کی طرح اپنی فطری بدویت کی طرف عود کر آیا ہوں جو نخلستان کے سکون ریز سایہ میں بستے تھے۔ صحرا کی لطافت پاش نسیم میں سانس لیتے تھے اور یورپ کی نزاکت مآب تفریحوں اور مخنثانہ رقص کے بجائے میدانِ سباق میں شہسواری کے جوہر دکھاتے اور کارزارِ موت و حیات میں تلوار سے کھیلتے تھے۔ مجھے اب یقین ہوگیا ہے کہ جو شخص صحرائے بسیط میں کبھی آزادانہ سانس لے چکا ہے اُسے یورپ کی ہنگامہ خیزیاں اس آزاد ماحول کی قدرتی رعنائیوں کی طرف رجوع کرنے سے باز نہیں رکھ سکتیں۔ یہ صحیح ہے کہ انسان مدنی الطبع ہے مگر مدنیت کا جو مفہوم اُنہوں نے سمجھا ہے ممکن ہے کسی لحاظ سے صحیح ہو لیکن میرا خیال ہے کہ "زہرہ خواہ کتنی ہی بلند ہو جائے ایک دن اُس کا سقوط اور اپنے ابتدائی عنصر کی طرف رجوع مقدر ہو چکا ہے۔ جیسا کہ وہ کہتے ہیں اُن کے "مدینۃ النور" کو میں نے خیرباد کہا۔ ان کے ملبوسات ترک کر دیئے اور اب موٹروں اور انگریزی گھوڑوں کے بدلے اصیل عربی گھوڑوں پر سوار ہونے لگا ہوں" *

(بزرگانہ شفقت آمیز تبسم کے ساتھ) "فرنگی تیتری کے ضعیف بازو کی ایک ہی ضرب نے تمہاری دنیا بدل دی" *

"چچا جان! اس کا تذکرہ نہ کرو۔ میں نے اُسے قطعاً فراموش کر دیا ہے۔ اور اُس کی تکلیف دِہ یاد اپنے دل سے نکال چکا ہوں" *

"تمہارا عزم قابلِ تحسین ہے۔ بیشک "جس کی آنکھیں ماہتاب سے روشن ہوں وہ تاروں کی دھندلی روشنی پر فریفتہ نہیں ہو سکتا۔ اور "عزم صمیم" ایک ایسا عصا ہے کہ اس کے سہارے ایک نابینا بھی منزلِ مقصود تک رسائی حاصل کر سکتا ہے"

(فاضل اپنے عزم و استقلال پر نازاں ہے۔ وہ فخر کر رہا ہے کہ اُس نے ایک قصیر لمحہ میں محبت۔ عورت اور یورپ کی پست سالہ معاشرت کے تمام قیود سے آزادی حاصل کر لی۔ اُسے کیا خبر کہ جس عورت نے اُسے منتخب کیا یا جسے اُس نے "اپنی بیوی" بنایا تھا اُس نے کیا فیصلہ کیا ہے۔ فاضل کو کون بتائے کہ مقتضیات محبت نے نازوں کی پلی فابین کو جہاں گردی اور صحرانوردی پر آمادہ کر دیا ہے)

فابین ارباب اکتشاف کی طرح بے آب و گیاہ ریگستان قطع کرتی ہوئی دفعتہً فاضل کے ہاں پہنچتی ہے۔ اُس کی رفیقہ ہیلن اور جاک بھی اُس کے ہمراہ ہیں پیرس کی رنگینیوں اور رقص و سرود سے نکل کر یوں صحرانوردی ظاہر ہے کہ داعیات محبت نے اُس کے غرور نسائیت کو پامال کر دیا ہے۔ مگر فاضل یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہے کہ اُس نے محض اس کی خاطر یہ مصائب برداشت کئے ہیں۔ وہ فابین سے تمسخر اور استہزا کے ساتھ پیش آتا ہے۔

"تم آج ہی واپس چلے جاؤ۔ کیونکہ جس کی تمہیں جستجو ہے۔ وہ فوت ہو چکا ہے۔ میں نے اس فاضل کو جسے تم چاہتی تھیں پیرس سے روانہ ہوتے وقت وہیں قتل کر دیا تھا۔"

"مگر بسا اوقات مقتول کی روح قاتل کے جسم میں حلول کر کے اس پر سیادت حاصل کر لیتی ہے۔ چنانچہ تمہارے قتل کر دینے کے باوجود میں فاضل کو اپنے روبرو زندہ دیکھ رہی ہوں۔ اس لئے عدل اور رحم کی ملتجی ہوں۔ فاضل! تمہاری محبت پر مجھے فخر تھا۔ تمہارا فرحت بخش آغوش ہمیشہ میرے لئے وا رہتا تھا۔ لیکن اس وقت تم حقائق سے انکار کر رہے ہو ——— فاضل دو ماہ سے تمہاری بیوی کے آنسو خشک نہیں ہوئے۔ اب وہ تمہارے حضور میں یہ توقع لے کر آئی ہے کہ تم اُس کے سیلاب گریہ کو روک دو گے!"

"کیا کہا میری بیوی؟"

(نخوت و خودداری کو بالائے طاق رکھ کر) "ہاں تمہاری بیوی تمہارے سامنے حاضر ہے۔"

وہ فاضل کے سینے سے چمٹ جاتی ہے۔

(اس سے خلاصی حاصل کرنے کی جد و جہد میں) "یا الٰہی خیر!"

"خدا خیر ہی کرے گا۔ مگر عشاق کی زندگی تیا دلۂ محبت میں مضمر ہے نہ کہ کبر و نخوت میں۔ یاد کرو تم نے میری محبت کا جواب کس گرمجوشی سے دیا تھا۔ اور غور کرو کہ اب تم میرے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہو۔ بیجا خودداری نے ہمیں بظاہر ایک دوسرے سے جدا کر دیا۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ ہم دونوں جدا نہیں ہو سکتے۔ ہمارے درمیان سات سمندر حائل ہو جائیں۔ جب بھی ہمارا افتراق محال ہے۔ جنسیت اور قومیت کی ناقابل عبور خندق ہمارے درمیان حائل ہو گئی پھر بھی ہم علیحدہ نہ ہو سکے۔ کیا تمہیں اس حقیقت کا احساس نہیں ہو رہا ہے کہ ہم میں سے ہر ایک دوسرے کا اسیر ہے۔ میرے عزیز وحشی! تم مجھ سے اظہار نفرت کر رہے ہو۔ مگر کیا تمہاری روح میری منتظر نہیں تھی؟"

"ہرگز نہیں۔ دنیا میں اب وہ فاضل موجود ہی نہیں جو تمہارا انتظار کرے۔"

"میں تمہاری بیوی ہوں۔ تمہاری رفیق زندگی ہوں۔ پھر یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ میرے بغیر تمہیں روحانی طمانیت حاصل ہو (گلوگیر آواز اور عصبی تبسم کے ساتھ) "آج کی شب تم کس خوش نصیب کنیز کے حصہ میں ہو؟"

(بے پروائی سے) "جس کی باری ہو!"

"کیا یہ ہو سکتا ہے آج میں اُس کی قائم مقام بنوں اور صبح تم سے رخصت ہو جاؤں۔"

(جبراً قہراً) "بہتر!"

ہیلن مسکراتی ہوئی داخل ہوتی ہے (کیونکہ وہ خلاف توقع دونوں کو اب تک زندہ دیکھ رہی ہے) فابین اسے مطلع کرتی ہے کہ "آج کی شب فاضل کے ساتھ بسر کروں گی اور صبح یہاں سے رخصت ہو جاؤں گی۔"

ہیلن اس تجویز کو نسوانی وقار پر ایک مہلک ضرب تصور کرتی ہے۔ اس کے چہرہ پر علائم نفرت ظاہر ہوتے ہیں۔ اور فابین کو فوراً کوچ کرنے کا مشورہ دیتی ہے۔

(دہشت زدہ اور متحیر ہو کر) "کیا مجھے اپنے شوہر کے ساتھ ایک شب بسر کرنے کا بھی حق نہیں ہے؟"

ہیلن فاضل سے دریافت کرتی ہے:-

"کیا یہ تمہاری قرار داد ہے؟"

"نہیں!"

فابین فاضل کو مخاطب کر کے کہتی ہے:-

"اس علم کے بعد بھی کہ میں پہلے ہی کی طرح تمہاری گرویدہ ہوں۔ کیا میری ایک معمولی سی آرزو کو یوں ٹھکرا دینا تمہیں غیر مناسب نہیں معلوم ہوتا؟"

"میں نے تو کہہ دیا کہ تمہیں چاہنے والا فاضل اب اس دنیا میں موجود نہیں ہے۔"

فاضل کا یہ خشک جواب ہیلن کی مزید ناگواری کا باعث ہوتی ہے اور وہ برافروختہ ہو کر فابین کو یہاں ٹھہرنے پر ملامت کرتی ہے۔ گر فابین کو شب یہیں بسر

کرنے پر اصرار ہے۔ وہ فاضل سے کہتی ہے:۔

"خدارا تمہیں فیصلہ کرو!"

"تمہارا فیصلہ بُرا نہیں ہے!"

(فرطِ مسرت سے اُچھلکر) لو آخر تم نے اقرار کر لیا کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے۔ اب اگر کل صبح تم مجھ سے عفو کے خواستگار نہ ہوئے تو میں سمجھونگی کہ میری سعی مشکور نہ ہوئی اور میری صحرانوردی رائگاں گئی +

ہیلن کمرہ سے نکل جاتی ہے۔ فاضل اُس مسرت اور طمانیت کو چھپانے سے قاصر ہے جو اُسے ہیلن کے چلے جانے سے حاصل ہوئی ہے +

"کیا واقعی تمہیں صرف مجھ سے محبت ہے۔ اور کیا مجھ سے وابستگی تم اپنی انتہائی سعادت اور کامرانی تصوّر کرتی ہو؟"

"کیا ابھی تمہیں اس میں شبہ ہے۔ اور کیا میری یہ آبلہ پائی اس کے ثبوت کے لئے کافی نہیں ہے؟ (متبسمانہ تبسم کے ساتھ) کل صبح جب میں تم سے رخصت ہونگی تو کیا تمہیں افسوس نہ ہوگا؟"

"نہیں!"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ اب تم نہیں جاؤ گی اور میرے ہی پاس رہو گی!"

فاتین ہیلن کو پکارتی ہے +

"نہیں اُسے اپنے معاملات میں دخل اندازی کا موقع نہ دو ـــــ تم میرے پاس آئیں جبکہ میں تمہیں فراموش کر چکا تھا۔ تم نے میرے عزم و استقلال کے خلاف میرے قلب پر دوبارہ فتح حاصل کرنے کی کوشش کی۔ میں تمہیں مبارکباد دیتا ہوں کہ اپنی سعی میں کامیاب ہوئیں۔ میں نے ابتک تم سے نہیں کہا تھا کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ مگر اب سُن لو کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ میں تمہیں چاہتا ہوں۔ اور اب تم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے یہیں رہو گی!"

فاتین اپنی اس حد تک غیر متوقع کامرانی پر بیخود ہو کر فاضل کے آغوش میں گر جاتی ہے۔ اور بچّوں کی طرح بلک کر رونے لگتی ہے +

(۳)

فاتین کو فاضل کے قصر میں رہتے تین ماہ ہو گئے۔ وہ فاضل کی محبت اور گرمجوشی سے متمتع ہو رہی ہے۔ لیکن یہ احساس اُس کی مسرت و طمانیت کو فنا کر رہا ہے کہ وہ گویا ایک قیدی ہے جسے قصر سے باہر کی ہوا میں سانس لینے کی اجازت نہیں (کیا وہ معذور نہیں ہے؟ ـــــ کیوں نہیں! محبت اگرچہ قوت شعور پر حکومت کرتی ہے۔ مگر نفس انسانی اپنے عناصر اور اپنی فطرت کے لحاظ سے ہمیشہ آزادی کی رفعتوں کی طرف پرواز کرتا ہے) اسی دوران میں فاتین کو خبر ملتی ہے کہ فاضل کسی ہمسایہ قبیلہ میں نئی شادی کرنے والا ہے۔ یہ اطلاع اُس کے احساس اسیری کے لئے تازیانہ ثابت ہوتی ہے۔ اور وہ فاضل سے طلاق طلب کرتی ہے (گو ایک مشرقی زن کسی عورت کو اپنے حرم میں داخل کرنے کے بعد یہ عار کیونکر گوارا کر سکتا ہے کہ وہ پھر کسی دوسرے کے پہلو کی زینت بنے) فاضل کے انکار پر وہ قاضیٔ فاس کی عدالت میں خلع کی درخواست پیش کرتی ہے۔ نیز فاضل سے رستگاری کی خاطر خفیہ ریشہ دوانیاں بھی شروع کر دیتی ہے۔ فاضل کی ایک کنیز مریم جسے فاتین نے اپنا ہمراز بنا لیا ہے۔ اس سازش میں اُس کی دست راست ہے۔ اس کے رفقا جان۔ جاک اور ہیلن بھی جو ابتک مراکش میں مقیم ہیں اس سلسلہ میں اُس کی امداد کرتے ہیں +

ایک دن تینوں فاضل سے ملنے آتے ہیں۔ ہیلن محلسرا میں داخل ہو جاتی ہے اور جان اور جاک فاضل سے گفتگو میں مشغول ہیں +

فاضل سے ان کا مطالبہ ہے کہ "فاتین کو آزاد کر دو" +

فاضل اُن کے مطالبہ کو غیر شریفانہ اور بیہودہ قرار دیتا ہے +

"کیا میں تمہاری خاطر اپنی بیوی سے دستبردار ہو جاؤں۔ تا اللہ! شاید یورپ میں بھی بااینہمہ آزادی کسی نے کسی سے اس قسم کا بیہودہ مطالبہ نہ کیا ہوگا! میرے ہاں آتے ہو تو تمہاری خاطر تواضع کیا میں اسی لئے کرتا ہوں کہ مجھے تمہارا یہ غیر شریفانہ مطالبہ سننا پڑے۔ کیا تمہاری تہذیب کے بلند بانگ دعوے ایسی ہی رذیلانہ باتوں پر مبنی ہیں"+

جان فاضل سے التجا ہے کہ "معاندانہ طرز گفتگو سے اجتناب ہی بہتر ہے۔ اور فاتین کو اُس کی مرضی کے خلاف اپنے قصر میں بند رکھ کر تمہیں کسی فلاح کی اُمید نہیں رکھنی چاہئے"+

"دنیا کی کوئی طاقت یا کوئی قانون مجھے طلاق دینے پر مجبور نہیں کر سکتا"+

"مگر ہم سیاسی یا قانونی پہلو سے گفتگو نہیں کر رہے ہیں۔ بلکہ ایک شریف آدمی کے سامنے ایک عاجزانہ درخواست پیش کر رہے ہیں"+

"میں نے اُسے ہمیشہ کے لئے فراموش کر دیا تھا۔ مگر تم ہی اُسے میرے پاس لائے اور اُس نے خود میرے حرم میں داخل ہونے پر اصرار کیا۔ اور ہمارے حرم میں داخل ہونے کے بعد کسی عورت کا دوسرے کے پہلو کی زینت بننا ہمارے اسلاف کی روایاتِ شرف و افتخار کے منافی ہے۔ اس لئے اب اس کے آخری

سافس تک اس کے لئے ہمارے قصر کا دروازہ نہیں کھولا جاسکتا ــــــــ میں ایک مدت تک تمہارے اور تمہاری عورتوں کے معاملات پر غور کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ محبت تمہارے نزدیک نام ہے مردانہ غیرت و حمایت کے استخفاف کا۔ اور عشق گویا تمہاری ایک ذہنی بیماری ہے۔ جس میں موقعہ بے موقعہ بُحران و ہیجان ہوتا رہتا ہے۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ تمہارے جرائد۔ تمہارے اسٹیج اور تمہاری عدالتیں سدا تمہارے فاسد اخلاق اور تمہاری شہوت پرستی کی شرمناک داستانوں سے گونجتی رہتی ہیں؟ ــــ محض یہی کہ تم مردوں کے مقابلہ میں مرد بنتے ہو۔ مگر اپنی عورتوں کے مقابلہ میں نرے مخنّث ہو جاتے ہو۔"

"بہرحال ہم تمہاری قتیل کو تمہاری قید میں چھوڑنا بخوشی گوارا نہیں کر سکتو"

(غصّہ سے دانت پیس کر) تو کیا تمہارا خیال ہے کہ میرے قصر سے جس سے میرے غیور اجداد کی شاندار روایات وابستہ ہیں، نکل کر وہ بخیر و عافیت تم تک پہنچ سکتی ہے؟"

"کم سے کم ہماری تمنا تو یہی ہے!"

(زہرخندہ کے ساتھ) اس خیالِ خام کو دماغ سے نکال دو۔ وہ تمہاری ہی عورتیں ہیں کہ شاہراہ عام پر اپنے حسن اور اپنی زینت کی نمائش کرتی پھرتی ہیں۔ اور ان میں سے طاہرہ فاسقہ سے پہلے تمہارے بدکار نوجوانوں کے تعلّق کا شکار ہوتی ہے۔ حد ہو گئی ہے تمہاری بے غیرتی کی کہ تم پیرس میں ہوتے ہو اور تمہاری بیویاں اکس اور سان سیباستیان میں اپنے عاشقوں کے ساتھ دادِ عیش دے رہی ہوتی ہیں!"

"ہمیں اعتراف ہے کہ رفعتِ اخلاق کے لئے جذبۂ غیرت کی فراوانی لازمی ہے۔ مگر اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جب یہی شریفانہ جذبہ کسی کی ہلاکت کا باعث ہونے لگے تو اس کے محاسن سے قطع نظر کرکے اس کی اہمیت کو کم کر دینا ہی بہتر ہے"+

"ہرگز نہیں! جو چیز بذاتہٖ محمود ہو وہ عوارض کی وجہ سے مذموم نہیں ہو سکتی اور غیرت! "جس میں غیرت نہیں وہ انسان نہیں جانور ہے!" ــــ تم نے بے غیرتی کا نام "تہذیب" رکھ لیا ہے۔ اور ہوس رانی کا "محبت"۔ تمہاری عورتوں کی محبوبیت اور تمہاری محبت ریاکاری، نفس پرستی اور بے غیرتی کا مجموعہ ہوتی ہے ــــ میں ان کوچہ گرد عورتوں کا مطلب سمجھنے سے قاصر ہوں جن کے شوہروں کو پتہ نہیں ہوتا کہ دن کو ان سے ملنا چاہیں تو کہاں مل سکتے ہیں۔ میں ان مردوں کے برودتِ قلب کا بھی اندازہ نہیں کر سکتا جن کی بیویاں اغیار کے آغوش میں آزادانہ رقص کرتی ہیں۔ تمہاری ذہنیت۔ تمہاری محبت۔ تمہارے جذبات۔ تمہارا فلسفۂ ازدواج غرضیکہ تمہاری ہر چیز میرے لئے ایک لاینحل معمہ ہے"+

غضبناک اعرابی، جس کی بدوی فطرت کو نہ آکسفورڈ کی تعلیم بدل سکی۔ نہ چوتھائی صدی کی یورپی معاشرت۔ جان اور جاک کی خواہش کو نفرت و حقارت سے ٹھکرا دیتا ہے۔ وہ دونوں مایوس ہو کر ہوٹل کو واپس ہو جاتے ہیں+

محلسرا میں ہیلن اور مریم فاہن کو مشورہ دے رہی ہیں کہ آج ہی شب کو فاضل کے سنہری قفس سے نکل بھاگو!"

"میں نے قاضی کے پاس خلع کے لئے درخواست بھیجی ہے۔ اگر اس کا فیصلہ میرے حق میں ہوا تو فبہا ورنہ مریم شب کو قصر پر سرخ روشنی بلند کرے تو تم فوراً ہماری امداد کو پہنچنا"+

ہیلن جاتی ہے۔ اور حاجی اسمٰعیل داخل ہوتا ہے+

"قاضی نے تمہاری درخواست رد کر دی۔ کیونکہ اس کے نزدیک خلع کی کوئی علّت شرعی موجود نہیں ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے فاضل کے دامنِ شرافت کو داغدار نہیں ہونے دیا۔ ورنہ خدانخواستہ تمہارے حق میں فیصلہ ہوتا تو اسے اپنی ہونے والی شریف النسب بیوی کے قبیلہ کے مقابلہ میں بیحد رسوا ہونا پڑتا۔ تم متحیّر کیوں ہو رہی ہو؟ کیا تمہیں خبر نہیں ہے کہ فاضل کے حرم میں عنقریب مراکش کے ایک غنی اور شریف ترین قبیلہ کی دوشیزہ داخل ہونے والی ہے۔ خدا کی قسم "امتہ اللہ" (دوشیزہ کا نام) ایک درِّ یتیم ہے جس کی نظیر آج تک آفتاب نے بھی نہیں دیکھی ہوگی"+

فرطِ غضب اور شدّتِ الم سے فاہن پر ایک ارتعاشی کیفیت طاری ہے۔ حاجی اسمٰعیل اسے تسلّی دیتا ہے+

"تمہارے اضطراب و ارتعاش کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ فاضل خواہ کتنی ہی شادیاں کرے وہ تمہارے حقوق نظرانداز نہیں کر سکتا۔ تم اس کی پہلی بیوی ہو۔ اس لئے تمہارا رتبہ بہرحال سب سے برتر ہوگا"+

حاجی اسمٰعیل چلا جاتا ہے۔ فاہن صورتِ حال پر غور کر رہی ہے۔ حتیٰ کہ شام ہو جاتی ہے۔ اور ساری کائنات ایک ظلمتکدہ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ فاضل اس کے کمرہ میں داخل ہوتا ہے۔ اور جان اور جاک کی غیر شریفانہ جرأت اور ان کے رذیلانہ مطالبات کا واقعہ بیان کرتا ہے۔ اور فاہن کو یقین دلاتا ہے کہ "میں اپنا اقتدار قایم رکھنے اور قبائل کی دوستی حاصل کرنے کی خاطر متعدد شادیاں کرنے پر مجبور ہوں۔ لیکن اس کی وجہ سے ہماری دیرینہ محبت میں کوئی فرق نہیں آئیگا۔ نہیں

میری پہلی بیوی ہونے کا شرف حاصل ہے۔ تمہارا یہ شرف ہرگز نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اور میری نئی بیوی کا تمہارے حقوق پر کوئی اثر نہیں ہو سکتا"۔

"میں نے اپنا حسن و جمال، اپنی محبت اور اپنی زندگی سب تمہارے لئے وقف کر دی۔ اپنی قوم، اپنے اعزّہ اور اپنے رشکِ ارم شہر کی ساری دلچسپیوں کو محض تمہاری خاطر خیرباد کہا۔ تم ایک بیجا ضد کی وجہ سے مجھے تنہا چھوڑ کر چلے آئے۔ تم نے مجھے فراموش کر دیا۔ پھر بھی میں تمہیں نہیں بھولی۔ تپتے ہوئے ریگستان جان پر کھیل کر عبور کئے اور تم سے آ ملی۔ تمہاری خاطر میں نے اپنی آزادی قربان کر دی۔ اور جانوروں کی طرح پنجرے میں بند ہو کر رہنا قبول کر لیا مگر تمہاری طرف سے میری ان تمام قربانیوں اور سارے ایثار کا یہ صلہ مل رہا ہے کہ اب تمہاری نظرِ التفات دوسروں کی طرف منعطف ہو رہی ہے۔ اور میری غیر معمولی جاں نثاریوں کے باوجود اب تم کسی اور کو بیاہ لانے والے ہو۔ میں سب کچھ گوارا کر سکتی ہوں لیکن مجھ میں یہ مصیبت برداشت کرنے کی طاقت نہیں ہے۔ کہ تمہاری محبت سے متمتع ہونے میں میری کوئی شریک ہو"۔

"افسوس ہے کہ اس رشتہ کے متعلق تمہارے آنے سے پہلے ہی بات پکّی ہو چکی ہے۔ اور وعدہ کر کے مکر جانا ایک غیور عرب کی کرامت و شہامت کے منافی ہے"۔

"تو کیا محض اتنی سی بات کی خاطر تم مجھے زندہ درگور کر دینا چاہتے ہو؟"

"یہ معمولی بات نہیں ہے۔ تم ہمارے قبائلی روایات سے بے خبر ہو۔ اس لئے تم اس کا اندازہ نہیں کر سکتیں کہ خطبہ کے بعد شادی سے انکار میری کسقدر رسوائی کا باعث ہوگا۔ اور میرے قبیلہ کو خواہ مخواہ کتنے قبائل کی دشمنی مول لینی پڑیگی!"

فابین فاضل کی طرف سے ناامید ہو کر کمرہ سے باہر جاتی ہے اور مریم کو سُرخ روشنی بلند کرنے کی ہدایت کر کے واپس آتی ہے۔

اب جدائی میں صرف چند لمحے باقی ہیں۔ وہ فاضل کے سینہ سے چمٹ جاتی ہے اور اُسے آخری بوسہ دیتے ہوئے سان سیباستیان کی صحبتیں۔ وصال کی پہلی رات اور بیرس کی خوش عیشیاں یاد دلاتی ہے ——

خوفناک تاریکی میں فاضل کے دیونما قصر پر سرخ روشنی بلند ہوتی ہے۔ گویا شیطان جاک اور جان کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا ہے۔ جو قریب ہی اُس کے اشارہ کے منتظر کھڑے ہیں۔

مریم قلعہ کا جو دروازہ کھولتی ہے۔ وہ دونوں اندر داخل ہوتے ہیں۔ اور فابین کو خبردار کرنے کے لئے طپنچہ سر کرتے ہیں۔

فابین دفعتاً فاضل کے پہلو سے اُٹھ بیٹھتی ہے اور پکارتی ہوئی دروازہ کی طرف بڑھتی ہے "آؤ! آؤ! مجھے عورتوں کے اس دشمن سے نجات دلاؤ آؤ مجھے اس چار بیویوں کے شیدائی کی قید سے چھڑاؤ!"

صورتِ حال سے واقف ہو کر فاضل اپنے خادم کو آواز دیتا ہے۔ وہ داخل ہوتا ہے۔ مگر معاً جان کا خنجر اُس کے پہلو میں پیوست ہو جاتا ہے۔

غضب اور محبت کے متضاد جذبات سے لبریز ہر اندام فابین کی آواز میں نمایاں ارتعاش پیدا ہو گیا ہے۔

"رخصت! یورپ کو جہاں میرے لئے کوئی ایسا رفیقِ حیات ہوگا جو صرف میرے ہی لئے ہوگا"۔

فاضل اپنے خادم کی امداد کے لئے دروازہ کی طرف بڑھتا ہے۔ مگر جان کا خنجر اُس کا بھی استقبال کرتا ہے۔ اور وہ ایک دردناک چیخ کے ساتھ گر جاتا ہے۔

"ارے شقی تو نے یہ کیا کیا؟ آہ اسے بھی قتل کر ڈالا! فاضل! فاضل! مظلوم فاضل!"

فابین نوحہ کرتی ہوئی فاضل کے تڑپتے ہوئے جسم سے چمٹ جاتی ہے۔ لیکن جان اور جاک اس کو علی الرغم اسے اُٹھا لے جاتے ہیں۔

(۴)

فابین پیرس سے دور ایک قصبہ میں جان کے مکان پر مقیم ہے۔ فاس سے آنے کے بعد اُس کے غم و اندوہ میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ جان ہمیشہ اس فکر میں رہتا ہے کہ اس کے دل سے کسی طرح فاضل کا خیال نکل جائے۔ لیکن کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی۔ اور فابین کے دل کا بوجھ کسی طرح ہلکا نہیں ہوتا۔

مریم جو فاس سے فابین کے ہمراہ چلی آئی ہے۔ اُس کے پاس بیٹھی ہے اور اس سے سوگواری کا سبب دریافت کر رہی ہے۔

"کیا اب تک تم اُسے نہیں بھولیں اور اُس کے دشت کدہ سے رہائی پر تمہیں ابتک صدمہ ہو رہا ہے۔ کیا تم اُس قید کو اس آزادی پر ترجیح دیتی ہو؟"

"پیاری مریم! میں وہاں مقید نہ تھی۔ بیشک میری مسرتیں قصر تک محدود تھیں لیکن میری روح آزاد تھی۔ اب میں بظاہر آزاد ہوں۔ مگر درحقیقت میری روح یہیں پھانس پڑ گئی ہے۔ وہاں میں اُس کی محبت اور اُس کی مخلصانہ گرمجوشیوں سے فیضیاب ہو رہی تھی۔ اُس نے مجھے اپنے ذی شان قصر اور اپنے کاشانہ دل کی ذی حشمت ملکہ کا رتبہ دے رکھا تھا۔ مگر آہ میرے ناعاقبت اندیشانہ اقدام نے میری

مسرتوں کی کائنات کو ہمیشہ کے لئے پائمال کر دیا۔ مریم! وہ ایک غیرتمند محبوب تھا مجھے اس پر فخر کرنا چاہئے تھا۔ لیکن وائے قسمت! میں نے اپنے ہاتھوں اپنی سعادت و طمانیت کو ذبح کر ڈالا!"

"نہیں نہیں اُسے تم نے قتل نہیں کیا۔ وہ آپ اپنی ہلاکت کا باعث بنا۔ اُس نے کم سے کم تمہارے مقابلہ میں یورپ کے کسی مہذب نوجوان کا طرزِ عمل کیوں نہ اختیار کیا؟"

"مگر میں نے ہی اُس کی خاطر کسی عرب خاتون کی تقلید کیوں نہ کی!"

مریم اس غیر متوقع جواب سے متحیر سی رہ جاتی ہے +

(مریم کے سر بدست شفقت پھیرتے ہوئے) پیاری تم ابھی بچی ہو محبت اور مقتضیاتِ محبت سے بے خبر ہو۔ تم کیا جانو کہ عشق کسے کہتے ہیں اور اس کوچہ کے ایثار پیشہ رہ نورد داعیاتِ محبت کو لبیک کہتے ہوئے کیسی کیسی عظیم الشان قربانیاں کر گزرتے ہیں۔ میری کم سن عزیزہ تم ہنوز راہ ناآشنا ہو۔ میری یہ نصیحت ہمیشہ یاد رکھو کہ کسی سے محبت نہ کرو اور اگر خدانخواستہ اس کی نوبت آئے تو اس کی اطاعت کرو!"

"اطاعت! کیا کسی مرد کی؟"

"نہیں محبت کی!"

"دونوں ایک ہی بات ہے!

"مریم! عورت خواہ کسی حال میں ہو وہ اسیر ہے۔ وہ مرد کی ملک ہے۔ آج نہیں کل۔ کل نہیں پرسوں کبھی نہ کبھی اُس کے عزائم کو مرد کے عزائم کا تابع ہونا پڑے گا۔ اگر خوش قسمتی سے مرد اُس سے محبت بھی کرتا ہو تو عورت مجنوں سمجھی جائے گی۔ اگر اس کی مخالفت کرے۔ اور جو عورت آج اپنے چاہنے والے کی مخالفت کر رہی ہے۔ کل کسی ایسے مرد کی اطاعت پر مجبور ہوگی جس کا قلب اُس کی محبت سے بالکل خالی ہوگا۔ آہ! میں نے سب کچھ کھو کر یہ سیکھا ہے۔ یقیناً اُسے مجھ سے محبت تھی۔ وہ مجھ پر فریفتہ تھا۔ مگر مجھ پر جنون سوار تھا کہ میں نے اُسے "مجنوں" کہا اور ایک ایسے شخص کی خاطر جو بارہا میری آرزوؤں کو رد کر چکا تھا۔ میں نے اُس کی جو میری ساری کائنات تھا' ایک فرطِ محبت پر مبنی خواہش کو "ہرگز نہیں" کہہ کر ٹھکرا دیا۔ اور صرف ایک جملہ میں زندگی بھر کی مصیبت خرید لی۔ یقیناً میں گنہگار تھی اُس کا کوئی قصور نہ تھا۔ مریم! وہ میرا اور تیرا آقا تھا۔ میں نے اُس کی اطاعت نہ کی۔ مگر آج میں ایک ایسے شخص کی اطاعت پر مجبور ہوں جو ہرگز مجھے دل سے نہیں چاہتا۔ اور اُس نے جو کچھ کیا ہے محض ضد اور فاضل سے دیرینہ عداوت کی بنا پر کیا ہے"+

"مریم! جاؤ اپنا کام دیکھو مگر میرا یہ قول کبھی نہ فراموش کرنا کہ "محبت کرو تو اُس کی اطاعت بھی کرو"+

(تنہائی میں خود بخود) گذشتہ شب خواب میں وہ رات بھر نظر آتا رہا۔ میرے مصائب کی ابتدا بھی رات ہی سے ہوئی تھی۔ اس منحوس رات سے قبل میں کتنی خوشگوار قسمت تھی اور وہاں بھی اُس کے ساتھ کیسے مزے میں گزر رہی تھی۔ مگر افسوس! ہوسرا کھیل ختم ہو چکا!"

دفعتہً فاضل داخل ہوتا ہے +

فائین اُس کے ناگہانی ورود پر دہشت اور مسرت سے چیخ اُٹھتی ہے:-

"یا نصیب! تم زندہ ہو!"

"تم نے تو مجھے مار ہی ڈالا تھا۔ مگر تمہارے علی الرغم ابتک زندہ ہوں"

"ہرگز نہیں میں ان اشقیا کی اس حرکت سے خود ہی نالاں تھی"+

اس کی وجہ سے فاضل کو جو تکالیف برداشت کرنی پڑی ہیں ان پر اپنی المناکی کا اظہار کرتے ہوئے شدائد فراق کا شکوہ کرتی ہے +

فائین نے شام کا تفریحی لباس زیب تن کر رکھا ہے۔ فاضل دریافت کرتا ہے:-

"کیا تم رقص میں جا رہی ہو؟"

"ہاں جانے والی تھی مگر "جبراً"!"

(زہر خندہ کے ساتھ) "جبراً"!"

"یوں مجھ سے استہزا نہ کرو۔ آؤ میرے منتظر آغوش میں آؤ۔ میرے خون میں برودت سرایت کر گئی ہے۔ میری مسرتوں کا چراغ گل ہو چکا ہے۔ مجھ سے چمٹ کر میرے اعماق روح کو مشتعل کر دو +

فاضل اس کی آرزو کی تکمیل کرتا ہے +

"خوشا نصیب! اِس اسی لمحہ میں مر جانے کا لطف ہے!

(اُسے اپنے آغوش سے علیحدہ کرتے ہوئے) "تم یہاں کس کے ساتھ رہتی ہو؟"

"اور وہاں تم کس کے ساتھ رہتے ہو؟"

"تو کیا ہمیں مخاصمین کی طرح معاندانہ گفتگو کرنی چاہئے"+

"نہیں نہیں یہ نہ خیال کرو۔ مدت کے فراق کے بعد اب میرے قلب میں محبت و سرور اور عفو و درگزر کے سوا اور کچھ نہیں ہے"+

(متحیر ہو کر) "عفو اور درگزر!" خیر یہ تو بتاؤ کہ تم یہاں کس کے ساتھ رہتی ہو؟"

"تم مجھے لینے آئے ہو؟"

"تم میرے ساتھ چلنے کو تیار ہو؟"

(کشادہ دلی سے) "ہاں بخوشی تیار ہوں! مگر جلدی کرو ورنہ جان آ جائے گا"۔

"جان؟ تم جان کے پہلو کی زینت بنی ہوئی ہو!"

فاضل کے چہرہ پر شدید المناکی کے آثار ہویدا ہیں۔ وہ فابین سے اپنی ان تکالیف کا تذکرہ کر رہا ہے جو اس کے ایما سے جان کے ہاتھوں اسے برداشت کرنی پڑیں۔

"اُف! اس دردناک سرگذشت کا اعادہ نہ کرو۔ اسے فراموش کر دینا ہی بہتر ہے"۔

"تمہارے احباب نے مجھے قتل کر دیا تھا۔ مگر میں صرف اس لئے زندہ رہ گیا ہوں کہ غاصبوں کے ہاتھ سے تمہیں دوبارہ حاصل کروں"۔

"امتہ اللہ سے تمہاری شادی ہو چکی یا ابھی نہیں؟"

"فی الحال میں نے اس کا خیال ترک کر دیا ہے۔ اور شاید آئندہ بھی نہ ہو سکے!"

(فاضل کی گردن میں اپنی باہیں حائل کرتے ہوئے) "اگر تم اس کا خیال ہمیشہ کے لئے دل سے نکال دو تو میں سچ کہتی ہوں کہ تمہاری خاطر میں سب کچھ ترک کر دینے کو تیار ہوں"۔

"ہاں! سب کچھ!!"

فابین خائف نگاہوں سے بار بار دروازہ کی طرف دیکھتی ہے۔

"تم جان سے اسقدر خوفزدہ کیوں ہو رہی ہو؟"

"جانے دو! اس ذکر کو چھوڑو!"

"تم بھی میری ہو اور خیال جان کا دامنگیر ہے؟"

"بہتر ہوگا کہ ہم فوراً یہاں سے روانہ ہو جائیں!"

"بہت خوب!" کہتے ہوئے فاضل فابین کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر زور سے دباتا ہے۔

فابین اُف کر کے ہاتھ کھینچ لیتی ہے۔

مگر فاضل اپنا کام کر چکا۔ اس نے زہر ملا مل میں بجھی ہوئی ایک نوکدار انگوٹھی پہن رکھی ہے اور اس کا مہلک زہر فابین کے خون میں داخل کر دیا ہے۔

فابین دریافت کرتی ہے "یہ تم نے کیا کیا؟"

"میں نے اپنی عزت و شرافت بدکار غاصبوں کے قبضہ سے واپس لے لی! کیا تمہیں وہ شب یاد ہے۔ جب میں نے اپنے قصر میں پہلی بار کہا تھا کہ "مجھے تم سے محبت ہے"! اور تم نے جواب دیا تھا کہ "میں تمہاری بیوی ہوں" میں نے اسیوقت تمہیں اس سے بھی آگاہ کر دیا تھا کہ اب قصر سے نکلنا تمہارے لئے روانہ ہوگا۔ مگر ہماری قبائلی کرامت و شرافت کو پامال کرتی ہوئی نہ صرف اغیار کے ساتھ نکل بھاگیں۔ بلکہ بلا وجہ مجھ پر بزدلانہ حملہ میں ان کی امداد کی پھر انہی بدکاروں کی معیت میں سفر کیا اور انہی ننگ انسانیت وحشیوں کے ساتھ یہاں وارد عیش دے رہی ہو۔ پھر بھی تم ہماری بیوی تھیں اور اب میں مطمئن ہوں کہ تمہارے تنفر اور تمہاری کراہت کے باوجود میں نے ابدالآباد تک کیلئے تمہیں اغیار کے قبضہ سے نکال لیا۔

زہر فابین کے رگ و پے میں سرایت کر گیا ہے۔ اس کی طاقت سلب ہو رہی ہے۔ اس کا وجود اس کے اختیار سے باہر ہو رہا ہے۔ وہ فاضل کو مخاطب کرتی ہوئی گر جاتی ہے:۔

"ارے تم نے یہ کیا کر دیا؟ آہ میں تمہارے سوا اور کسی سے محبت نہیں کرتی"۔

"اور اس کا سب سے بین ثبوت یہ ہے کہ تم نے یہاں میرے قاتل کے کاشانہ کو انوار محبت سے روشن کر رکھا ہے!"

"او احمق غیور ——— موت ——— ہیبتناک موت ———

فراموشی ——— نسیان ——— چند منٹ کے بعد ——— سب کچھ ختم ہو جائے گا ——— پھر میں نوٹ کر نہیں آ سکتی ——— میرے قریب آؤ ——— اور قریب ——— مجھے مرتے ہوئے تنہا نہ چھوڑو ——— مجھے اپنے آغوش میں ——— مجھے اپنے سینے سے ——— زور سے ——— کیا تمہیں میری موت پر صدمہ نہیں ہو رہا ہے؟"

"بالکل نہیں۔ کیونکہ میں نے مدت سے اس کا عزم مصمم کر رکھا تھا!"

"وائے برعشق ما"

اس کی آواز اس کے گلے میں پھنس کر رہ گئی۔ اور اس کی روح پرواز کر گئی۔ دو مغائر طبائع کے عشق و محبت کے اس المناک انجام سے فاضل بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

"آہ! اے تمثال مجبوبیت کاش تو اپنے محاسن کے ساتھ اپنی مغربی فطرت کو بدل سکتی۔ آہ! اپنے اس انجام کے بعد کیا تو کہنے والوں کی یہ بات سن

سکیگی کہ" فاضل نے اپنی محبوبہ کو اغیار سے واپس لے لیا اور اُس کے ساتھ خود بھی لامتناہی مدت کے لئے روپوش ہوگیا!"

خادم داخل ہوتا ہے +

فاضل آمرانہ لہجہ میں اُس سے کہتا ہے کہ تمہاری بیگم سوئی ہیں۔ روشنی گل کردو۔ اور تمہارا آقا آئے تو اُس سے کہدینا کہ فاضل آیا تھا +

کمرہ موت کی بولتی ہوئی تصویر معلوم ہورہا ہے۔ در و دیوار سے وحشت ٹپک رہی ہے۔ خوفناک تاریکی نے منحوس ماحول پر اپنے ماتمی پردے گرادئے ہیں۔ ایک غیور عرب اپنا انتقام لے چکا اور داعیات محبت کو خاطر میں نہ لانے والی فاتن کو داعئ اجل کی اطاعت کرنی پڑی +

فاضل رخصت ہونے سے پہلے فاتن کے نیلے چہرہ کو نمناک نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ اُس کی پیشانی کو بوسہ دیتا ہے اور کانپتے ہوئے قدموں سے باہر نکل جاتا ہے۔ گویا اُس کا جسم بھی اُس کے اختیار سے باہر ہورہا ہے +

(خاص) صدیق طبیب

ایک محبوبہ کی استدعا

مسافر! کیا تم ضرور جاؤگے ؟

ابھی رات باقی ہے۔ ہنوز ظلمت شب تمام عالم کو اپنی سیاہ چادر میں چھپائے ہے۔ بالاخانوں میں لیمپ روشن ہیں۔ ابھی تک پھول شگفتہ و شاداب ہیں۔ شراب جوانی سے سرشار آنکھیں بیدار ہیں +

کیا تمہارے "خدا حافظ" کہنے کا وقت واقعی آگیا ؟ مسافر! کیا تم ضرور جاؤگے ؟

ہمارے دست بستہ ہاتھ تمہارے قدموں کے سدِّ راہ نہیں بن سکتے +

ہاں! دروازہ کھلا ہے۔ گھوڑا تیار دروازہ پر کھڑا ہے۔ تمہاری روانگی میں اگر کوئی چیز مزاحم ہوسکتی ہے تو وہ .. ..

ہمارے نغمات

مسافر! میں مجبور ہوں۔ میرے پاس صرف محبت کے آنسو ہیں +

محبت کے نہ بجھنے والے کون سے شعلے تمہارے سینے میں بھڑک رہے ہیں ؟

تمہارے خون میں کون سی بیقرار حرارت دورہ کررہی ہے ؟

معلوم نہیں! تم صدائے ظلمت پر لبیک کہہ رہے ہو +

غالباً فلک نیلگوں کے چمکدار ستاروں نے اپنے جادو سے تم کو مسخر کرلیا ہے۔ اور اندھیری رات کا کوئی سربستہ راز تمہارے دل میں پنہاں ہے کہ ایسی گھٹا ٹوپ اندھیری رات میں باہر جانے کو تیار ہو +

اگر تم کو بزم طرب پسند نہیں آتی اور تمہارا خستہ دل سکون و آرام چاہتا ہے تو میں یہ سب چیزیں برطرف کرتی ہوں۔ تم آرام سے خواب شیریں کے مزے لو +

جب تھکا ماندہ چاند اپنی نورانی کرنیں تمہاری کھڑکی پر ڈالے گا۔ اُس وقت میں خاموش پتّوں کی آڑ سے مجو دید ہونگی +

لیکن مسافر! کرب و بیچینی کی آگ تمہارے سینہ میں بھڑک رہی ہے۔ جو میری استدعا کو جلائے دیتی ہے +

مسافر! کیا تم ضرور جاؤگے +

او مسافر! وادئ نیم شب کی کون سی نیند سے بیزار روح تمہارے دل پر غالب آگئی ہے ؟

(ٹیگور) (خاص) اظہر فاروقی۔ یو۔پی۔ کالج بنارس

والٹیئر

کلیسا کا سب سے بڑا باغی

ازجناب ریاض حسین صاحب بی۔اے

سترہویں صدی کے وسط میں سرزمین فرانس پر استبداد و مطلق العنانی کا دَور دورہ تھا۔ عوام کے جسم اگر حکومت کے جور و جفا کا تختۂ مشق بن رہے تھے۔ تو ان کی روحیں کلیسا کے پادریوں کے ظلم و ستم کی آماجگاہ بن رہی تھیں۔ حکومت کلیسا کی حفاظت کا بیڑا اُٹھائے ہوئے تھی۔ اور کلیسا حکومت کی جا و بیجا حمایت کو اپنا شعار بنائے ہوئے تھی۔ حکومت محصولوں کی جبراً وصولی سے اپنے خزانے بھر رہی تھی اور پادری تخویف و ترہیب کے ہتھیاروں سے نذرانے وصول کر رہے تھے۔ بادشاہ قانون بناتا اور کلیسا مذہبی اعتقادات وضع کرتی۔ بادشاہ قوت سے حکومت کرتا۔ اور پادری دلوں کے اندر خوف پیدا کر کے۔ اور دونوں ایک دوسرے کے حامی و مددگار تھے۔ اگر کسی کے دل میں آزادی کی تڑپ پیدا ہوتی، تو فوراً اُس کا گلا گھونٹ دیا جاتا۔ الغرض رعایا مظلومی و بیچارگی کی تصویر تھی۔ جہالت نے ہر طرف ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ نہ صرف جسموں پر غلامی کی لعنت چھا رہی تھی۔ بلکہ دل و دماغ بھی اس کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ حکومت اور کلیسا چکّی کے دو پاٹ تھے جن کے درمیان عوام دانوں کی پس رہے تھے مصنفین اور اہل قلم بادشاہ اور پادریوں کے رحم پر تھے۔ ان میں سے اکثر قید و بند کے مصائب جھیل رہے تھے۔ یا جلاوطنی میں زندگی کے دن گذار رہے تھے باقی جلّاد کے ہاتھوں سر قلم کروا چکے تھے۔ آنے والے خوفناک انقلاب کے بیج نامعلوم طور پر شاہی امیروں اور کلیسائی پادریوں کے ہاتھوں بوئے جا رہے تھے اور وہ مظلوم رعایا کے دلوں میں دُکھ اور درد کے آنسوؤں سے سیراب ہو ہو کر نشو و نما پا رہے تھے۔ فلاکت زدہ کمزور لوگ جب خوشحال امرا کو دیکھتے تو دل ہی دل میں دانت پیس کر رہ جاتے۔ اُن کے ہاتھ بے اختیار بھنچ جاتے۔ کہ ان امرا اور ان کی مغرور بیگمات کی سفید گردنوں کو مروڑ دیں۔ فرانس کے اندر صرف امرا اور پادری ہی مقدّس اور پاکیزہ تھے۔ عوام تو وبائی جراثیم سے زیادہ قابلِ نفرت تھے۔ بیکار امیر عیش پرستیوں میں مگن تھے۔ اور محنت کش مزدور سوکھے ٹکڑوں کو ترس رہے تھے۔ الغرض فرانس میں انسانیت اپنا شرف و مجد کھو چکی تھی اور اپنی بے بسی و مظلومی پر نوحہ کر رہی تھی +

پیدائش

اس عہد استبداد میں ۲۱ر نومبر ۱۶۹۴ء کی تاریخ یکشنبہ کے دن فرانس کے ایک معمولی قصبہ میں ایک بچّہ پیدا ہوا۔ نہایت نحیف و نزار۔ سانس تک بمشکل چل رہی تھی۔ والدین نے جھٹ باغی کو بلایا اور بساطِ ہستی کے اس نووارد کو بپتسمہ دلایا۔ ڈرتے تھے کہ کہیں بپتسمہ لئے بغیر ہی نہ چل بسے۔ ورنہ اس کی ننھی سی روح دائمی عذاب میں گرفتار رہیگی۔ پادری نے بپتسمہ دینے کے بعد بچّے کا نام فرینکائے مَیری اراؤٹ رکھا۔ اس وقت کسے خیال ہو سکتا تھا۔ کہ یہ کمزور اور نحیف بچّہ جس کی روح کو ابدی عذاب سے بچانے کے لئے کلیسا کے ایک خادم نے بپتسمہ دیا۔ بڑا ہو کر کلیسا کے ہی خلاف بغاوت و سرکشی کا جھنڈا بلند کرے گا اور قصر کلیسا کی بنیادوں کو متزلزل کر دے گا +

تعلیم و تربیت

یہ بچّہ طبقہ عوام میں سے تھا۔ وہ کسی نامور خاندان سے نسبت کا فخر نہ رکھتا تھا۔ ابھی وہ سات سال کا ہی تھا۔ کہ اُس کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔ اُسکا ایک بڑا بھائی آرمنڈ تھا۔ جو مذہبی رجحان رکھتا تھا۔ لیکن یہ لڑکا جو دنیائے مذہب میں ایک ہلچل ڈالنے والا تھا۔ مذہب سے یکسر بیگانہ رہا۔ نیز جہانتک معلوم

ہو سکا ہے اس کے آبا و اجداد میں سے کوئی شخص ایسا نہ تھا۔ جسے ادبیات سے شغف رہا ہو۔ اسقف ڈاچولیو اس کا روحانی باپ بنا۔ لیکن وہ بھی مذہب کا زیادہ پابند نہ تھا۔ والد کی نیت تھی کہ اپنے بیٹے کو قانون کی تعلیم دلائے۔ لیکن بیٹے کا مذاق اس سے مختلف تھا۔ دس سال کی عمر میں وہ لوئی لاگرانڈ کالج میں داخل ہوا یہاں وہ سات سال تک تعلیم پاتا رہا اور اس کے بعد کسی اور جگہ باقاعدہ تعلیم حاصل نہ کی۔ اس کالج میں جو کچھ اس نے حاصل کیا۔ اس کے متعلق اس کا اپنا بیان ہے۔ کہ "یہاں میں نے تھوڑی سی یونانی۔ کافی لاطینی اور بہت زیادہ خرافات کی تعلیم پائی"۔

سترہ سال کی عمر میں اس نوجوان نے جو والٹیئر کے نام سے عالمگیر شہرت حاصل کرنے والا تھا۔ ارادہ کیا کہ ادبیات کو اپنی زندگی کا مشغلہ بنائے۔ باپ کو یہ پسند نہ تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ اس نے اپنے دونوں بیٹوں کا ذکر ان لفظوں میں کیا "میرے بیٹے کیا ہیں۔ احمقوں کا ایک جوڑا ہے۔ ایک نظم میں دوسرا نثر میں" پس والد نے کوشش کی۔ اور ۱۷۱۳ء میں والٹیئر کو ہیگ میں فرانسیسی وزیر کے ماتحت ملازمت مل گئی۔

داستانِ محبت

یہاں ملازمت کرتے زیادہ مدت نہ گذری تھی۔ کہ والٹیئر کو ایک لڑکی سے محبت ہو گئی۔ لڑکی کی والدہ کو یہ تعلق پسند نہ آیا۔ اس نے روکا۔ والٹیئر نے اپنے کپڑے لڑکی کو بھیجے۔ اور کہا۔ کہ یہ پہن کر مجھے ملنے آؤ۔ راز کھل گیا۔ اور والٹیئر کو ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔ اس نے اپنی محبوبہ کو ایک چٹھی لکھی۔ جس میں اقتباس ذیل والٹیئر کی ذہنیت کی کلید سمجھا جاتا ہے:۔

"مفت میں اپنی والدہ کے غیظ و غضب کا نشانہ مت بنو۔ تمہیں خوب معلوم ہے۔ کہ وہ کیا کچھ کر سکتی ہے۔ تمہیں پہلے ہی اس کا کافی تجربہ ہو چکا ہے۔ منافقت اختیار کرو۔ بس یہی کامیابی کا گر ہے۔ اسے صاف صاف بتاؤ۔ کہ تم مجھے بالکل بھول چکی ہو نہیں بلکہ مجھ سے نفرت کرتی ہو۔ اور اس کو یہ بتانے کے بعد مجھ سے بیش از بیش محبت کرو"۔

اس واقعہ کی اطلاع جب اس کے والد کو ہوئی تو اسے بیحد رنج ہوا۔ یہانتک کہ اس نے والٹیئر کو باقاعدہ طور پر وراثت سے محروم کر دیا۔ اور اس کی گرفتاری کا حکم بھی حاصل کر لیا۔ اب اس نے صاف لفظوں میں والٹیئر سے کہا کہ یا تو کہیں سمندر پار چلے جاؤ۔ ورنہ تمہاری جگہ قید خانہ کے اندر ہو گی۔ والٹیئر نے اپنی غلطیوں کا اعتراف کیا۔ والد سے معافی مانگی۔ اور اس کی رضا جوئی کے خیال سے وکیل بننے پر آمادہ ہو گیا۔ چنانچہ تھوڑی مدت ایک قانون داں کے ہاں کام بھی کیا۔ لیکن پھر اسے قانون سے نفرت ہو گئی۔ اب اس نے شاعری کی طرف توجہ کی۔ اور ایک ٹریجڈی کے لکھنے میں مصروف ہو گیا۔

شعر و شاعری کا شغل

اگرچہ اس وقت مذہب اور حکومت کے بیسیوں مسائل پر معرکۃ الآرا مباحثے ہو رہے تھے۔ لوگ اعتقادات کے جرم میں قید و بند تو در کنار دار و رسن کے حوالے کئے جا رہے تھے۔ لیکن والٹیئر کو ان واقعات سے کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ مذہب یا حکومت کے متعلق بہت کم واقفیت رکھتا تھا۔ اس کا تمام تر وقت شعر و شاعری کی خیالی دنیا میں گذرتا تھا۔ اس کے رگ و پے میں زندگی کی روح دوڑ رہی تھی اور اس کے خیالات تخیل کے بازوؤں پر مصروفِ پرواز تھے۔

جلاوطنی

اسی دوران میں اس پر الزام لگایا گیا۔ کہ اس نے ایک طنزیہ نظم لکھی ہے اس کی پاداش میں اس کو تین سو میل دور بمقام ٹُلے جلاوطن کر دیا گیا۔ یہاں سے اس نے ایک خط میں لکھا:۔

"میں یہاں ایک قصر میں اقامت رکھتا ہوں۔ یہ ایک ایسی جگہ ہے کہ اگر میں جلاوطن ہو کر یہاں نہ آیا ہوتا۔ تو دنیا میں قابلِ دید ہوتی۔ اور اس کو چھوڑنے کی اجازت کے سوا جو میسر نہیں۔ یہاں عیش و راحت کے جملہ اسباب مہیا ہیں۔ یہاں رہنا میرے لئے بے انتہا مسرت بخش ہو اگر مجھے یہاں سے چلے جانے کی اجازت مل جائے"۔

کچھ مدت بعد اس کو واپس آنے کی اجازت مل گئی۔ لیکن پھر جلد ہی گرفتار کر لیا گیا۔ اور اس دفعہ اس کو زندانِ بیسٹیل میں ڈالا گیا۔ یہاں وہ ایک سال تک رہا۔ اسی قید خانہ میں اس نے فرنکائے میری اراوئٹ کی بجائے والٹیئر کا نام اختیار کیا اور اس وقت سے لے کر آجتک اسی نام سے مشہور ہے۔

فرانس سے فراری

قید خانہ سے نکلنے کے بعد والٹیئر کا دل نئے نئے خیالات سے ایسا ہی لبریز

تھا۔ جیسا موسم بہار پھولوں سے۔ اس کے اندر ایک جوش اور ولولہ سا تھا۔ وہ ہر موضوع اور ہر مسئلہ پر اپنے خیالات بے کم وکاست بیان کرتا پھرتا۔ اس کی طبع رواں کی تلوار سے نہ بادشاہ بچا۔ نہ پادری۔ اور اس کی صاف بیانی جلد ہی رنگ لائی۔ اور اسے فرانس کی خوبصورت اور آفتابی کرنوں سے دھلی ہوئی سرزمین کو خیرباد کہنا پڑا۔ اور اس کی بجائے کُہر اور دُھند کی سرزمین یعنے انگلستان میں پناہ لینی پڑی +

یہاں دوران قیام میں وہ انگلستان کی بلندترین اور بہترین شخصیتوں سے متعارف ہوا۔ وہ شاعر پوپ سے ملا۔ جو لفظوں سے مصنوعی پھول ایسے اعلیٰ تیار کرتا تھا کہ اصلی معلوم ہوتے تھے۔ صرف خوشبو کی کسر رہ جاتی "خیالات شبی" کے مصنف ینگ۔ تمیزداری کے پتلے مگر انسانیت سے معرا چسٹر فیلڈ۔ شہرۂ آفاق ہجونگار سوفٹ۔ اور کانگریو وغیرہ مشاہیر سے ملتا رہا۔ اور ان کے ساتھ علمی اور ادبی مذاکرے ہوتے رہے +

توہم پرستی کی مخالفت

اسی زمانہ میں والٹیئر کے دل میں مذہب کے متعلق شکوک وشبہات پیدا ہوتے رہے۔ وہ محسوس کرنے لگا۔ کہ مذہب کی صورت پادریوں کے ہاتھوں مسخ ہو چکی ہے۔ اور اب وہ فقط مجموعۂ اوہام ورسوم رہ گیا ہے۔ اور اس رسمی مذہب نے دنیا کے اندر ظلم وستم اور خوف ودہشت پھیلا رکھی ہے۔ اعمال کی نیکی اور پاکیزگی کو کوئی نہیں پوچھتا۔ ان سے زیادہ لباس اور وضع قطع کو اہمیت دی جا رہی ہے تصویریں اور بت۔ صلیبیں اور کرم خوردہ ہڈیاں انسان کی زندگی اور اُس کے حقوق سے کہیں زیادہ قیمتی سمجھے جاتے ہیں۔ اب اُس نے اپنی پوری طاقت اور قوت کے ساتھ اپنی فطری مستعدی سے اس صورت حالات کا مقابلہ شروع کیا +

وہ عقل عامہ کا پیرو تھا۔ ناقابلِ فہم امور کا قائل نہ ہوتا۔ خرق عادت کو محض ڈھکوسلہ سمجھتا۔ اس کا ایمان تھا۔ کہ دنیا کا کارخانہ مقررہ اصولوں پر چل رہا ہے۔ اور ان میں کبھی سرِمو فرق نہیں پڑ سکتا۔ وہ علم کیمیا کو بھی بے بنیاد جھوٹ سمجھتا۔ اور یہ کہ کر اس کا مذاق اُڑایا کرتا۔ کہ لوہے کو سونے میں تبدیل کرنے کے لئے دو باتیں ضروری ہیں۔ پہلے لوہے کو نابود کرنا۔ دوسرے سونے کو پیدا کرنا +

وہ نہایت با مذاق۔ خوش طبع اور مسرور انسان تھا۔ وہ ان لوگوں کو قابل رحم خیال کرتا تھا جو دیانتدار یا مسرور ہونے کے لئے مذہب کی اعانت کے محتاج تھے۔ وہ ان باتوں کو محض وہم پرستی سمجھتا۔ اب اُس نے تہیّہ کر لیا کہ اپنے زمانہ کے لوگوں کو اوہام ووساوس کی زنجیروں سے آزاد کر دے۔ اس کے بعد جو جو ہتھیار اُس کی غیرمعمولی قابلیت اور دماغی قوت اُسے دے سکی۔ اس نے اس مقصد کے حصول میں استعمال کرنے سے دریغ نہ کیا۔ وہ کسی کی کمزوریوں کا خاکہ اُڑانے میں کمال رکھتا تھا۔ قدرت نے یہ وصف خاص طور پر اُسے بخش رکھا تھا۔ اور والٹیئر نے بھی اس کو کمال بے رحمی سے برتا۔ کئی سال تک اُس کی بے چین اور مضطرب طبیعت نے یورپ بھر میں اپنے مضامین نظموں۔ ڈراموں۔ تاریخوں اور افسانوں کے ذریعہ ہنگامہ بپا کئے رکھا۔ ان تصانیف میں اُس نے قلب انسانی کی ہر کیفیت کو نمایاں طور پر بے نقاب کیا۔ ساٹھ سال تک وہ اپنے مخالفوں کے ساتھ مصروف پیکار رہا۔ کبھی کھلے میدان میں اور کبھی موقعہ کی آڑ سے۔ لیکن اس تمام مدت میں وہ تمام انسانوں سے بے نیاز اور مستغنی رہا۔ اور اپنی گردن کو کسی کے بارِ احسان سے جھکنے نہ دیا +

کئی سال تک وہ خدا کی ہستی کا قائل رہا اور اسی کو دین فطرت کہتا رہا۔ خدا تعالیٰ کو وہ آسمانی باپ۔ سرچشمۂ انصاف، منبع ادراک اور مصدر رحم وکرم تصور کرتا تھا۔ لیکن اس کے خیال میں کلیسا کی تعلیم خدا کو ظلم وستم کا خوفناک مجسّمہ اور بندوں کو عذاب دے دے کر خوش ہونے والی ہستی ظاہر کرتی تھی۔ اور اسی لئے وہ کلیسائی خدا کا قائل نہ تھا۔ وہ بائیبل اور کلیسا پر تو بے جگری سے حملے کرتا اور اُن کا مضحکہ اُڑاتا لیکن ساتھ ہی ساتھ اُس خدا کی تعریف کے نغمے گاتا جو ہمیں بارش اور روشنی دیتا ہے۔ صدہا نعمتیں اور خوبصورت پھول بخشتا ہے۔ صحت و تندرستی اور خوشی وخرمی عطا فرماتا ہے۔ وہ خدا جو اس عالم رنگ وبو کو شباب اور حُسن کی بیش بہا نعمتیں بخشتا ہے +

ہر طرف سے اس پر حملے ہوتے تھے۔ لیکن وہ بھی ہر اُس ہتھیار سے۔ جو ظرافت منطق عقل۔ نفرت۔ حقارت۔ مضحکہ۔ جوش۔ رقّت۔ غیظ وغضب اسے دے سکتے تھے۔ ان حملوں کا جواب دیتا رہا۔ وہ کئی دفعہ اعتذار کرتا۔ لیکن اس کا اعتذار اور زیادہ توہین آمیز ہوتا۔ وہ اپنی کہی ہوئی بات واپس لیتا۔ لیکن اس سے زیادہ سنگین اور جگر شگاف چوٹ لگاتا قصیدہ کہہ کر وہ اپنے مخالف کی دھجیاں اُڑاتا۔ اس کی تعریف میں زہر بھرا ہوتا۔ اُس کی پسپائی میں پیشقدمی مضمر ہوتی اور اُس کا اعتراف شکست نغمۂ فتح کے مترادف ہوتا +

دہریت و الحاد

۱۷۵۵ء میں پرتگال کے دارالحکومت لزبن میں ایک خوفناک زلزلہ آیا۔ اس مصیبت خیز تباہی و بربادی نے والٹیئر کے دل میں خدا کی ہستی کے متعلق شک کا شبہ پیدا کر دیا۔ وہ دل ہی دل میں سوال کرتا۔ کہ جب زلزلہ آیا اُس وقت آسمانی باپ کیا کر رہا تھا۔ اُس نے کیوں اپنے ہزاروں بچوں کو اس طرح تباہی کے گھاٹ اُترنے دیا۔ اور پھر اُس وقت جبکہ وہ اُسی کے حضور گھٹنوں کے بل گر کر اُس کی تعریف و ثنا کر رہے تھے " یہ ایک ٹھوکر تھی جس نے والٹیئر کے قدم ڈگمگا دیئے۔ شک و شبہ کے تاریک بادل اُس کے مطلع دل پر یکسر چھا گئے۔ اور ایمان کی آخری کرن کو اپنی ظلمت میں چھپا لیا۔ وہ دہریت و الحاد کی تاریک غار میں گر گیا۔ اور اگر پہلے صرف کلیسا سے منحرف تھا۔ اب خدا تعالیٰ سے بھی باغی ہو گیا +

قرآنِ حکیم میں آیا ہے کہ ایک ہی واقعہ کئی سعید روحوں کے لئے ہدایت کا موجب ہوتا ہے۔ اور وہی واقعہ کئی بدبختوں کے لئے گمراہی و ضلالت کا سبب بنتا ہے۔ یہ زلزلہ بھی کئی لوگوں کے لئے باعث عبرت ہوا ہوگا۔ والٹیئر کے لئے ضلالت و گمراہی کا پیغام لایا +

بعض مشاہیر کی والٹیئر کے متعلق رائے

اس بلندپایہ ادیب اور قابل شخصیت کے متعلق دنیا کے مشہور فلاسفروں اور مصنفین نے بالکل متضاد خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان میں سے چند ایک کی رائے ناظرین کے لئے خالی از دلچسپی نہ ہوگی :-

جرمنی کے بے مثال شاعر اور گراں پایہ فلاسفر گوئٹے نے اپنے پُرشکوہ طرز تحریر میں والٹیئر کو ان لفظوں میں خراج تحسین ادا کیا ہے :-

" اگر تم ژرف نگاہی۔ غیرمعمولی ذہانت۔ تخیل۔ ذوق۔ عقل۔ حکمت۔ فطرت۔ ادراک۔ خیال آفرینی۔ حقیقت۔ سلاست۔ لچک۔ صحت۔ کمالِ فن۔ کثرت۔ تنوع۔ زرخیزی۔ حدت۔ طلسم۔ دلکشی۔ ناز۔ قوت۔ عقاب کی بینائی۔ وسعت فہم۔ پرمنفعت تعلیم۔ بہترین لہجہ۔ جسارت تحریر۔ ادائی۔ نزاکت۔ پاکیزگی۔ صفائی۔ فصاحت و بلاغت۔ ہم آہنگی۔ تنوع۔ برق رفتاری۔ خوش طبعی۔ تاثیر۔ رفعت۔ عالمگیری اور معراج تکمیل دیکھنا چاہو۔ تو والٹیئر کو دیکھو" +

کارلائیل کو بھی جو بوجہ رقابت بہت کم اپنے ہم عصروں کی تعریف میں کوئی لفظ کہنا پسند کرتا ہے۔ یہ اعتراف کرنا پڑا کہ والٹیئر نے عہد حاضرہ کے اوہام و وساوس کے رفیع المنزلت قصر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی +

ان کے ساتھ ہی لارڈ میکالے کی رائے بھی قابلِ لحاظ ہے۔ مگر یہ یاد رہے کہ میکالے خود مسیحی تھا۔ اور والٹیئر مسیحیت کا دشمن۔ وہ لکھتا ہے کہ والٹیئر نے اٹھارہویں صدی کے علم ادب میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔ نیز کہتا ہے۔ کہ

" یہ ایک حقیقت ہے۔ کہ والٹیئر طبعاً بے درد اور ظالم نہ تھا۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے۔ کہ اُس کے دل میں کسی چیز کا ذرّہ بھر احترام نہ تھا۔ علم و فن کے مسائل۔ مذہب کے سنجیدہ ترین موضوع۔ قبر اور حیات بعد الممات۔ کے مباحث۔ ہر ایک میں وہ اپنے فطری مسخرے پن سے کام لیتا۔ اور ہر بات کا مضحکہ اُڑاتا۔ جسقدر موضوع زیادہ سنجیدہ اور اہم ہوتا۔ اسی قدر زیادہ وہ بندر کی طرح مُنہ چڑاتا اور اُس کی ہنسی اُڑاتا۔ الغرض وہ مسخروں کا بادشاہ تھا۔ وہ ضبط سے کام نہ لیتا۔ بلکہ گُھڑکتا۔ دانت نکالتا۔ کولھے مٹکاتا۔ اُنگلی اُٹھاتا۔ ناک چڑھاتا اور زبان کو باہر لٹکاتا۔ اور ان ہتھیاروں سے اپنے مخالف کو ذلیل و رسوا کرتا" +

انگرسول اور میکالے اس امر میں متفق ہیں۔ کہ والٹیئر نے اپنی زندگی کے بہترین سال غریبوں اور مظلوموں کی امداد و اعانت میں بسر کئے۔ وہ بے گناہوں کو ظالموں کے پنجہ سے رہائی دلاتا۔ بیکسوں کی دستگیری کرتا۔ زیردستوں کو زبردستوں کے ظلم سے بچانے میں دامے۔ درمے۔ قدمے۔ قلمے ہر طرح تیار و مستعد رہتا۔ چنانچہ ذیل کے دو واقعات مشتے نمونہ از خروارے کا کام دیں گے +

والٹیئر کی رحمدلی اور انسانی ہمدردی

ٹولوس ایک مقدس شہر تھا۔ اس میں بہت سی بابرکت یادگاریں تھیں۔ لوگ جہالت کے پتلے تھے۔ مگر ان کے قبضہ میں ہیرودیس کے ہاتھوں قتل شدہ بچوں کی ہڈیاں۔ حضرت مریم کے لباس کا ٹکڑا۔ اور بہت سے اولیاؤں کی کھوپڑیاں اور ڈھانچے تھے۔ ان رومن کیتھولک عیسائیوں کے درمیان چند رومن پراٹسٹنٹ بھی خاموشی سے زندگی بسر کر رہے تھے۔ کیونکہ تعداد میں کم تھے۔ ان میں سے ایک جین کلاز معمولی دوکاندار تھا۔ وہ چالیس سال سے یہاں بود و باش رکھتا تھا اور اس کا چال چلن ہر قسم کی بدنامی سے پاک تھا۔ وہ رحمدل۔ دیانتدار اور ملنسار آدمی

تھا۔ جین کلاز کی ایک بیوی ۔ چار لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔ اس کے بڑے لڑکے نے قانون کا مطالعہ کیا۔ لیکن اُسے وکالت کی اجازت نہ مل سکتی تھی جب تک وہ رومن کیتھولک مذہب اختیار نہ کرے۔ اُس نے پوشیدہ طور پر لائسنس حاصل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن راز افشا ہوگیا۔ اس سے اُسے صدمہ ہوا اور وہ استقدر دل شکستہ ہوا کہ آخر خودکشی کرلی۔

اب ٹولوس کے متعصب لوگوں نے یہ کہانی گھڑی۔ کہ رومن کیتھولک ہونے سے روکنے کے لئے اُس کے والدین نے اُسے قتل کرڈالا ہے۔ اس خوفناک الزام میں اُس کا والد۔ والدہ۔ ایک بیٹا۔ ایک ملازمہ اور ایک مہمان فوراً گرفتار کرلئے گئے۔ مرنے والے کو شہید قرار دیا گیا۔ اور کلیسا نے اُس کی نعش کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ یہ ۱۷۶۱ء کا واقعہ ہے۔ کوئی ثبوت نہ تھا صرف لوگوں کی چہ میگوئیوں کی بنا پر مقدمہ چلایا گیا۔

حالانکہ تمام واقعات و شواہد ملزمین کے حق میں تھے۔ لیکن جین کلاز کے خلاف یہ فیصلہ ہوا کہ پہلے اُسے عذاب دیئے جائیں۔ اور آخر میں خوفناک چکر پر اُس کے اعضا توڑ کر اُسے مار ڈالا جائے۔ یہ ۹ مارچ ۱۷۶۲ء کو فیصلہ ہوا۔ اور دوسرے ہی روز اس کی تعمیل شروع ہوگئی۔

غریب باپ کو عقوبت خانے میں لے گئے۔ وہاں جلاد اور اُس کے معاونین سے حلف لیا گیا کہ وہ عذاب فیصلے کے مطابق دیں گے اور کسی قسم کی نرمی روانہ رکھیں گے۔ بعد ازاں ایک سنگین دیوار میں ایک آہنی حلقہ کے ساتھ اس غریب کے ہاتھ باندھ دیئے گئے۔ اور اُس کے پاؤں ایک دوسرے آہنی حلقہ میں جکڑ دیئے گئے۔ جو فرش میں نصب تھا۔ پھر انہوں نے رسیوں اور زنجیروں کو کسنا شروع کیا۔ اور یہانتک کسا کہ جین کلاز کے بازوؤں اور ٹانگوں کے تمام جوڑ بند اپنے اپنے مقام سے ہٹ گئے۔ تب اُس سے صحیح حالات کے متعلق سوالات کئے گئے۔ لیکن وہ اپنی معصومیت کا اظہار کرتا رہا۔ پھر زنجیروں کو اور کس دیا حتیٰ کہ طائرِ روح اُس کے شکستہ جسم میں پھڑکنے لگا۔ لیکن وہ اپنی بےگناہی کا اعلان کرتا رہا۔ اس کارروائی کو اُس وقت کی اصطلاح میں "معمولی تفتیش" کہا جاتا تھا۔ پھر ججوں نے ملزم کو سمجھایا۔ کہ وہ اپنے جرم کا اقبال کرلے۔ لیکن وہ برابر انکار کرتا رہا۔ اور اپنی بےلوثی کا یقین دلاتا رہا۔ اب "غیر معمولی تفتیش" شروع ہوئی۔ بچارے ملزم کے منہ کے ساتھ ایک نل لگا دیا گیا جس کے ذریعہ قریباً پندرہ سولہ سیر پانی اُس کے پیٹ میں جبراً داخل کیا گیا۔ اس سے اُس کو ناقابلِ بیان تکلیف ہوئی۔ لیکن وہ اپنی بات پر اڑا رہا۔ پھر اُسے صلیب پر لے گئے وہاں اُس کو باندھ دیا گیا۔ اور جلاد نے لوہے کی سلاخ سے گیارہ ضربیں لگائیں۔ اور اس کی بڑی بڑی ہڈیوں کو دو دو جگہوں سے توڑ ڈالا۔ اس کے بعد اس کو سسک سسک کر مرنے کے لئے چھوڑ دیا گیا۔ قریباً دو گھنٹے تک وہ زندہ رہا۔ لیکن اخیر دم تک اپنی بےگناہی کا اظہار کرتا رہا۔ چونکہ مرنے میں ذرا دیر لگی۔ اس لئے جلاد نے گلا گھونٹ کر اس کا قصہ پاک کیا۔ بعد ازاں اس کا خون میں لتھڑا ہوا شکستہ اور مجروح جسم کو لکڑی کے ساتھ باندھ کر جلا دیا گیا۔

یہ تمام کارروائی ٹولوس کے "خداپرست" باشندوں کے لئے قابلِ دید نظارہ اور دلچسپ تماشہ تھا۔ لیکن یہ معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہوا۔ جین کلاز کی تمام جائداد ضبط کرلی گئی۔ اُس کے بیٹے کو صرف اس شرط پر رہائی ملی کہ وہ رومن کیتھولک ہوجائے۔ دونوں لڑکیوں اور ملازمہ کو خانقاہ میں داخل کرلیا گیا۔ مہمان رہا کیا گیا اور غریب آفت رسیدہ بیوہ کو آوارہ پھرنے کے لئے چھوڑ دیا گیا۔

والٹیئر نے جب یہ ہولناک داستان سُنی۔ تو اُسے آگ سی لگ گئی۔ اُس نے ایک لڑکے کو اپنی حفاظت میں لے لیا۔ اور اس تمام مقدمہ کی تاریخ لکھی۔ بادشاہوں اور تاجداروں شہزادیوں۔ امراء اور وزراء کے ساتھ خط و کتابت کرتا رہا۔ جہاں روپے کی ضرورت پڑی وہاں روپیہ خرچ کیا۔ اور کئی سال تک یورپ کی فضا کو جین کلاز کی دردناک چیخوں سے معمور رکھا۔ انجام کار وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوا ججوں کا فیصلہ منسوخ کردیا گیا اور جین کلاز کو بےگناہ قرار دیا گیا ع

ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

ہزاروں ڈالر بیوہ اور اُس کے خاندان کی امداد کے لئے جمع کئے گئے۔ اس تمام کامیابی کا سہرا والٹیئر کے سر تھا۔

خاندان سِروَن کی مظلومیت

ایک پروٹسٹنٹ عیسائی سِروَن نامی اپنی بیوی اور تین لڑکیوں کے ساتھ رہتا تھا۔ بشپ کے ملازم کی نیّت تھی کہ اُس کی ایک لڑکی رومن کیتھولک بنالی جائے۔ قانون نے بشپ کو اجازت دے رکھی تھی۔ کہ کسی پروٹسٹنٹ کا بچّہ لے کر اُسکی روح کو بچانے کے خیال سے رومن کیتھولک بنالے۔ چنانچہ سِروَن کی ایک لڑکی کو جبراً والدین سے چھین کر خانقاہ میں داخل کردیا گیا۔ وہ وہاں سے بھاگ کر اپنے والدین کے پاس آگئی۔ غریب کے ننھے سے جسم پر کوڑوں کے نشان پڑے ہوئے تھے۔ والدین کی جدائی کے صدمے اور خانقاہ کی پُرتشدد زندگی نے لڑکی کے

جو اس قتل کر دیئے تھے۔ وہ یکایک غائب ہو گئی۔ چند روز بعد اس کی لاش ایک کنوئیں میں سے ملی۔ شور مچ گیا کہ اس کے والدین نے اسے عمداً مار ڈالا ہے۔ کہ مبادا رومن کیتھولک نہ ہو جائے۔ یہ واقعہ ٹولوس سے تھوڑے فاصلہ پر ہوا۔ اور اس وقت جب جیین کالا قیدخانہ میں محبوس تھا۔ لڑکی کے والدین کو یقین تھا کہ مقدمہ ہوا تو جان کی خیر نہیں۔ بچارے بھاگ نکلے۔ ان کی عدم موجودگی میں مقدمہ چلا۔ اور فیصلہ یہ ہوا کہ جائداد ضبط کر لی جائے۔ والدین جلّاد کے ہاتھوں قتل کیئے جائیں۔ لڑکیوں کو والدین کے قتل کا نظارہ دکھانے کے بعد جلاوطن کیا جائے۔ سردی کا موسم تھا جب یہ مصیبت زدہ قافلہ گھر سے بھاگا۔ راستہ میں برفباری ہو رہی تھی۔ کہ بڑی لڑکی نے جو شادی شدہ تھی بچہ جنا۔ ماں کا وہیں انتقال ہو گیا۔ اور آخر گرتا پڑتا یہ بے سروسامان قافلہ سوئٹزرلینڈ پہنچ گیا۔ مگر کھانے کو ان کے پاس سوکھی روٹی تک نہ تھی۔ انجام کار وہ والٹیئر کے پاس گئے۔ اس نے ان کی حمایت کا بیڑا اٹھایا۔ ان کو اپنی حفاظت میں لیا۔ ان کی معاش کا معقول بندوبست کیا۔ اور اس کوشش میں لگ گیا۔ کہ اس خوفناک فیصلہ کو منسوخ کروائے جو تو سال ہوئے ان کے خلاف صادر ہو چکا تھا۔ اس نے بادشاہوں سے روپے کے لئے اپیل کیا۔ روس کی شہزادی کیتھرائن دوم کو لکھا۔ اور ان کے علاوہ سینکڑوں لوگوں کو اس ظلم صریح کی جانب توجہ دلائی۔ آخر وہ کامیاب ہوا۔ اس مقدمہ کی بابت اس نے لکھا ہے۔ کہ ۱۷۶۲ء میں دو گھنٹے کے اندر اندر خاندان سرون پر مقدمہ چلایا گیا۔ اور فیصلہ کیا گیا۔ لیکن اب ۱۷۷۲ء میں پورے دس سال کی مسلسل کوشش کے بعد ان غریبوں کو ان کے چھنے ہوئے حقوق واپس ملے ہیں"۔

الغرض ایسے بیسیوں دردناک واقعات ہیں۔ جن میں والٹیئر نے ہمیشہ کمزوروں اور ضعیفوں کی دستگیری کی۔ ایسی باتیں سنکر اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ اور اس کا خون ابلنے لگتا تھا۔ وہ یہانتک بیزار ہو گیا۔ کہ ایک مرتبہ اس نے فرانس کی سرزمین کو جس کے اندر ایسے ایسے مظالم توڑے جاتے تھے ہمیشہ کے لئے خیرباد کہنے کا ارادہ کر لیا۔ لیکن غریبوں اور مظلوموں کی حمایت کے خیال نے اسے باز رکھا۔

مساواتِ انسانی کا علمبردار

والٹیئر ہمیشہ مساوات کا سرگرم واعظ رہا۔ اس کا یہ قول تھا کہ انسان پیدائش سے ہی ایک دوسرے کے مساوی ہیں۔ آؤ صرف نیکی اور خوبی کا احترام کریں۔ اور نسب و خاندان کو فراموش کر دیں۔ آؤ۔ اپنے دلوں کے اندر یہ حقیقت ثبت کر لیں کہ تمام انسان برابر ہیں"۔

ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ شاید والٹیئر کو اسلام کے مطالعہ کا موقعہ نہیں ملا۔ ورنہ یقین واثق ہے کہ وہ اسلام کا حلقہ بگوش ہوتا۔ اور دہریت وا لحاد میں مبتلا نہ ہوتا۔ وہ نیک اخلاق اور رحم و انسانیت کے مذہب کا قائل رہا۔ وہ نہ تو شاعروں میں سب سے بڑا اور نہ ڈرامانویسوں کا سرتاج تھا۔ لیکن انگرسول کے خیال کے مطابق اپنے زمانہ کا سب سے بڑا انسان تھا۔ وہ آزادی کا سب سے بڑا حامی اور غلامی کا بدترین دشمن تھا۔

پیرس کو مراجعت

ستائیس سال کی جلاوطنی کے بعد وہ پیرس کو لوٹا۔ اس کی واپسی نہایت شاندار تھی۔ جا بجا فتحمند جرنیل کی طرح اس کا استقبال کیا گیا۔ فرانسیسی اکاڈیمی کے ارکان جن میں بہترین ارباب علم و فن شامل تھے اس کے خیر مقدم کو آئے اور یہ وہ عزت تھی کہ جو بادشاہوں کو بھی نصیب نہ ہوتی تھی۔ اس کی ٹریجڈی "آئرین" تمثیل کی گئی۔ تھیٹر میں اسے پھولوں کا تاج پہنایا گیا۔ اس وقت وہ فرانس کا سب سے بڑا شاعر اور ادیب تھا۔ اقلیم ادب کا واحد تاجدار۔ اس وقت فرانس میں تین طاقتیں کارفرما تھیں۔ بادشاہ۔ کلیسا اور والٹیئر۔ اگرچہ بادشاہ اس کا جانی دشمن تھا۔ اور کلیسا کے پادری اس کے خون کے پیاسے۔ لیکن والٹیئر فرانسیسی عوام کو اسقدر محبوب تھا کہ وہ اس کا کچھ نہ بگاڑ سکتے تھے۔

اب وہ چوراسی سال کا بڈھا تھا۔ زندگی کی تمام راحتیں اس کے گرد و پیش موجود تھیں۔ دولت اس کی دست بستہ کنیز تھا۔ غالباً اس سے پہلے کسی مصنف کو اسقدر مال و دولت نصیب نہ ہوا تھا۔ اور ان آخری ایام میں فرانسیسیوں نے اس کی عزت نہیں بلکہ پرستش کی۔

والٹیئر کا انتقال

۱۷۷۸ء مئی کے آخری دن تھے کہ پیرس میں سرگوشیاں ہونے لگیں کہ والٹیئر بستر مرگ پر دم توڑ رہا ہے۔ اس کی موت سے دو روز پیشتر اسکا بھتیجا گیا۔ اور دو پادریوں کو بلا لایا۔ اور انہیں بیمار چچا کے کمرے میں لے گیا۔ والٹیئر نے ان کی طرف دیکھا۔ اور بھتیجے سے کہا۔ "ان کو میرا سلام دو۔ اور میرا شکریہ پہنچا دو"۔ بڑے پادری نے آگے بڑھ کر کہا۔ نیک بخت انسان بتا۔ کیا تو ہمارے خداوند یسوع مسیح کی الوہیت

کا اقرار کرتا ہے ؟" والٹیئر نے یہ سُنا۔ اور ہاتھ بڑھا کر پادری کو پیچھے دھکیل کر کہا۔ "مجھے آرام سے مرنے دو" اور دیوار کی طرف منہ کر لیا۔ پادری مایوس ہو کر چلا گیا +

۳۰ مئی کو رات کے ساڑھے بجے اُس نے اپنے ملازم خاص موریَنڈ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ اُسے دبایا اور کہا۔ "الوداع میرے عزیز موریَنڈ۔ میں اب جا رہا ہوں"۔ یہ اُس کے آخری الفاظ تھے۔ اس کے بعد وہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا +

لیکن مسیحیوں کے بیان کے مطابق اس کی زندگی کے آخری لمحات نہایت کرب و درد میں گذرے۔ وہ کتے کی طرح آواز نکالتا۔ اور عجیب ہذیان بکتا رہا اور کئی روز تڑپ تڑپ کر جان دی +

والٹیئر کو زندگی بھر میں کسی خوف اور اندیشہ نے پریشان نہیں کیا لیکن دفن ہونے کے متعلق اُسے بہت فکر رہتا۔ وہ جانتا تھا کہ فلاسفروں اور غیر مسیحی عالموں کو قبرستان میں دفن نہیں ہونے دیا جاتا بعض کو جلایا جاتا اور ان کی راکھ بکھیر دی جاتی۔ بعض کی نعشوں کو طعمۂ زاغ و زغن بننے کے لئے کھلا چھوڑ دیا جاتا لیکن والٹیئر کو یہ منظور نہ تھا۔ محض اسی خیال سے اس نے ظاہری طور پر چند ایک عیسائی رسومات بھی پوری کر دیں لیکن پھر بھی پادری جانتے تھے۔ کہ یہ سب ظاہرداری اور ریاکاری ہے۔ اور والٹیئر کو معلوم تھا کہ کچھ بھی کروں۔ مجھے پادری لوگ پیرس کے قبرستانوں میں ہرگز دفن نہ ہونے دینگے +

اسی خیال سے اس کی موت کی خبر کو پوشیدہ رکھا گیا۔ اس کے ایک ہمدرد پادری نے پیرس سے سو میل کے فاصلہ پر دریائے سین کے کنارے پر اس کے دفن کا انتظام کیا +

۳۰ مئی کی شام کو والٹیئر کی نعش کو ایک لمبا کوٹ اور ایسے کپڑے پہنائے گئے جن سے معلوم ہو کوئی مریض ہے۔ اس کو ایک گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔ اور ساتھ ایک ملازم سہارا دینے کے لئے بیٹھ گیا۔ گاڑی میں چھ گھوڑے جوتے گئے تاکہ دیکھنے والے خیال کریں۔ کوئی بہت بڑا امیر اپنی جاگیر کو جا رہا ہے پیچھے پیچھے ایک گاڑی تھی جس میں اُس کے دو بھتیجے اور دو اور رشتہ دار بیٹھے تھے۔ تمام رات سفر کرتے رہے اور دوسرے روز منزل مقصود پر پہنچے۔ جہاں ضروری کاغذات دکھانے کے بعد والٹیئر کو دفن کیا گیا۔ بعد میں اس پادری کو بشپ کی طرف سے ایک تہدیدی خط موصول ہوا جس میں والٹیئر کو دفن کرنے کی ممانعت تھی۔ لیکن خط بہت دیر میں پہنچا۔ وہ دفن ہو چکا تھا +

انقلاب فرانس

۱۴ جولائی ۱۷۸۹ء کو فرانس کے مصیبت زدہ عوام کے صبر کا پیمانہ چھلک گیا۔ وہ وحشیانہ جوش کے ساتھ اُٹھے۔ تخت حکومت کو اُلٹ دیا۔ امراء کی سرکش اور مغرور گردنوں کو بھینچ بھینچ کر دل کے ارمان نکالے۔ زندان پیرس پر دھاوا بول دیا۔ بیسٹیل کے دروازے کھول دیئے۔ اور سالہا سال سے محبوس بے گناہوں کو آزاد کیا۔ اس وقت "والٹیئر کی جے" "والٹیئر زندہ باد" کے نعرۂ جنگ سے فرانس کے زمین و آسمان گونج رہے تھے +

والٹیئر کو خراج عقیدت

۱۷۹۱ء میں اجازت دی گئی۔ کہ والٹیئر کی ہڈیوں کو پیرس کے شاہی قبرستان میں دفن کیا جائے۔ ایک وقت تھا کہ چوری چھپے اُسے پیرس سے ایک سو دس میل کے فاصلہ پر دفن کیا گیا۔ اور آج فرانسیسی قوم اُس کی میت کے جلوس میں شامل تھی۔ ہر گاؤں۔ ہر قصبہ۔ ہر قریہ اپنے جھنڈوں اور نشانوں کے ساتھ اس فرانسیسی فلاسفر کے استقبال کو نکلا۔ جلوس ایک سو میل لمبا تھا۔ آخر بیسٹیل کے کھنڈرات پر والٹیئر کو پورے پورے عزت و احترام سے سپرد زمین کیا گیا +

لیکن پادری بھی تاک میں لگے ہوئے تھے۔ رات کی تاریکی میں ہڈیوں کو نکال لے گئے۔ اور اگرچہ قبر خالی رہ گئی۔ لیکن دنیا اس کی شہرت سے گونج اُٹھی۔

ہماری خاک کی بربادیاں ذرا دیکھو
کہاں کہاں سے اُڑی اور کہاں کہاں ٹھہری

(خاص) ریاض بی اے

شریر بیوی
دلچسپ
دیدہ زیب

شریر بیوی
سبق آموز
مجلد و نظر فریب

شریر بیوی
نتیجہ خیز
۸ عہ محصولڈاک معاف

منیجر رسالہ نیرنگ خیال۔ شاہی محلہ لاہور

خان شہید
قاآن ملک سلطان محمدؒ

ازجناب سید حسن برنی بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ علیگ۔ ایڈوکیٹ بلند شہر

ہندوستان کے تین نامور بادشاہوں آتے بک[ع]۔ ایل تتمش اور بلبن نے اپنی زندگی غلامی سے شروع کی آتے بک کو محمد غوری نے خرید تھا۔ (ط ۱۳۸) ایل تتمش کو آتے بک نے (ط ۱۶۸) اور بلبن کو ایل تتمش نے (ط ۲۸۲) تینوں اپنی حسن لیاقت سے ادنیٰ غلاموں کے درجے سے بادشاہی تک پہنچ گئے۔ تینوں نے تجربہ کے مدرسہ میں تعلیم پائی اور تینوں حکمرانی کے دشوار فن میں بڑے کامیاب ثابت ہوئے ۔

ان تینوں بادشاہوں کی شخصیتیں ہندوستان کی تاریخ میں نہایت بلند پایہ رکھتی ہیں لیکن اُن کے مکمل حالات اور سیرتیں ابھی لکھی جانی باقی ہیں ۔

بلبن البری ترکوں میں پیدا ہوا تھا۔ اور اُس کے آقا ایل تتمش کا خاندان بھی انہی ترکوں میں تھا۔ (ط ۱۸۱۲ و ۱۲۵) عین شباب کا زمانہ تھا کہ ترکستان پر مغلوں کی ایک یورش میں وہ اپنے خاندان اور وطن سے جدا ہو گیا اور بغداد کے بازار میں بیچ دیا گیا۔ وہاں سے گجرات لے آئے جہاں خواجہ جمال بصری نامی ایک تاجر نے اُسے خرید کر اولاد کی طرح پالا اور ہونہار دیکھ کر سلطان شمس الدین ایل تتمش کے ہاتھ ۶۳۰ھ میں دہلی لیجا کر فروخت کر دیا۔

بعد میں بلبن کا چھوٹا بھائی کشلی خاں اور ایک چچازاد بھائی شیر خاں بھی اسی بادشاہ کی خرید میں آگئے اور ترقیاں پاکر بڑے بڑے عہدوں پر مامور ہوئے (ط ۲۷۷ - ۲۸۲)

بلبن اپنی ذاتی خوبیوں سے روز بروز بڑھتا گیا یہاں تک کہ ایل تتمش کے نیکدل، گوشہ نشین اور خدا پرست بیٹے سلطان ناصر الدین محمود کے زمانہ میں ۶۴۷ھ نائب السلطنت کے درجہ پر فائز ہو کر بادشاہ کی دامادی اور الغ خاں کے خطاب سے سرفراز ہوا ۔ (ط ۲۱۳ و ۲۹۳) ۔

ناصر الدین کا وقت زیادہ تر عبادت اور تلاوت و کتابت کلام اللہ میں صرف ہوتا تھا۔ سلطنت کا سارا کاروبار بلبن ہی انجام دیتا تھا ۔

جب ناصر الدین کے بعد بلبن تخت پر بیٹھا تو اُس نے اپنی دانشمندی اور تجربہ کاری سے ہندوستان کی سلطنت کو جس میں ایل تتمش کے بعد کمزور بادشاہوں کی وجہ سے بڑی ابتری پھیل گئی تھی سنبھالنا اور مضبوط کرنا شروع کیا۔ اُس نے فتوحات اور لشکر کشی کے خیالات چھوڑ کر سلطنت کے استحکام اور مغربی سرحد کی حفاظت کو اپنا کام قرار دے لیا۔

ہندوستان کو اُس وقت سب سے بڑا خطرہ مغلوں کا لگا ہوا تھا جنہوں نے دنیا میں ہل چل ڈال رکھی تھی۔ صدیوں کے تمدن اُن کے ہاتھوں خراب ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ بغداد کی خلافت عباسیہ کو ہمیشہ کے لئے نیست و نابود کر چکے تھے اور چین اور روس تک اُن کا تسلط ہو گیا تھا۔ ہندوستان بچا ہوا تھا اور اُس پر ہر وقت اُن کی نظر لگی رہتی تھی۔ اور ایک عرصہ تک یہ ملک بھی بڑے خطرے میں گھرا رہا ۔

مغلوں کے استیلا سے ہندوستان کا کیا حشر ہوتا؟ اس کے خیال سے بھی رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ وہ جہاں جاتے تھے اپنے پیچھے کشتوں کے پشتے اور خاکستر کے ڈھیر یا لق و دق میدان اور ویرانے چھوڑ جاتے تھے ۔

[ط] اس مضمون کے قدیم ترین و بہترین مآخذ طبقات ناصری (۶۵۸ھ) تاریخ فیروز شاہی (۷۵۸ھ) اور تصانیف امیر خسرو (غیر مطبوعہ) بالخصوص دیوان وسط الحیوۃ ہیں۔ بنظر اختصار ہم نے طبقات کے صفحات کا حوالہ کے لئے "ط" اور تاریخ فیروز شاہی کے لئے "ف" بطریق علامت مقرر کر دیئے ہیں۔

[ع] ہندوستان کے ترک بادشاہوں کے بعض نام کا تلفظ صحیح نہیں کیا جاتا۔ آتے بک کے نام کا صحیح تلفظ مختلف طور پر کیا گیا ہے اور اُس کے نام کے صحیح معنی اس وقت تک کسی نے بیان نہیں کئے ہماری تحقیقات سے یہ نام آتے بنام ماہ اور بک بمعنی چہرہ سے مرکب اور اُس کا ترجمہ "ماہرخ" یا ماہ رخ ہوتا ہے۔ اس کے لئے ہمارے پاس امیر خسرو کی سند موجود ہے۔ جس پر مفصل بحث کسی اور وقت کیجائے گی ۔

ایل تمش نے چنگیز خاں کی دستبرد سے ہندوستان کو بچائے رکھا۔ اور بلبن نے چنگیز خاں کے جانشینوں سے۔ بلبن کے زمانہ میں منغلوں کا ستارہ اوج کمال پر پہنچا ہوا تھا۔ اور اُن کے ہاتھوں سے ہندوستان کا بچا لینا کوئی سہل کام نہ تھا۔ بلبن کو اس میں انتہائی کوششوں سے کام لینا پڑا یہاں تک کہ اسی میں اُسے اپنی آنکھ کا تارہ اور اُمیدوں کا سہارا بھینٹ چڑھانا پڑا +

بلبن کا وہ بڑا بیٹا تھا۔ زندگی میں اُس کا نام محمد سلطان اور خطاب قاآن ملک تھا لیکن تاریخ میں وہ خان شہید کے لقب سے مشہور ہے (ف ۶۶)

بلبن کے صرف دو بیٹے تھے۔ چھوٹے بیٹے کا نام محمد سلطان خطاب بغرا خاں اور لقب ناصر الدین تھا۔ اپنی زندگی میں بلبن نے اُسے لکھنوتی (بنگال) کا حاکم مقرر کر دیا تھا۔ بلبن کے بعد اُس نے بنگال میں آزاد حکومت قایم کر لی۔ اور عرصہ تک اُس کا خاندان وہاں حکومت کرتا رہا +

تمام تاریخی شہادتیں متفق ہیں کہ یہ دونوں لڑکے بڑے شایستہ اور تعلیم یافتہ تھے۔ بلبن نے اُن کی تعلیم و تربیت میں بڑا اہتمام کیا تھا وہ منصب شاہی و حکمرانی کے متعلق بڑے اونچے خیال رکھتا تھا۔ اور چاہتا تھا کہ اپنے بیٹوں کو ہر طرح اُس کا اہل بنا دے۔

بڑا بیٹا اپنی خوبیوں میں یکتائے زمانہ سمجھا جاتا تھا۔ اور اُس کی ذات سے بادشاہ اور رعایا کو بڑی بڑی اُمیدیں تھیں۔ مورخ ضیائے برنی لکھتا ہے :۔

"وہ نہایت آراستہ و پیراستہ شخصیت رکھتا تھا اور جہانبانی کی لیاقت اُس کی پیشانی میں چمکتی تھی۔ ایل تمش کے کئی ذی اقتدار غلاموں نے جو خاندان کبار میں شمار ہوتے تھے۔ اپنے بیٹوں کے نام محمد رکھے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی خوبی میں مشہور ہوا۔ مثلاً محمد کشلو خاں جسے ملک علاء الدین بھی کہتے تھے فیاضی اور خیرات میں اپنے وقت کا حاتم ثانی تھا۔ محمد ارسلان خاں جسے تتر خان کہتے تھے اور بعد میں لکھنوتی میں بادشاہ ہو گیا تھا۔ عالی ہمتی، سخاوت اور بہادری میں مشہورۂ آفاق تھا +

لیکن سلطان بلبن کا بیٹا محمد ان سب سے زیادہ با ادب اور مہذب تھا۔ سلطان اُسے اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا +

سلطان محمد مذکور کی مجلس دانشمندوں، معتبر لوگوں، فاضلوں اور ہنرمندوں سے بھری رہتی تھی۔ اُس کے صاحب اُس کے سامنے شاہنامہ۔ دیوان سنائی، دیوان خاقانی اور خمسۂ شیخ نظامی پڑھتے اور اُن کے اشعار پر بحث کرتے رہتے تھے" (ف ۶۶-۶۷)

ماں کی طرف سے محمد سلطان اور اُس کے بھائی کا نسبی سلسلہ ایل تمش اور آئے بک تک پہنچتا تھا۔ اور اُن کی رگوں میں تین بڑے بادشاہوں کا جنہوں نے اپنی ذاتی لیاقت سے تخت سلطنت حاصل کیا تھا خون بہتا تھا +

ابتدائی زمانہ سلطنت میں سلطان محمد کو کول (جسے اب علی گڑھ کہتے ہیں) اور اُس کے قرب و جوار کے علاقے جاگیر میں ملے ہوئے تھے۔ (ف ۶۶)

لیکن کچھ ایسے حالات پیش آئے جن کی وجہ سے بالآخر بادشاہ کو سلطنت کی سب سے بڑی اور سب سے خطرناک خدمت اپنے اس چہیتے بیٹے کو دینی پڑی +

ہندوستان کی مغربی سرحد کی حفاظت ایلتمش کے بعد سے بلبن کے چچا زاد بھائی شیر خاں کے سپرد تھی۔ اور ناصر الدین محمود کے وقت سے سُنام، لاہور، دیپالپور اور منغلوں کی درآمد کے تمام علاقے سب اُسی کے سپرد تھے[۵] +

وہ ایک بڑا آزمودہ کار اور جری سپہ سالار تھا۔ اُس نے ۳۰-۳۵ برس سے منغلوں کے دانت کھٹے کر رکھے تھے۔ اور ہندوستان کی سرحد پر سدِ سکندری کھینچ رکھی تھی۔ اُس کے حسن انتظام، شجاعت، قوت، شوکت اور متعدد کثیر لشکر کے خوف سے منغلوں کی ہمت نہ ہوتی تھی کہ ہندوستان کی سرحد کا خیال بھی دل میں لے آئیں۔ اُس نے غزنیں تک سلطان ناصر الدین محمود کا خطبہ پڑھوا دیا تھا +

سلطنت کی طمع اور خود غرضی ہوشیار سے ہوشیار بادشاہ کو بھی شک و شبہ اور بے اعتباری میں گرفتار کر کے بعض اوقات بالکل اندھا بنا دیتی ہے۔ شیر خاں بلبن کا چچیرا بھائی تھا۔ اور دہلی کی سلطنت کا بڑا قوی بازو سمجھا جاتا تھا۔ لیکن خون کا میل اور ذاتی لیاقت سلطنت کے معاملات میں جہاں بادشاہ کی اپنی غرض شامل ہو۔ بہت کم کارآمد ہوتے، بلکہ اکثر اوقات

اے روشنی طبع تو بر من بلا شدی

کا مصداق ثابت ہوتے ہیں۔ شیر خاں ایک گرگ باراں دیدہ تھا۔ ایل تمش کے بعد جو انقلابات تاج و تخت دہلی میں پیش آتے رہے اور اُن کی وجہ سے سلطنت کے عہدہ داروں پر جو افتادیں پڑتی رہیں اُنہیں دیکھ کر وہ اپنی ولایت سے ہٹ کر دہلی نہیں گیا۔ اُسے ڈر تھا کہ کسی بہانہ سے اُسے بھی ختم کر دیا جائے گا۔ جب بلبن بادشاہ ہوا تب بھی وہ اپنے مرکز سے نہ ہلا۔ بلبن کی سلطنت کو جب چار پانچ برس گذر چکے تو اُسے شیر خاں کی فکر ہوئی۔ اُس زمانہ کے معتبر لوگوں کا بیان ہے کہ اُسے بادشاہ نے زہر دلوا دیا +

بھٹنڈہ اور بھٹنیر کے حصار اسی شیر خاں نے بنوائے تھے۔ اور بھٹنیر ہی میں ایک بڑا اونچا گنبد بھی تعمیر کرایا تھا (ف ۶۵-۶۶)

قدرت بھی انتقام لینے میں بہت کم چوکتی ہے۔ شیر خاں کو مار کر بلبن نے اپنی سلطنت اور اپنے خاندان کا استحکام و حفاظت چاہی تھی۔ لیکن اس خون ناحق نے اس کی سلطنت کی جڑیں کھوکھلی کر دیں۔ اور کچھ عرصہ بعد اس کا خاندان بھی ہندوستان میں ہمیشہ

---

[۵] شیر خاں کے حالات کے لئے دیکھو ط ۲۷۷ اور ف ۶۵-۶۶ +

کے لئے نیست ونابود ہوگیا +

شیر خاں کا بدل ملنا محال تھا۔ کار آمد آدمی بڑی مشکل سے بنتا ہے۔ اُس کے بعد اُس کی ولایت کا انتظام کئی کئی امیروں کے سپرد ہوا۔ لیکن مغل ان میں سے کسی کو خاطر میں نہ لائے اور یورشوں پر یورشیں کرنے لگے۔ اور سرحد کا سنبھالنا بڑا کٹھن کام ہوگیا۔ (ف ٦٥-٦٦)

بلبن ایک عرصہ تک تو ملک کے انتظام میں لگا رہا۔ مگر جب اُسے چھٹکارا ملا تو سرحد کی فکر پیدا ہوئی اور اس تہوار ہم کے لئے اُس کی نظر اپنے بڑے بیٹے پر پڑی۔ چتر دیکر اُسے ولیعہد مقرر کیا اور تمام سندھ کا ملک اُس کی جاگیر میں دے کر بہت سے علماء اور اہل کمال اُس کے ساتھ کئے۔ (ف ٦٦)

ملتان میں شاہزادہ کا مستقل قیام ہوا۔ تو اُس کی زندگی نہایت مصروفیت سے گذرنے لگی۔ وہ رزم و بزم دونوں میں یکساں کمال رکھتا تھا۔ اور اُس کی دونوں قسم کی مصروفیتیں ادب میں اپنی یادگاریں چھوڑ گئی ہیں +

ملتان میں پانچ برس تک اس کے ندیموں میں امیر خسرو اور امیر حسن بھی نوکر رہے۔ ضیائے برنی لکھتا ہے :-

"امیر خسرو اور امیر حسن اُس کی خدمت میں ملازم تھے۔ اور پانچ برس تک ملتان میں اس کی خدمت کرتے رہے۔ شاہزادہ انہیں تنخواہ کے علاوہ انعامات دیتا رہتا تھا اپنی دانشمندی سے اُس نے چند ہی مجلسوں میں ان دونوں شاعروں کی خوبیوں۔ لطائف اور دانش و ہنر کو خوب پرکھ لیا تھا۔ اور اپنے سب ندیموں میں اُنہیں زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ اُسے ان کی نثر و نظم پسند تھی۔ دونوں کو اپنا مخلص بنا لیا۔ اور اُن پر سب ندیموں سے بڑھ کر لطف کرتا۔ اور زیادہ انعامات اور بہترین کپڑے دیتا رہتا تھا"۔ (ف ٦٧)

محسن شاہزادہ کی یاد ان دونوں کے دل سے کبھی محو نہیں ہوئی۔ مورخ مذکور نے اُس کے اوصاف ان دونوں شاعروں سے اس طرح بیان کئے تھے :-

"ایسا مؤدب اور مہذب شاہزادہ جیسا کہ خان شہید تھا۔ بہت کم دیکھنے میں آیا ہے۔ اگر تمام دن اور رات وہ مسند امارت و منصب فرمان دہی پر بیٹھا رہتا تو بھی زانو سے ادب نہ اُٹھاتا۔ کبھی ایسے موقعوں پر ہم نے اُسے بے تکلف بیٹھے نہیں دیکھا۔ مجلس شراب یا کسی مجلس میں لغو کہتے یا گالی دیتے نہیں سُنا۔ شراب صرف اتنی پیتا تھا کہ مست و بیخود نہ ہوسکے۔ اُس کی قسم "فقط" "حقا" تھی +

شیخ عثمان ایک بزرگ ملتان میں آئے۔ تو خان شہید اپنے حسن اعتقاد کے باعث اُن کے ساتھ انتہائی تواضع سے پیش آیا۔ اور بہت کچھ اُن کی خدمت میں نذرانے پیش کئے اور چاہا کہ وہ وہیں رہ جائیں۔ اور اُن کے لئے ملتان میں ایک خانقاہ بنا دی جائے اور گاؤں دیئے جائیں لیکن شیخ عثمان ٹھہرنے کے لئے راضی نہ ہوئے +

ایک دن خان شہید نے شیخ مذکور اور شیخ قدوہ پسر حضرت شیخ بہاؤ الدین ذکریا کو اپنی مجلس میں مدعو کیا۔ اور عربی غزلیں سماع فرمائیں۔ وہ اور دوسرے درویش حالت وجد میں رقص کرتے تھے۔ خان شہید بھی جبتک کہ درویش سماع و رقص میں مشغول رہے برابر دست بستہ کھڑا رہا اور زار و قطار روتا تھا +

خان شہید کی مجلس میں اگر شعرائے گذشتہ کا کلام جس میں وعظ اور نصیحتیں ہوں پڑھا جاتا تو وہ اُس کی سماعت کو دوسری مصلحتوں پر ترجیح دیتا اور بڑے اعتقاد کے ساتھ سنتا اور بہت روتا تھا۔ تمام حاضرین مجلس اس کی فہم و نرم دلی سے حیران و متعجب رہ جاتے تھے +

اپنی وفور دانش کے باعث اُس نے دو مرتبہ شیخ سعدی کو بلانے کے لئے ملتان قاصد اور آدمی بھیجے۔ اور شیخ کے لئے شیراز میں خرچ بھی بھیجا۔ اُس کی تمنا تھی کہ وہ ملتان چلے آئیں اور اُن کے لئے ایک خانقاہ بنا کر بہت سے گاؤں وقف کر دیئے جائیں۔ خواجہ سعدی ضعف پیری کی وجہ سے نہ آسکے اور دونوں مرتبہ اپنی غزلوں کا ایک ایک سفینہ اپنے قلم سے لکھ کر بھیجدیا اور آنے سے معذرت لکھ بھیجی"۔ (ف ٦٧-٦٨)

امیر خسرو اور امیر حسن کہا کرتے تھے "واحسرتا اگر ہماری اور دنیا کے دوسرے ہنرمندوں کی قسمت ہوتی تو خان شہید زندہ رہتا' اور بلبن کے تخت پر بیٹھتا اور تمام اہل علم اور ہنرمندوں کو اپنی فیاضی سے مالامال کرتا۔ (ف ٦٨)

مورخ کے بیان کی تصدیق امیر خسرو کی کتابوں سے بھی ہوتی۔ اپنے تعلق کا تذکرہ دیوان غرۃ الکمال کے دیباچہ میں اس طرح لکھا ہے۔ کہ پہلے میں سلطان محمود بغراخان کے یہاں دو برس ملازم رہا۔ جب سامانہ سے اُسے لکھنوتی بلا لیا گیا۔ تو میں بھی اُس کے ساتھ گیا۔ لیکن اپنے عزیزوں اور وطن کی یاد سے مجبور ہو کر دہلی لوٹ آیا۔ اُسی زمانہ میں قاآن ملک فتح و مرتبہ کے بعد بادشاہ کی خدمت میں دہلی آیا ہوا تھا۔ اور میرے کلام کی تعریف اُس کے کانوں میں پہنچ چکی تھی۔ میں بھی مناسب موقع کچھ کلام موزوں کے اُس کی مجلس میں جا پہنچا۔ شاہزادہ نے اُسے سُنکر بہت پسند فرمایا۔ اور خلعت و صلہ عطا کئے۔ میں نے بھی کمر بندگی باندھلی اور کلاہ ندیمی سر پر رکھی۔ پانچ برس تک ملتان میں اپنے لطائف سے مجلسیں گرم رکھیں +

"ہم دراں شہور بزرگ قاآن ملک از فتح و مرتبہ در رسید۔ و آوازۂ رسیدگی سخنم بدو رسیدہ بود۔ رسید تا از میوۂ پختہ سخنم بر رسد۔ خانہ پختے چنداں کہ بہ بود پیش (بہ بزم) مجلس خاکر خاص قبول افتاد۔ بشرف تشریف و صلہ موصول گشتم۔ کمر بندگی بر میاں بستم و کلاہ ندیمی

پرسر پنج سال دیگر پنج آب ملتان را از بحور لطایف خوانی آب دادم ؛

اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ امیر خسرو اور امیر حسن کا یہ تعلق ۶۷۹ھ یا ۶۸۰ھ میں ہوا ؛

دیوان وسط الحیوٰۃ میں ایک قطعہ شاہزادہ کی تعریف اور فتح و مرطیہ کی مبارکباد میں موجود ہے۔ جو اس وقت کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے جبکہ وہ شہزادہ کی خدمت میں پہلی مرتبہ پہنچے تھے ؛

" نصرت دین محمد شہ فیروز مصاف — اے ہمہ وقت بشمشیر تو فیروزی یار
بندگانت کہ بہ توسنگ مغل بشکستند — چاکراں تو بہ ہر یلہ کشید ند حصار
گفت ہفت اختر و نہ چرخ کہ چشم بد دور — زاں دو بازو کہ بہ دولتش بود دہم کیبار
فتح بر ران براق تو ازاں فتحہ شد — کہ جو ایں ما بدوانی بدو دواو ناچار
باد بر فرق ظفر غاشیۂ دولت تو — فتح دنبال رکاب تو دواں غاشیہ دار "

[(۱) اے نصرت دین، فتحمند محمد سلطان! تیری تلوار کے ساتھ فتحمندی ہر گھڑی لگی ہوئی ہے۔ (۲) تیرے غلاموں نے تیرے ساتھ مغلوں کی عزت خاک میں ملا دی اُنہوں نے ہر جگہ میں ایک حصار کھینچ دیا۔ (۳) سات ستارے اور نو آسمان کہنے لگے چشم بد دور ان دونوں بازؤں سے جن سے دو فتحیں ایک ساتھ ہوتی ہیں۔ (۴) تیرے گھوڑے کی ران پر فتح اس وجہ سے لکھی ہوئی ہے کہ جب تو اُسے دوڑائے تو وہ بھی تیرے ساتھ دوڑتی چلی جائے۔ وہ فتح کے سر پر تیری دولت کا غاشیہ ہے۔ اور فتح تیری رکاب کے پیچھے غلام کی طرح بھاگے گی]

ایک اور نظم بھی جس میں شاہزادہ کی خدمت میں باریاب ہونے کو اپنی خوش نصیبی سے تعبیر کیا ہے اُسی وقت کی معلوم ہوتی ہے:۔

چو بخت روشن من سر بر آسماں آورد — مرا بحضرت شاہزادۂ جہاں آورد
خدا یگانہ ایں روز مے ازلے حاصل — زمانہ حاصل من بیخ بیکراں آورد
چو بخت دید کہ دستم کسے نمی گیرد — گرفت دست من و بر خدا یگاں آورد

[(۱) جب میرے چمکتے ہوئے نصیب نے میرا سر آسمان پر پہنچا دیا۔ تو وہ مجھے شہزادۂ عالم کے حضور میں لے کر آیا۔ (۲) اے خداوند اس دن کے لئے زمانہ نے مجھے بہت کچھ رنج دکھائے۔ (۳) جب نصیب نے دیکھا کہ کوئی میرا ہاتھ نہیں پکڑتا تو میرا ہاتھ پکڑ کر خداوند کے سامنے لے آیا]

وسط الحیوٰۃ میں چند اور نظمیں بھی اُس زمانہ کی یاد دلاتی ہیں جب امیر خسرو ملتان میں رہتے تھے۔ ان نظموں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مغلوں کا خطرہ ہر وقت سر پر رہتا تھا۔ اور شاہزادہ کو ہر وقت مستعد رہنا پڑتا تھا ؛

(۱) منت ایزد را کہ عمر رفتہ از سر باز گشت — واں سر بیع الیسر من زلشکر باز گشت
(۲) کوہ غم برداشت از پیش دلم چوں مژدہ داد — کز غزائے کن خاقان مظفر باز گشت
(۳) نصرت دنیا محمد کز سپہ در کہسار — سدِ آہن بستہ مانند سکندر باز گشت
(۴) کافر بدکیش ہر تیرے کہ سوئے دیں کشاد — سہم تو بارے بجو زد ہم بکافر باز گشت

[خدا کا شکر ہے کہ عمر رفتہ از سر نو لوٹ آئی اور وہ میرا تیز رفتار چاند فوج سے لوٹ آیا۔ (۲) جب میں نے یہ خوشخبری سُنی کہ پہاڑ کی جنگ سے خاقان فتحمند واپس آگیا۔ تو میرے دل کے غم کا پہاڑ دور ہو گیا (۳) نصرت دنیا محمد (سلطان) نے فوج سے کہسار میں ایک لوہے کی دیوار مثل سدِّ سکندری قایم کر دی (۴) مغل نے جو تیر دین پر چلایا اُسی پر تیرا تیر پہنچا اور اُسے لوٹا کر مغلوں پر لے گیا]

ایک اور موقع پر لکھتے ہیں:۔

(۱) گرد ایں سالے مغل با پر بوم دور و بخت شوم — صف کشیدہ چوں کلنگاں از خراساں میرسد
(۲) لیک در وقت گریز از تیغ کشور گیر شاہ — ریزہ ریزہ می شود آنگہ بکرماں می رسد
(۳) ... خاک ملتاں ہر زماں بر آب گرمی شود — چوں سپاہے ہمچو دریائے بملتاں می رسد

[اگر اس برس مغل اُلّو پرندے کی اپنی منحوس صورت لے کر کلنگوں کی طرح خراساں کے ملک سے ہندوستان پر حملہ آور ہوگا تو (۲) بھاگتے وقت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر کیڑوں کی غذا بن جائے گا (یا کرمان کو بھاگ جائے گا)۔ (۳) ملتان کی خاک ہر بار جب دریا کی طرح نئی فوج آتی ہے تو نیا رنگ اختیار کرتی ہے ؛]

ان پانچ برسوں کی بہت سی غزلیں اور نظمیں بھی اس دیوان میں مخلوط ہیں۔ جو اس شاہزادہ کی رنگین مجلسوں اور خوشگوار گھڑیوں کی یاد دلاتی ہیں۔ لیکن تاریخ کے لئے ان سب کو یقین کے ساتھ انتخاب کرنا بہت دشوار ہے ؛

الغرض شاہزادہ کے ایام اسی طرح رزم و بزم میں گزرتے تھے۔ اُس کا معمول تھا کہ ہر سال خزانہ و پایگاہ لے کر باپ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور ہزار و انعام لے کر واپس ہو جاتا۔ (ف ۷۶)

سب سے اخیر مرتبہ جب شاہزادہ اپنے باپ سے ملنے گیا تو باپ نے اُسے خلوت میں طلب فرما کر بہت سی وصیتیں کیں جو سلطنت کے کاروبار میں کام آ سکیں۔ اور شاہزادہ کے قلم سے لکھوائیں۔ آہ! دونوں گردش فلک سے بے خبر تھے۔ کہ اس کے بعد وہ پھر کبھی نہ مل سکیں گے۔ اور بوڑھے باپ کو اپنے لائق بیٹے کی مفارقت دائمی کا داغ اپنی زندگی میں اٹھانا پڑے گا ؛

مورخ ضیاء برنی نے ان نصیحتوں کو بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ زبانی روایتوں سے ماخوذ ہیں یا شاہزادہ کا لکھا ہوا وصیت نامہ

محفوظ تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ وصایا بلبن کی طرف ۔۔ منسوب کر دیئے گئے ہوں لیکن اس میں شبہ نہیں ہوسکتا کہ وہ اس دور کے مسلمان سلاطین ہند کے تصوّرات ملک داری کو پیش کرتے ہیں ۔

بادشاہ نے اپنے بیٹے سے کہا کہ یہ نصیحتیں دو قسم کی ہیں۔ ایک وہ جو میں نے ایلتمش کی مجلس میں اُن بزرگوں سے جو اپنی مثال نہیں رکھتے تھے سُنی ہیں اور اُن پر عمل کرنا بہت مشکل ہے اور دوسری وہ نصیحتیں ہیں جن پر ہم بھی عمل کر سکتے ہیں ۔

قسم اوّل کی نصیحتیں یہ ہیں کہ جب تو تخت پر بیٹھے تو جہانداری و جہانبانی کو آسان کام نہ سمجھنا۔ بادشاہوں کا دل منظر ربّانی ہے اور عام و خاص مخلوق کے کاروبار بادشاہ کے دل و زبان سے پورے ہوتے ہیں۔ اگر بادشاہ حکومت کو امر بزرگ نہیں سمجھتا یا اُس کی قدر و قیمت نہیں جانتا اور اپنے آپ کو اُس کا اہل ثابت نہیں کرتا تو اُس کی ساری عزّت و عظمت خاک میں مل جاتی ہے۔ بادشاہ کے لئے واجب ہے کہ وہ کمینوں اور ناخداترسوں کو شاہی کاروبار میں دخل نہ دے۔ بلکہ اپنے عہدہ دار پرہیزگار دیندار خداترس حق شناس مقرر کرے ۔ جو مکّاری، زیاں کاری، غداری، بددیانتی سے دور رہیں۔ الناس علیٰ دین ملوکہم کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے۔ اگر ملازمان شاہی عدل و انصاف خیرات و حسنات فضائل و نیکوکاری خداترسی و دینداری، طاعت و عبادت اور صدق و امانت کی طرف مائل ہونگے تو تمام اہل ملک بھی ان نیک کاموں میں اُن کا اقتدا کریں گے۔ اگر ان کے خصائل ان کے خلاف ہوں گے تو وہی حال رعایا کا ہوگا۔ بادشاہ اور رعایا کو آرائش ظاہر سے بڑھکر آرائش باطنی کی طرف مایل ہونا چاہیئے ۔

"اے فرزند دلبند نعمت بادشاہی کے یہ حقوق پورے طور پر عمر خطاب رضہ اور عمر بن عبدالعزیز نے ادا کئے۔ ہم غلاموں کا اتنا حوصلہ کہاں کہ ہم ایسا کرسکیں"

دوسری قسم کی نصیحتیں اس طرح بیان کیں کہ بادشاہ کو حشمت و عظمت بادشاہی کو جسے وہ خدا کی نیابت سے تعبیر کرتا ہے، ہر وقت اور ہر حال میں ملحوظ رکھنا چاہیئے حتیٰ کہ گھر والوں کے ساتھ بھی۔ جو شخص اپنے گھر میں ہلکا ہے وہ باہر بھی ہلکا ہوگا۔ ("ہرکہ در خانہ سبک نماید بیروں ہم سبک نماید") بادشاہی اور ہیبت لازم و ملزوم بلکہ ایک ہی چیز ہیں ("بادشاہی ہیبت محض است") اسی طرح بادشاہی عدل سخاوت اور شہامت و بزرگ منشی کو کہتے ہیں ۔ بادشاہی چند چیزوں سے قایم ہے اور وہ عدل، احسان، فوج، نوکر، خزانہ، چیدہ و برگزیدہ مددگار اور رعایا کا اعتماد ہیں۔ رعایا کا اعتماد اُسی بادشاہ پر ہوتا ہے۔ جو عدل و احسان سے کام لیتا رہے۔ ورنہ ظلم و تعدی پھیلکر رعایا میں نفرت پیدا ہو جاتی اور پادشاہی میں خلل آجاتا ہے۔ سلطنت کے کارکنوں کے انتخاب میں بہترین آدمیوں کو لینا چاہئے ۔ اور سفارشیوں اور چغل خور و نکو دخل نہ دینا چاہئے۔ ورنہ لوگوں میں بے اطمینانی پیدا ہوجائے گی اور امان کا خیال دلوں سے جاتا رہیگا، بلکہ خوف و ہراس پیدا ہو جائیں گے ۔

بادشاہ کو چاہئے کہ ہر مہم پر خوب غور کرے ۔ تاکہ ناکامی کے باعث رسوا نہ ہونا پڑے۔ اس لئے کہ بادشاہی عزت ہی سے قایم ہے ("بادشاہی ہمہ عزّت است") اور خواری و بیمقداری کی تاب نہیں لاسکتی۔ بادشاہ کو ذاتی طور پر صرف اُن مہموں میں حصہ لینا چاہئے جو دوسرے انجام نہ دے سکیں ۔

بادشاہ کو خود رائے نہیں ہونا چاہئے اور بغیر مشورہ کئے کسی مہم کو شروع نہیں کرنا چاہئے ۔ میر وہی لوگ بنائے جائیں جو صاحب تجربہ صاحب فراست۔ دور اندیش اور عاقبت بیں ہوں۔ بادشاہ کو اپنے خاندان والوں، ملازموں، فوج و رعایا سے کسی وقت غافل نہیں رہنا چاہئے۔ ملک داری کا سب سے بڑا فرض نیک و بد خلق سے باخبر رہنا ہے جس کے بغیر بادشاہی ناممکن ہے۔ آمدنی و خرچ کی بھی خبر رکھنی چاہئے ۔ اور ضرورت کے موقعوں کے لئے نصف خزانہ محفوظ رہنا چاہئے ۔ اسراف سے پرہیز کرنا چاہئے اور لشکر رعایا و تجّار کو آسودہ و خوشحال رکھنا چاہئے ۔ اور بدکاریوں کو روکنے اور نیک کاموں کو ترقی دینے میں ہر وقت ساعی رہنا چاہئے ۔

رعایا کے معاملوں میں میانہ روی سے کام لینا چاہئے، نہ تندی و بدخوئی و قہر سلطنت سے ہی کام لیا جائے کہ لوگ متنفر ہو کر رہ جائیں۔ نہ اتنی نرمی و سہل گیری و آسان گزاری سے کہ متمرّد و باغی ہو کر فساد پیدا کرنے لگیں۔ بلکہ وقار و سکون سے کام لیا جائے اور محافظوں کے انتخاب میں احتیاط کی جائے ۔

اخیر میں بلبن نے کہا "اپنے چھوٹے بھائی پر مہربان رہنا کسی کی بدگوئی اُس کے حق میں نہ سننا بلکہ اُسے اپنا دست و بازو سمجھنا۔ اور جس ملک پر مقرر کرو اُسے برقرار رکھنا۔ میرے تم صرف دو بیٹے ہو۔ دیکھو ایسا نہ ہو کہ بلبن کی نسل تباہ ہو کر رہ جائے"

(ف ۷۶-۸۰)

ان وصایا پر غور کرنے سے معلوم ہوسکتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمان سلاطین کن اصولوں پر سلطنت چلاتے اور اُن کے بہترین بادشاہ سلطنت کے فرائض و ذمہ داریوں کے متعلق کس قسم کے تصورات رکھتے تھے۔ کیا انہیں دیکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ محض جور و جبر کے ذریعہ سے حکومت کرنا جانتے تھے ۔ اور سلطنت کے گہرے مانزوں سے بے خبر تھے ؟ ہمارے مورخوں نے بہت کم ان چیزوں کے بیان کرنے میں دلچسپی لی ہے اور بدقسمتی سے وہ جنگی اور درباری حالات پر اکتفا کرنے کے عادی ہوگئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیشہ مسلمان

بادشاہوں کی تاریخ ہدفِ ملامت بنی رہتی ہے۔ حالانکہ ایل تتمش، بلبن، فیروز خلجی۔ غیاث الدین تغلق اور بابر سے لے کر اخیر تک اکثر مغل سلاطین ایسے بادشاہ تھے جن کی ملک داری بڑی ستایش کی مستحق ہے +

یہ سب وصیتیں بیکار تھیں، بہت جلد وہ ساعت آنے والی تھی جب ہونہار شاہزادہ کا شمار مُردوں میں ہونے والا تھا +

وہ باپ سے رخصت ہو کر ملتان چلا آیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت سرحد کی حالت بہت خطرناک تھی۔ بلبن نے دوسرے بیٹے کو سامانہ میں متعین کرکے ہدایت کی کہ وہ بھی مغلوں کی جواب دہی کے لئے ہر وقت مستعد رہے۔ چونکہ بغرا خاں اتنا لائق نہ تھا جتنا کہ محمد سلطان، باپ نے اُس سے کہا کہ کاموں میں جلدی نہ کرنا۔ مشیروں اور کاردانوں سے مشورہ کرتے رہنا۔ بلکہ مشکل کاموں میں مجھ سے مشورہ لے لیا کرنا۔ اور شراب پینا چھوڑ دینا۔ اقطاعِ سامانہ بہت بڑے ہیں اور وہاں بہت سی کارآمد فوج بھی موجود ہے اگر شراب نہ چھوڑی اور اپنے اقطاع اور فوج کی خبر نہ رکھی تو معزول کرکے پھر کبھی کوئی جاگیر نہ ملیگی اور بیکاروں میں ڈال دیئے جاؤ گے۔ بادشاہ نے مخبر لگا دیئے اور بیٹے کی جانچ میں بڑی کوشش کی۔ وہ بھی یہ حال دیکھ کر ٹھیک ہوگیا۔ (ف ۸۱)

اُس زمانہ میں مغلوں کے سوار دریائے بیاس سے گذر کر بلبن کے علاقے میں یورشیں کرتے رہتے تھے۔ سامانہ سے بغرا خاں، ملتان سے محمد سلطان اور دہلی سے ملک اختیار الدین بیگ ترس باربکِ سلطانی دریائے بیاس تک ان کا پیچھا کرتے اور سلطنت کی سرحد سے باہر کر دیتے تھے۔ ان تینوں لشکروں کا اندازہ صرف سترہ اٹھارہ ہزار سے زیادہ نہیں تھا! (ص ۸۱)

بلبن کی حکومت کو پندرہ سولہ برس گذرے تھے کہ بنگال میں اُس کے عامل طغرل نے بغاوت کی جس نے بڑا طول کھینچا۔ اور اُس کے فرو کرنے کے لئے بالآخر خود بلبن کو جانا اور سامانہ سے بغرا خاں کو بلا کر بنگال کا حاکم مقرر کرنا پڑا۔ (ف ۸۱-۹۲) بادشاہ نے اُسے رخصت کرتے وقت بہت سی قیمتی نصیحتیں کیں اور دار السلطنت کو لوٹ آیا۔ (ف ۹۲ - ۱۰۶)

ضیائے برنی لکھتا ہے کہ اس مہم کے بعد بلبن کی سلطنت کو غیر معمولی استقامت حاصل ہوگئی۔ اور اُس کا دل تمام ملکی مہموں سے فارغ ہوگیا اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی مخالف باقی نہیں رہا (ص ۱۰۹)

لیکن ہر زوالے را کمالے۔ اندر کا خطرہ مٹ چکا تھا لیکن باہر کا خطرہ بلبن کے اختیار سے باہر تھا۔ مغل ہندوستان پر آنکھ لگائے بیٹھے تھے۔ اور ہندوستان کی تسخیر کے خیال میں بہت کچھ نقصان اُٹھا چکے تھے۔ وہ نہ خود چین سے بیٹھنا جانتے تھے۔ نہ بلبن کو آرام لینے دیتے تھے۔ آخر ۶۸۳ھ میں ہلاکو کے پوتے ارغوں خاں کے ایک منچلے امیر نے جس کا نام تیمور خاں تھا۔ اور جس کے تحت میں اُس وقت ہرات، قندھار، بلخ، بدخشاں، غزنیں، غور اور بامیان کے علاقے تھے۔ بیس ہزار سوار لے کر لاہور اور دیبالپور کے درمیان لشکر کشی کی +

جوانمرد سلطان محمد کو جب یہ خبر ملی تو فوراً مدافعت کے لئے کمربستہ ہوگیا۔ اور اس بات کی کچھ پرواہ نہ کی کہ اُس کے پاس اتنی فوج نہ تھی۔ جو مغلوں کے مقابلہ کے لئے کافی ہوتی +

یہ معرکہ ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ اُس کی آواز بازگشت تاریخ اور ادب میں آجتک گونجتی ہے۔ گو ہندوستان کی حفاظت میں یہ نوجوان شاہزادہ کام آیا لیکن اپنا ایسا نام چھوڑ گیا جس سے وہ ہماری تاریخ میں ایک نامور ہیرو کی حیثیت رکھتا ہے +

اس جنگ کے حالات مورّخ ضیائے برنی نے تفصیل سے نہیں لکھے۔ اور صرف اتنا لکھ کر چھوڑ دیا ہے کہ "مشہور ۶۸۴ھ (صحیح اخیر ۶۸۳ھ) میں خان ملتان کا جو کہ سلطان بلبن کا بڑا بیٹا اور ولیعہد اور اُس کے ملک کی پشت و پناہ تھا۔ لوہور (لاہور) اور دیوبالپور کے درمیان تمرملون سے جو چنگیز خانی کتوں میں ایک عجیب کتا تھا مقابلہ و مقاتلہ ہوا۔ اور قضائے و قدر باری تعالیٰ سے خان ملتان اور امرا و سرداران لشکر اس محاربہ میں قتل ہو گئے"۔ (ف ۱۰۹)

لیکن بہترین واقعات امیر خسرو کی بعض نظموں سے جو انہوں نے اس حادثہ کے متعلق لکھی ہیں، معلوم ہوتے ہیں +

جمعہ کا دن تھا، اور ماہ ذی الحجہ ۶۸۳ھ کی اخیر تاریخ (مطابق ۹ مارچ ۱۲۸۵ء) کہ ملتان میں اس یورش کی خبر پہنچی۔ بہادر شاہزادہ فوراً دن چڑھے اپنے تھوڑے سے لشکر کو جو وہاں موجود تھا لیکر روانہ ہوا۔ اور دوپہر کو دریا کے کنارے نمازِ ظہر کے وقت پہنچا۔ دوپہر سے شام تک بڑی سخت لڑائی ہوتی رہی۔ اور فتحمندی کی اُمیدیں نظر آتی تھیں یہانتک کہ دن چھپ گیا۔ لیکن لڑائی ختم نہ ہوئی۔ شاہزادہ فوج کے ایک حصہ کو صحرا میں چھوڑ کر اور ایک حصہ کو اپنے ساتھ لے کر غالباً مغلوں کے تعاقب میں دریا کو عبور کر رہا تھا اور رات ہوچکی تھی کہ لڑائی کی میزان پلٹ کر رہ گئی۔ اور شاہزادہ بیچ دریا میں زخمی ہو کر مارا گیا۔ اور اُس کے اکثر ساتھی بھی مارے گئے +

ضیائے برنی لکھتا ہے کہ اس واقعہ کا بلبن کی سلطنت پر بڑا بُرا اثر پڑا۔ بہت سے تجربہ کار فوجی کام آئے۔ ملتان میں ہر مکان میں مصیبت تھی اور ماتم تھا۔ تمام لوگوں نے نیلا لباس اختیار کر لیا۔ لوگوں کا شور و شغب آسمان تک پہنچا تھا۔ دار السلطنت کی بھی

یہی حالت ہوئی۔ بلبن کو جب اس حادثہ کی خبر پہنچی تو اُس کی کمر ٹوٹ کر رہ گئی۔ ہر چند اپنے آپکو سنبھالتا تھا۔ اور لوگوں پر اپنا صبر و ضبط ظاہر کرنا چاہتا تھا۔ لیکن روز بروز حالت خراب ہوتی جاتی تھی۔ دن بھر ملکداری کے کاموں میں لگا رہتا تو رات بھر آہ و زاری میں مصروف رہتا۔ کپڑے پھاڑتا اور خاک میں تڑپتا تھا (ف ۱۰۹-۱۱۰)

اس لڑائی میں امیر خسرو بھی شریک تھے۔ اور مغلوں کے ہاتھ میں گرفتار ہوگئے۔ اور بڑی تکلیف اُٹھائی۔ اور خوش قسمتی سے کسی طرح چھوٹ کر آ گئے۔ ان واقعات کا اُن کی ذکی الحس طبیعت پر بہت گہرا اثر پڑا تھا۔ اُنہوں نے متعدد نظمیں اس واقعہ کے متعلق لکھی ہیں۔ جو دیوان وسط الحیوۃ میں درج ہیں۔ ان میں وہ ترجیع بند جو شاہزادہ کے مرثیہ میں لکھے ہیں۔ ایسی نظمیں ہیں جن کی نظیریں ہندوستان کے فارسی ادب میں کیا شاید دنیا بھر کے ادب میں ملنا دشوار ہیں۔ کلیجے کے ٹکڑے ہیں جو کاغذ کے صفحوں پر بکھیر دیئے گئے ہیں۔ لفظوں سے آگ کے شعلے بھڑکتے ہیں اور خون ٹپکتا ہے۔ اس حادثہ کی یہ بہترین ادبی اور تاریخی یادگاریں ہیں۔ ضیائے برنی نے سچ لکھا ہے کہ ان کی تصنیف میں امیر خسرو نے جادوگری سے کام لیا ہے۔ ان کا ایک ایک لفظ پڑھے جانے کے قابل ہے۔ ہم نے جو انتخاب پر اکتفا کی ہے وہ صرف اپنے مضمون کو طوالت سے بچانے کے لئے ۔

پہلی نظم میں گیارہ بند ہیں اور اُس کا نام امیر خسرو نے "نعت الغزا" رکھا تھا:-

"بس کہ از خونِ شہید انست نقش ایں سریر
نام ایں نعت الغزا گفتہ فی نعت الغزا

پہلا بند اس طرح شروع ہوتا ہے :-

واقعہ است ایں یا بلا کز آسماں آمد پدید
آفت است ایں یا قیامت در جہاں آمد پدید

[یہ واقعہ ہے یا بلا ہے جو آسمان سے ظاہر ہوا ہے۔ یہ آفت ہے یا قیامت ہے جو دنیا میں دکھائی دے رہی ہے]

راہ دُر بنیاد عالم داد سیل فتنہ را
رخنہ کامسال در ہندوستان آمد پدید

[ہندوستان میں اس سال جو رخنہ نمودار ہوا ہے۔ اُس نے ایک ایسا سیلاب فتنہ پیدا کر دیا جس نے دنیا کی بنیادیں خراب کر ڈالیں]

مجلس یاراں پریشاں شد ز باد تند دہر
برگریزی گوئی اندر گلستاں آمد پدید

[دوستوں کی مجلس دنیا کی ہوا کے تیز جھونکے سے ایسی ابتر ہوئی کہ گویا باغ میں پت جھڑ ہونے لگی]

مردماں بودند تاثیر قِراں را منتظر
اینک اینک خسرو آثار آں آمد پدید

[لوگ ستاروں کے یکجائی کا اثر دیکھنے کے لئے انتظار کر رہے تھے۔ دیکھا خسرو اب اس کے آثار ظاہر ہوگئے]

من نخواہم جز ہماں جمعیت و ایں کے شود
خود خیالست ایں نبات نعش پروین کے شود

[میں اس جماعت کے سوا اور کچھ نہیں چاہتا۔ لیکن یہ محض خیال ہے بھلا نبات النعش کے منتشر ستارے پروین کی طرح یک جا کیسے ہو سکتے ہیں]

دوسرے بند میں شاہزادہ کی لشکر کشی کی یاد ہے :-

تا چہ طالع بُد کہ شاہ از مولتاں لشکر کشید
تیغ کافر کش برائے کشتن لشکر کشید

[وہ کیا بُری گھڑی تھی جب شاہزادہ نے مولتان سے فوج کشی کی اور اپنی کافر کش تیغ کو ایک فوج کے قتل کے لئے نکالا]

چوں خبر کردنش از دشمن باں قوت کہ دست
بے محابا خشم در سر کرد و رایت در کشید

[جب اُسے دشمن کی خبر ملی تو باوجود اُس کی قوت کو جاننے کے فوراً وہ غضبناک ہوگیا۔ اور اُس نے اپنا نیزہ اُٹھا لیا]

آنچہ حاضر بود لشکر لشکرے دیگر نہ جُست
زانکہ رستم را نشاید منتِ لشکر کشیدہ

[جو کچھ فوج موجود تھی اُسی پر اکتفا کر کے اور فوج تلاش نہ کی۔ رستم کو فوج کا احسان لینا شایاں نہیں]

یک کشش از مولتاں بیں تا لہاور او فتاد
یعنی اندر عہد من کافر تواند سر کشید

[مولتان سے لاہور تک ایک یورش کر رکھی ہے۔ تعجب ہے کہ میرے عہد میں کافر کو سر اُٹھانے کی ہمت ہوئی]

من نہ آں شیرم کہ شمشیر چو آب و آتشم
از کشش ہر سال شاں در خاک و خاکستر کشید

[کیا میں وہی شیر نہیں ہوں کہ میری پانی اور آگ جیسی تلوار نے اُنہیں ہر برس خاک

اور خون میں ملایا ہے]

آنچناں رنگیں کنم امسال خاک از خون شاں
کز زمیں باید شفق را گونۂ احمر کشید

[اس برس ان کے خون سے زمین کو ایسا رنگین کردونگا کہ زمین سے شفق کو سرخی کا اُبٹنا مانگنا پڑے گا]

او دریں تدبیر و آگہ نے کہ تقدیر فلک
صفحۂ تدبیر را خطِ مشیّت در کشید

[وہ اس قسم کی تدبیر سوچ رہا تھا، اور آسمانی تقدیر سے بے خبر تھا کہ خطِ مشیت اُنے صفحۂ تدبیر کو کاٹ دیا ہے]

غرّۂ سہ شد محرّم نے برو بر کُلّ خلق
چوں بلبلخ اندر گلوئے دشمناں خنجر کشید

[نیا چاند اُس پر کیا تمام دنیا کے لئے محرّم ثابت ہوا۔ جس وقت کہ اُس نے ماہ ذی الحجہ کی اخیر تاریخ میں جس دن کہ نئے برس کا چاند دکھائی دے گا۔ (یا دشمنوں کی پوست کنی کے لئے) ان کے گلے پر چھری پھیری]

آں چہ ساعت بود کہ کافر بر سر لشکر رسید
جُوق بر جُوق آب را بگذشت و ناگہ در رسید

[وہ کیا (بُرا) وقت تھا، جس وقت کہ کافر فوج پر حملہ آور ہوا اور جوق در جوق دریا سے گذر کر معاً آ پہنچا]

تیسرے بند میں میدان جنگ کا نقشہ کھینچا ہے۔ شاہزادہ گھوڑے پر سوار فوج کو اُبھار رہا ہے۔ فوجی باجوں اور گھوڑوں اور آدمیوں کے شور نے صحرا اور دشت و کوہ کو لرزہ براندام کر رکھا ہے۔ گھوڑوں کی ٹاپوں سے چنگاریاں پیدا ہو رہی ہیں۔ اُس وقت کی ہیبت و وحشت، تلواروں کی چمک، تیروں کی بارش، بہادروں کی پیش قدمی اور بزدلوں کی پسپائی کے لئے حیلہ جوئی عجیب خوبی کے ساتھ بیان کی ہیں +

خنگ شہ دیدی و بر گردوں غبار انگیختن
باد پا بر کافراں خاکسار انگیختن

[شاہزادہ کے سفید گھوڑے اور اُس کے آسمان پر گرد اُڑانے کو دیکھا۔ اور تیز رفتار گھوڑا کا فروں پر دوڑانا دیکھا]

از خروش کوس و بانگِ اسپ و آواز سوار
لرزہ در صحرا و دشت و کہسار انگیختن

[ڈھول کی آواز۔ گھوڑوں کی ہنہناہٹ اور سواروں کے شور سے صحرا اور دشت اور کہسار میں لرزہ پڑنا دیکھا]

نعل در آتش نہادن توسنان گرم را
در سم ہر آتشیں نعلے شرار انگیختن

[بھڑکتے ہوئے گھوڑوں کی بے چینی اور ہر سم کے گرم نعل سے چنگاریوں کا اُٹھنا دیکھا]

آں چہ ہیبت بود وقتِ کارزار آراستن
و انچہ وحشت بود گاہ گیر و دار انگیختن

[لڑائی کے لئے تیاریاں ہوتے وقت کیسی ہیبت معلوم ہوتی تھی، اور جب لڑائی ہونے لگی تو کیسی وحشت تھی]

پُردلاں در حملہ از بہر مخالف سوختن
بے دلاں در حیلہ از بہر فرار انگیختن

[بہادر اپنے مخالف پر حملہ کرنے کے لئے تڑپتے تھے اور بُزدل بھاگنے کے بہانے ڈھونڈھتے تھے]

کار شاہ مرد پرور اندراں میدان کار
کار مرداں کردن و مردوں کا را انگیختن بُد

[اُس میدان جنگ میں بہادروں کے سرپرست شاہزادہ کا یہ کام تھا کہ وہ مردوں کے کام کرے اور مُردوں کو اُبھارے]

اندراں میدان کہ فرق از مرد تا نامرد بود
اے بسا کس را کہ لبہا خشک و رو ہا زرد بود

[اُس میدان میں جہاں مرد اور نامرد کا فرق دکھائی دے رہا تھا۔ بہت سے لوگوں کے ہونٹھ سوکھے ہوئے تھے اور چہرے زرد]

چوتھے بند میں لڑائی کا مہیب سین کھینچا ہے :-

روز را تاریکی آمد چوں بہم بر یافتند
زرد شد خورشید چوں خنجر بہ خنجر یافتند

[جب دونوں فوجیں ایک دوسرے سے بھڑیں تو دن تاریک ہوگیا۔ اور جب تلوار دوں سے تلواریں ملیں تو سورج زرد ہوگیا (یہ واقعہ ہے کہ لڑائی دن ڈھلے سے شروع ہو کر رات کے وقت تک رہی تھی)]

کُشتگان اُفتادہ در اطراف آں صحرائے سبز
ہمچو صورتہا کہ در دیبائے اخضر یافتند

[اُس سبز میدان میں مُردے اس طرح پڑے ہوئے تھے جیسے کہ سبز دیبا میں صورتیں

بنی ہوتی ہیں]

یک زماں شمشیر اقبالش نیاسودا ز قتال ‌‌ از زوالِ روز تا شب اندروں روزِ زوال

[اُس تباہی کے دن اُس کی اقبال کی تلوار دن ڈھلے سے رات تک ایک دم کے لئے بھی نہ ٹھیری ٭]

پانچویں بند میں بھی لڑائی کا سین جاری ہے ٭

یا رب آں خوں بود کاندر روئے صحرا می دوید ‌‌ یا بسوئے تشنگاں موجے ز دریا می دوید

[یارب وہ خون تھا جو صحرا میں بہ رہا تھا یا دریا کی ایک موج تھی جو پیاسوں کی طرف دوڑ رہی تھی]

توسناں در خیز و سرہائے سواراں می فتاد ‌‌ مرد را سر می دوید و اسپ را پا می دوید

[گھوڑے اُٹھتے تھے اور سواروں کے سر گرتے تھے۔ مردوں کے سر دوڑتے تھے اور گھوڑوں کے پیر]

ہر کرا از قوتِ دل بازو اندر کار بود ‌‌ راست کردہ تیر سوئے قلب اعدا می دوید

[جس شخص کا دل ٹھکانے تھا اور ہاتھ کام دیتا تھا وہ تیر سیدھا کر کے دشمنوں کے قلب کی طرف دوڑتا تھا]

واں کرا از ضعف درونی دست و پا گم کردہ بود ‌‌ گہ بسوئے آب و گاہے سوئے صحرا می دوید

[جس شخص کا دل کمزور تھا اور ہاتھ پیر پھول چکے تھے وہ کبھی دریا کی طرف اور کبھی صحرا کی طرف دوڑتا تھا]

خان لشکر کش بترتیب صف و آئین جنگ ‌‌ می دوانید اشہب اقبال را تا می دوید

[سپہ سالار لشکر خان (سلطان محمدؒ) صفوں اور لڑائی کا نظام ٹھیک رکھنے میں مصروف تھا اور اپنے اقبالمند گھوڑے کو جہاں تک ہو سکتا تھا دوڑاتا تھا]

باز پس می برد گردوں مو گرفتہ فتح را ‌‌ فتح ہر چند از ملاعیں جانب ما می دوید

[آسمان فتح کو بال پکڑ کر اُلٹا کھینچے لئے جا رہی تھی۔ حالانکہ فتح مخالفوں کی طرف سے ہماری طرف دوڑنا چاہ رہی تھی ٭]

کافر اندر انتظار شب کہ تا بیروں شود ‌‌ ناگہاں میزان ما را پلّہ دیگر گوں شود

[کافر کو رات کا انتظار تھا کہ باہر نکل کر فوراً ہمارے ترازو کا پلّہ پلٹ دے]

چھٹے بند میں رات کے وقت لڑائی کا اخیر سین کھینچا ہے:۔

تا چہ شب بود آں کہ از چرخ آفتاب افتادہ بُو ‌‌ دیو آتش در جہاں می زد شہاب افتادہ بود

[وہ کیسی (منحوس) رات تھی کہ سورج ڈوب چکا تھا، اور شیطان دنیا میں آگ لگا رہا تھا، اور شہاب گر چکا تھا]

گر حسینؓ کربلا را رہ بہ بے آبی فتاد ‌‌ کہ محمدؒ بود کو در آبش آب افتادہ بود

[اگر امام حسینؓ کو کربلا میں بے آبی سے واسطہ پڑا تو محمدؒ سلطان کو پانی میں ٹھکانا ملا]

فوجے اندر آب طوفاں بلا را می گذشت ‌‌ فوج دیگر تشنہ در راہ سراب افتادہ بوُ

[ایک فوج پانی میں ہو کر طوفانِ بلا سے گذر رہی تھی اور دوسری فوج پیاسی سراب کی راہ میں پڑی تھی]

جوز ہندی بد منقش کردہ از شنگرف بود ‌‌ کشتگاں را سر کہ اندر خوں بآب افتادہ بود

[مقتولوں کے خون آلودہ سر پانی میں پڑے ہوئے گویا جوز ہندی (نارجیل) تھے جو نئے شنگرف سے منقش کئے گئے ہوں]

از وداع جاں جراحتہائے دل خوں می گریست ‌‌ در فراق زندگانی تن خراب افتادہ بود

[جان کی جدائی سے دل کے زخم خون روتے تھے اور زندگی کے فراق سے بدن خراب پڑے ہوئے تھے]

نے فزع بود آں قیامت را معین دیدہ ام ‌‌ گر قیامت را نشاں این است بس تن دیدہ ام

[وہ ہیبتناک واقعہ نہ تھا بلکہ فی الواقعہ قیامت تھی۔ اگر قیامت کی یہی حالت ہے تو میں نے اُس کو دیکھ لیا]

ساتویں بند میں جنگ کے تباہ کن نتائج اور شہزادہ کی شہادت پر اظہار غم ہے

دایرات آسماں بیں گردشے پرکار کرد ‌‌ مرکزِ اسلام را سرگشتہ چوں پرکار کرد

[آسماں کے دایروں کو دیکھو کہ انہوں نے کیسی کاری گردش کی ہے کہ اسلام کے مرکز کو پرکار کی طرح سرگشتہ کر دیا ہے]

ذرّہ را دیدی کہ آب چشمہ خورشید برد ‌‌ سنگ را دیدی کہ کار لولوئے شہوار کرد

[دیکھا کہ ذرّہ نے چشمۂ خورشید کی روشنی چھپا دی اور پتھر نے لولوئے شہوار کو برباد کر دیا]

با مغل ہر سال بہرِ دیں سرِ کارش بود ‌‌ عاقبت جان گرامی بر سرِ آں کار کرد

[مغل سے اُسے ہر برس دین کی خاطر سروکار رہتا تھا۔ آخرکار اپنی قیمتی جان بھی اسی کام میں دیدی]

شیر را از نیش مورے صد خروشِ صعب کرد ‌‌ پیل مست از نوک خارے صد فغاں زار کرد

[شیر نے ایک چیونٹی کے ڈنک سے سینکڑوں زور کی چیخیں ماریں، اور ایک کانٹے کی نوک سے پیل مست نے سینکڑوں بار شور و فغاں کیا]

جمعہ بود و سلخ ذی حجہ کہ رفت ایں کار زار ‌‌ آخر ہشت و دو سہ آغاز ہشتاد و چہار

[جمعہ کا دن تھا، ذی الحجہ کی اخیر تاریخ تھی جس دن کہ چاند کھائی دیا اور ۶۸۳ھ ختم ہو رہا تھا اور ۶۸۴ھ شروع کہ یہ لڑائی ہوئی]

آٹھویں بند میں شاعر نے بتایا ہے کہ اس حادثہ پر گویا تمام کائنات نے ماتم کیا۔

مہرومہ بر روئے آں فرخ لقا بگریستند　　روز و شب بر سال آں اندک بقا بگریستند

(چاند سورج اُس فرخ لقا پر روئے اور روز و شب اُس کم عمر کی زندگی پر روئے)

شبنمے کز آسماں ہر صبح می ریزد بخاک　　اشک انجم داں کہ از اوج سما بگریستند

(جو شبنم کہ ہر صبح آسمان سے گرتی ہے وہ ستاروں کے آنسو ہیں جو آسمان کی اونچائی سے گر رہے ہیں)

خلق ملتاں مرد و زن گریہ زناں و موکناں　　کوبکوی و سو بسوے و جا بجا بگریستند

(اہل ملتان مرد اور عورت نالے کرتے۔ بال نوچتے۔ گلی گلی اور جگہ جگہ روتے پھرتے تھے)

از خروش گریہ و بانگِ دہل شب کس نخفت　　بسکہ در ہر خانۂ اہل عزا بگریستند

(رونے کے شور اور ڈھول کی آواز سے رات بھر کوئی نہ سو سکا۔ ہر گھر میں ماتم والے روتے رہے)

دیدۂ خوں افشاند برگِل چوں گلوی کشتگاں　　بسکہ از بہر اسیرانِ بلا بگریستند

(آنکھ نے مقتولوں کے گلوں کی طرح زمین پر خون بہایا۔ اسیرانِ بلا کے لئے لوگ بہت روئے)

در ازاں بندگراں ناگہ اسیرے بازگشت　　روئے او دیدند ہرکس بیریا بگریستند

(اور اگر کوئی شخص ناگاہ اُس بھاری قید سے لوٹ کر آگیا تو اُس کے منہ لوگ دیکھتے تھے اور ہر شخص روتا تھا)

نویں بند میں ماتم ہے۔ تمام لوگوں نے ماتم میں نیلا لباس اختیار کر لیا ہے اور ہر طرف نیل ہی نیل نظر آتا ہے اور ہندو اور مسلمان اس غم میں یکساں شریک ہیں :-

ہم سیاہی شد زہندو ہم سفیدی شد زترک　　بسکہ می پوشد کنوں ہم ترک و ہم ہندو کبود

(ہندو کی سیاہی اور ترک کی سفیدی جاتی رہی۔ اب ترک اور ہندو نیلا لباس بکثرت پہنے ہوئے ہیں)

دسویں بند میں دوستانِ رفتہ کی یاد ہے :-

وہ کہ دل یکبارگی خوں شد برائے دوستاں　　آہ ازاں جمعیت راحت فزائے دوستاں

(آہ! دوستوں کے لئے دل سراسر خون ہو کر رہ گیا۔ افسوس ہے دوستوں کی اُس راحت افزا جمعیت پر)

خفتگانِ خاک را گر خاستن ممکن بود　　عمرِ باقی می کنم وقفِ بقائے دوستاں

(اگر خفتگانِ خاک کے لئے جاگنا ممکن ہو تو میں اپنی باقی عمر دوستوں کی زندگی کے لئے وقف کرنے کو تیار ہوں)

حیف باشد مردماں در چشم و یار از چشم دور　　دیگراں را چوں تواں دیدن بجائے دوستاں

(افسوس ہے کہ پتلیاں (یا لوگ) آنکھوں میں ہیں اور دوست آنکھوں سے دور ہیں۔ دوسروں کو دوستوں کی بجائے کیسے دیکھا جائے)

دوستاں رفتند غیرے را چہ گیرم در کنار　　چوں کشم بر قامت ہر کس قبائے دوستاں

(دوست تو چلے گئے غیروں سے کیسے بغلگیر ہوں۔ ہر شخص کے جسم پر دوستوں کی قبا کیسے پہناؤں)

گیارھویں بند میں دعا ہے :-

کشتگانے را کہ دشواری بریشاں دیر ماند　　یارب امید رہائی زود آساں بادشاں

(جو لوگ لڑائی میں مارے گئے اور دیر تک موت کی سختی میں مبتلا رہے اُنہیں اے خدا جلد اور آسانی سے بخشش نصیب ہو)

بود شاں در روز ہیجا خانِ اعظم پیشرو　　پیشوائے جنّت الفردوس ہم خاں بادشاں

(لڑائی کے دن محمد سلطان ان سب کا پیشرو تھا۔ اسی طرح جنّت میں بھی اُن سب کا پیشوا رہے)

رستگانِ بند را ہم کہ اندر بند بود　　موجب از بہر نجات آخرت آں بادشاں

(جو لوگ قید کی مشقتیں اُٹھا کر چھوٹ آئے ہیں۔ اُن پر خدا کا فضل ہو اور بادشاہ کا احسان)

چوں محمد رفت شہ را عاقبت محمود باد　　کیقباد و ش و کیخسرو ش محمود باد

(اب جبکہ محمد (سلطان) شہید ہو گیا۔ بادشاہ کے لئے محمود سلطان زندہ رہے (یا بادشاہ کی عاقبت بھی بخیر ہو) اور کیقباد (پسر محمود سلطان) اور کیخسرو (پسر محمد سلطان) مبارک و نیکنام رہیں)

دوسرے ترجیع بند کے مضامین پہلے ترجیع بند سے بالکل مختلف ہیں۔ پہلے ترجیع بند میں تمام تر جنگ کے حالات پر نظر ڈال کر ماتم کیا گیا ہے دوسرے ترجیع بند میں شاہزادہ کے حالات و واقعات زندگی کو یاد کر کے اظہار غم ہے +

پہلا بند

اے دل بغم نشیں کہ ز شادی نشاں نماند　　وائے عمر جاں ستاں کہ طرب در جہاں نماند

(اے دل غمگین ہو کر بیٹھ رہ۔ خوشی کا نشان نہیں رہا۔ اور اے عمر جان کو پیلے کہ دنیا میں مسرت باقی نہیں رہی)

فتنہ سپہ کشید چو لشکر شکن نخفت　　آفت جہاں گرفت چو کشور ستاں نماند

(فتنہ نے فوج کشی کر ڈالی لشکر شکن سو رہا ہے۔ کشور ستان نہیں رہا۔ ایک آفت دنیا پر چھا رہی ہے +

درتخت ملک پا بہ فتح وظفر شکست　　برفرق دہر سایۂ امن واماں نماند

[دارالسلطنت میں فتح وظفر کے پاؤں ٹوٹ کر رہ گئے اور دنیا کے سر پر امن و اماں کا سایہ نہیں رہا]

چشم وچراغ خسرو روئے زمیں برفت　　پشت وپناہ کشور ہندوستاں نماند

[شہنشاہ عالم کا چشم وچراغ چلا گیا۔ ملک ہندوستان کا پشت وپناہ نہ رہا]

از مملکت چہ کام برآید چو خاں نشد　　وز کالبد چہ کار کشاید چو جاں نماند

[شاہزادہ چلا گیا اب مملکت سے کیا کام نکلیگا۔ اور جب جان جاتی رہی تو جسم کیا کام کریگا]

دوسرے بند میں شہزادہ کی موت پر ماتم ہے:-

چشمے کہ بود بخت جواں را بخواب رفت　　شمعے کہ بود بزم جہاں را زتاب رفت

[جو بخت جوان کی آنکھ تھی سو کر رہ گئی۔ اور جو بزم جہاں کی شمع تھی بے نور ہو کر رہ گئی]

پیرایۂ جلال بصندوق چوب رفت　　سیارۂ کمال بدریائے آب رفت

[جلال کا لباس صندوق میں رہ گیا اور کمال کا ستارہ پانی میں ڈوب گیا]

ساقی مدہ کہ طبع حریف از مزاج گشت　　مطرب مزن کہ ساز نشاط از رباب رفت

[اے ساقی شراب مت دے کہ طبع حریف کا مزاج خراب ہے۔ اے مطرب مت بجا کہ چنگ میں ساز نشاط نہیں رہا]

برخاک ریز بادہ کہ گاہ طرب گذشت　　برسنگ زن پیالہ کہ وقت شراب رفت

[شراب خاک میں پھینکدو کہ خوشی کا وقت گیا۔ پیالہ کو پتھر پر دے مارو کہ شراب کا وقت گیا]

خسرو ہنوز چند تواں خواندن کتاب را　　ہم شب بآخر آمد وہم خاں بخواب رفت

[اے خسرو کبتک کتاب پڑھتے رہوگے۔ رات بھی ختم ہونے آئی اور شاہزادہ بھی سو گیا ہے]

تیسرے بند میں شاہزادہ کے بعض مشاغل یاد کئے ہیں:-

ماہے گذشت وقصد بمیداں نمی کند　　رغبت بگوی ومیل بچوگاں نمی کند

[ایک مہینہ گذر گیا اور شہزادہ میدان کا ارادہ نہیں کرتا اور پولو کھیلنے کی رغبت نہیں کرتا]

تیغش میان معرکہ روشن نمی بود　　خنگش میان کوکبہ جولاں نمی کند

[اسکی تلوار میدان میں نہیں چمکتی اور اس کا گھوڑا فوج میں نہیں دوڑتا]

در بار خندہ چوں گل بستاں نمی شود　　در برج جلوہ چوں مہ تاباں نمی کند

[دربار باغ کے پھول کی طرح نہیں ہنستا اور شاہزادہ برج میں چمکتے ہوئے چاند کی طرح درشن نہیں دیتا]

درکف کتاب کردہ ندیماں نشستہ اند　　آخر چہ شد کہ گوش بدیشاں نمی کند

[مصاحب کتاب ہاتھ میں لئے بیٹھے ہیں۔ آخر کیا سبب ہے کہ ان کی طرف مائل نہیں ہوتا]

در دل کمر امید ببستہ بزرگاں ستادہ اند　　چونست کار ملک بساماں نمی رسد

[دل میں امید کی مٹھی باندھے بزرگ کھڑے ہیں۔ کیا سبب ہے کہ ملک کا سامان سرانجام نہیں ہوتا]

نوروز عالم است چرا ازبرائے جشن　　مجلس گہے چو روضۂ رضواں نمی کند

[نوروز عالم افروز ہے۔ کیوں جشن کے لئے روضۂ رضواں کے مثل مجلس آراستہ نہیں کی جاتی]

عید مبارک است چرا بر طریق بار　　آہنگ نیزہ بازی میداں نمی کند

[عید مبارک کا دن ہے کیوں دربار کو جاتے ہوئے راہ میں نیزہ بازی کرتا ہوا نہیں جاتا]

خاں را خبر کنید کہ بر چرخ رفت گرد　　کافر رسید وآب لہاور عبرہ کرد

[خان کو خبر کردو کہ آسمان پر گرد پہنچ گئی ہے۔ کافر آپہنچا اور اس نے لاہور کے دریا کو عبور کر لیا]

چوتھا بند بھی اسی سلسلہ کو جاری رکھتا ہے:-

خیزید وبارگاہ بصحرا بروں برید　　دنبال شاہ رایت والا بروں برید

[اٹھو بارگاہ کو نکال کر صحرا میں لے چلو۔ رایت والا شاہ والا کے پیچھے باہر لے چلو]

در سایۂ نشانہ دہل را نوازیند　　با نغمت دمامہ علم را بروں برید

[نشان کے سایہ میں ڈھول بجاؤ۔ ڈھول کی آواز کے ساتھ علم باہر لاؤ]

مست است شاہ خفتہ بتختش رواں کنید　　چوں نیست آں چناں کہ سوار ابروں برید

[شاہ مست ہے اسے تخت پر سوئے ہوئے لے چلو۔ وہ اس وقت سوار ہو کر باہر جانے کے قابل نہیں]

قاآن ملک جانب دمریلہ شد رواں　　دریائے قلب جانب دریا رواں کنید

[قاآن ملک دمریلہ کی طرف روانہ ہو گیا، قلب لشکر کا دریا سمندر کی طرف روانہ کرو]

شاہجہان بسوئے کہستاں نمود عزم　　لشکر گہے چو کوہ بصحرا بروں برید

[شاہجہان کوہستان کا ارادہ رکھتا ہے۔ مثل پہاڑ کے لشکرگاہ صحرا کیطرف لے چلو]

نے نے کہ سوئے حضرت اعلاش خواندہ اند　　رایت بسوئے حضرت اعلیٰ رواں کنید

[نہیں نہیں بادشاہ نے اپنے یہاں طلب فرمایا ہے اس طرف رایت کو روانہ کرو]

امسال ہست امید بنایت بہ پیش تخت ترتیب ملک جملہ مہیا بروں برید

[اس برس وزارت کی اُمید ہے۔ اس لیئے سلطنت کی تمام علامتیں اور نشانیاں تیار کر کے باہر لے جاؤ]

پانچویں بند میں بھی وہی مضمون جاری ہے:-

گاہے بود کہ ایں شب محنت سرآمدے خورشید با فروشدہ ناگہ برآمدے

[کاش کبھی ہماری یہ شب محنت ختم ہو جاتی اور ہمارا ڈوبا ہوا سورج ناگاہ نظر آ جاتا]

آں شیر سُرخ کوکہ بہ پیروزی آمدے در زیر چتر لال بدولت درآمدے

[وہ سُرخ شیر کہاں ہے کہ فتحمند آتا اور لال چتر کے نیچے دولت کیسا تھ آتا]

کو گردِ چتر کوکبۂ خاصگان شاہ کانجم صفت بگرد مہ انور برآمدے

[وہ چتر کے چاروں طرف شاہزادہ کا خاص لشکر کہاں ہے جو چاروں طرف چمکتے ہوئے چاند کے گرد ستارے کی طرح آتا تھا]

نایب کجا کہ ہمچو تہمتن بہ پیش تخت جولاں زناں بہ پیش صف لشکر برآمدے

[نایب کہاں ہے کہ تہمتن کی طرح تخت کے روبرو صف لشکر کے سامنے آتا]

جاندار یک کجاست کہ از رایتہائے شاہ بادورباش چتر زر آمدے

[جاندار یک کہاں ہے کہ شاہی نیزوں اور دورباش کو لے کر سنہرے چتر کے ساتھ ساتھ آتا]

شادی کنید شاہ بملتاں ہمی رسد تا آں ملک محمد سلطان ہمی رسد

[خوشی کرو کہ شاہزادہ ملتان آرہا ہے۔ تا آں ملک محمد سلطان آرہا ہے]

چھٹے بند میں پھر شاہزادہ کی یاد ہے:-

کو آں جہاں گرفتن و لشکر کشیدنش براوج آفتاب علم برکشیدنش

[وہ اُس کی جہانگیری اور لشکر کشی کہاں ہے اور سورج تک جھنڈا بلند کرنا کہاں ہے]

کو آں بگاہ بار بمسند نشیدنش صفہائے صف دراں ہمہ تا در کشیدنش

[وہ دربار کے وقت اُس کا مسند پر بیٹھنا اور دروازہ تک صفوں کا قایم رکھنا کہاں ہے]

کو آں مرصع نگند نش اسپاں نوبتی ہمہ در زر کشیدنش

[وہ مرصع لگامیں لگانا اور شاہی گھوڑوں کو سنہرے زیور پہناتا کہاں ہے]

کو آں ملوک خواندن و در مے نشاندنش و آں بزم راست کردن و ساغر کشیدنش

[ملوک کو بلا کر مجلس میں شریک کرنا اور مجلس سجا کر ساغر پینا کہاں ہے]

دربحث علم نکتۂ مشکل شنیدنش و ز دل ہزار نکتۂ دیگر کشیدنش

[علمی بحث میں مشکل نکتہ سننا اور دل سے ہزاروں دیگر نکات نکالنا]

اخیر بند میں سلطان بلبن محمود سلطان اور کیقباد کیخسرو کی زندگی اور شاہزادہ کی مغفرت کی دعا ہے +

امیر خسرو نے اسی جنگ اور حادثہ کے متعلق چند رباعیاں بھی لکھی تھیں جن میں سے حسب ذیل انتخاب کی جاتی ہیں:-

(۱)

در جنگ مغل کہ تیر کیں شد پرتاب ہم تاب ز روئے رفت وہم روئے ز تاب

زاں کشتہ و خستہ کاندر آب افتادند آں آب ہمہ خوں شد و آں خوں ہمہ آب

[مغل کی لڑائی میں جب کینے کے تیر چلے تو چہرہ سے طاقت جاتی رہی اور چہرہ طاقت سے پھر گیا۔ مُردے اور زخمی جو پانی میں تڑپے تھے۔ تو اُن سے پانی سب خون ہو کر رہ گیا اور خون سب پانی]

(۲)

قومے کہ دراں عرصۂ کیں می خسپند فریاد کہ از بہر چہ چنیں می خسپند

برخاک نہادہ سرہا گوئی در ماتم خویش برزمیں می خسپند

[جو لوگ اُس میدان جنگ میں سو رہے ہیں افسوس وہ کس لئے ایسے سو رہے ہیں گویا خاک پر سر رکھے ہوئے اپنے ماتم میں سو رہے ہیں]

(۳)

جمعے ہمہ گردن برسن کردہ گرو بودند چو خون کشتگاں در دو

ہم خار ہمی گرفت دامن کہ مرو ہم آبلہ می فتاد در پا کہ مرو

[وہ لوگ جن کی گردنیں رسیوں میں بندھی ہوئی تھیں ایسے دوڑ رہے تھے جیسے مقتولان جنگ کا خون دوڑ رہا تھا۔ کانٹے دامن میں اُلجھتے تھے (یا روکتے تھے) کہ مت دوڑو اور آبلے پیروں میں پڑتے تھے (یا منت سماجت کرتے تھے) کہ مت جاؤ]

(۴)

آں کیست کہ سوئے رفتگاں رہ جوید مارا خبر از حال اسیراں گوید

پائے کہ بزیر گل خراشیدہ شدے یارب کہ میاں خارچوں می پوید

[کون ہے جو گئے ہوؤں کے پاس جا کر قیدیوں کے حال کی خبر لاوے۔ جو پیر پھول سے زخمی ہو جاتے تھے الٰہی! وہ کانٹوں میں کس طرح دوڑتے تھے]

(۵)

تا لشکر شاہ راہ عالم بالا گرفت دل رفت ز جا و غم و درد جا بگرفت

اے آب مپائے بعد ازیں در ملتاں چوں جائے تو آب دیدۂ ما بگرفت

[جب سے شاہزادہ کی فوج نے عالم بالا کا راستہ لیا ہے۔ دل بیقرار ہے ۔ اور غم درد نے دل کی جگہ لے لی ہے۔ اے دریا اس کے بعد ملتان میں مت ٹھیر تیری جگہ ہماری آنکھوں کے آنسوؤں نے لے لی ہے]

زیں واقعہ کامسال بملتان نزاد است ‏‏ از گریہ نفیر در جہاں اُفتاد است

فریاد ز گوشش من بر آمد چہ کنم ‏‏ ہر سو کہ گوشش ہی نہم فریاد است

[جو واقعہ اس برس ملتان میں پیش آیا اُس کی وجہ سے دنیا میں نالہ و گریہ ہو رہا ہے۔ میرا کان فریاد کرنے لگا۔ کیا کروں جس طرف کان لگاتا ہوں فریاد ہی فریاد سنائی دیتی ہے +

جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے کہ اس حادثہ میں امیر خسرو مغلوں کے ہاتھ میں گرفتار ہو گئے اور بڑی تکلیفیں سہکر چھٹکارا پا سکے تھے ۔ ایک قصیدہ میں جس کا نام "حکم الحکم" رکھا ہے اپنی اسیری و رہائی کا ذکر کیا ہے ۔ اُس کے چند اشعار لکھتا ہوں :-

ہمیں بلا مگر کہ امسال در حد ملتاں ‏‏ شکست میمنۂ مومن از کف کفار

چہ گونہ شرح تواں داد آں قیامت را ‏‏ کزاں نزع ملک الموت خواستے زنہار

اسیر گشتم و از بیم آنکہ چوں ریزد ‏‏ نمی ماند ز خوں و ز تن نحیف نزار

چو آب بے سر و پا می دویدم و چو حباب ‏‏ ہزار آبلہ در پا ز رفتن بسیار

برہنہ ماندہ تن چوں درخت گاہ خزاں ‏‏ ہزار پارہ چو گل از خراش خار آزار

قرینہ کہ مرا پیش کردہ رہ می رفت ‏‏ نشستہ بر فرسے چوں پلنگ در کہسار

زماندگی قدمے گر بماندمی تشنہ ‏‏ گہے طپانچہ زدے گہ کشیدے بخشم گہ تکمار

ہمی زدم بدل سرد دم و ہمی گفتم ‏‏ کزیں بلا نتوانم کہ جاں برم زنہار

ہزار شکر خداوند را کہ داد خلاص ‏‏ نہ دل ز تیر شگاف و نہ تن ز تیغ افگار

۶۸۴ھ کنوں کہ شش صد و ہشتاد و چار شد تاریخ ‏‏ مرا بسی و سہ [۳۳] آمد نوید سی و چہار [۳۴]

سبق گرفتہ ام ایں نکتہ را بمکتب طبع

بہ پیش پیر خرد در صحیفۂ افکار

[اس بلا کو دیکھو کہ اس سال ملتان کی حد میں مومن کی صف راست کفار (مغل) کے ہاتھ سے ٹوٹ گئی۔ اُس قیامت کا کیا حال بیان کیا جائے کہ جس کی ہیبت سے ملک الموت پناہ مانگتا تھا۔ میں بھی قید ہو گیا اور اس خوف سے کہ قتل کر دیا جاؤنگا میرے کمزور اور لاغر جسم میں خون باقی نہ رہا۔ پانی کی طرح بے سروپا دوڑتا تھا۔ اور حباب کی طرح پیروں میں زیادہ چلنے سے آبلے پڑ گئے تھے۔ میرا جسم ایسا ننگا رہ گیا تھا جس طرح کہ خزاں کے وقت درخت اور کانٹوں کے خراشوں سے پھول کی طرح اُس کے ٹکڑے ہو گئے تھے۔ ایک قرونہ (مغل) جو مجھے اپنے سامنے لئے ہوئے چلا جاتا تھا۔ ایک گھوڑے پر اس طرح سوار تھا جیسے کہ چیتا پہاڑ پر۔ اگر تھک کر ایک قدم بھی ٹھیر جاتا تو مجھے کبھی طمانچہ سے مارتا اور کبھی غضبناک ہو کر تکمار سے پیٹتا۔ میں اپنے دل میں آہ سرد کھینچکر رہ جاتا اور کہتا کہ اس بلا سے جان بچا کر نہ لیجا سکونگا۔ خداتعالٰے کا ہزار شکر ہے کہ جس نے مجھے اُس سے نجات دلائی۔ نہ میرا دل تیر سے چھدا نہ میرا بدن تلوار سے زخمی ہوا۔ اب کہ ۶۸۴ھ ہے مجھے اپنی عمر کے تینتیسویں [۳۳] برس نوید آئی ہے۔ چونتیسویں [۳۴] برس کی (یعنی چونتیسواں سال شروع ہونے والا ہے) میں نے اس نکتہ کو طبیعت کے مکتب میں پیر خرد کے سامنے فکر کے صحیفہ سے سیکھا ہے +]

یہ ہیں خان شہید کے حالات اور جنگ ملتان کے افسوسناک واقعات۔ ہندوستان کی تاریخ میں بہت سی بڑی بڑی لڑائیاں لڑی گئیں۔ جن میں سلطنتیں جیتی اور ہاری گئیں اور بہت سے سورما مارے گئے جن کے نام تاریخ میں چمکتے ہیں۔ لیکن ملتان کی یہ خوفناک لڑائی اور اُس کے ہیرو شاہزادہ سلطان محمد بھی بھولے جانیکے قابل نہیں ہیں۔ معلوم نہیں کہ ملتان میں اُس کی یاد کس حد تک زندہ ہے۔ لیکن وہ دریا جسکے قریب ابتک بہتا ہے جس کی موجوں میں اُس نے اپنی قربانی تھی۔ اُس نے اپنی زندگی ہندوستان کی حمایت و حفاظت میں کھوئی۔ لیکن اُس کا نام پتھر کی چٹانوں پر کندہ ہے۔ تاریخ نے اُس کے نام کو زندہ رکھا ہے اور ادب میں بھی اُس کی یاد ابتک گونجتی ہے آنے والے زمانہ میں جبکہ ہمارے ملک کی تاریخ پورے طور پر لکھی جائے گی۔ تو اس کا نام سنہرے حرفوں میں لکھے جانے کے قابل ہوگا۔ اگر ہم اُسکی بڑائی سے ابتک بیخبر تھے تو اس کی صرف ایک ہی وجہ ہو سکتی ہے۔

"ہم اپنے ناموروں کو بہت کم جانتے ہیں۔ اور اُس سے بھی کم اُنکی عزت کرتے ہیں" +

خدا مغفرت کرے' خان شہید واقعی ہندوستان کا ایک بڑا ہیرو تھا۔ اُس کا نام اور اُس کی یاد دونوں سچّی عزت کے مستحق ہیں!

(خاص)

سید حسن برنی

چینی کی چوٹی

از جناب مرزا محمود نظامی۔ اسلامیہ کالج۔ لاہور

"سرکار سوئز آگیا"

میں چونک کر اُٹھا۔ گھڑی دیکھی تو نو بجکر کچھ منٹ ہوئے تھے۔ گویا ہمارا جہاز ٹرین کی روانگی سے ٹھیک پچیس منٹ پہلے پہنچا۔ میں نے اطالوی سٹیورڈ کی جانب خمار آلود آنکھوں سے دیکھا اور پھر کہا:۔

"بہتر سوٹ کیس اُٹھالو!"

ہم چوبی سیڑھیوں کی راہ عرشۂ جہاز پر آئے۔ مطلع ابر آلود تھا اور سیاہ گرجتے ہوئے طوفانی بادل دوش نسیم پر اُڑتے پھرتے تھے۔ تیز بارش میں بھیگتی ہوئی ہماری مختصر سی جماعت جو چار عورتوں اور سات مردوں پر مشتمل تھی گنگ وے کے راستہ اُس اگن بوٹ میں بیٹھی جو ہمیں ساحل سوئز تک لے جانے کے لئے جہاز کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر میں اگنبوٹ خلیج سوئز کے پایاب پانیوں کو کھنگالتا ہوا جہاز سے پرے پرے ہٹنے لگا۔ ہوا تندی سے چل رہی تھی۔ طوفانی سمندر کی غضبناک موجیں بلّیوں اُچھل رہی تھیں۔ مغرب میں جس وقت بجلی چمکتی تو دور تک پھیلے ہوئے بار برداری کے جہازوں کا عظیم بیڑا جس کی متعدد چمنیوں سے سیاہ دھوئیں کی لکیریں خارج ہو رہی تھیں کسی ہیولانی تصور کی طرح غیر واضح نظر آتا۔ اور کچھ لنگر انداز ساحلی جہاز اور بہت سی تیل لے جانے کی کشتیاں متلاطم موجوں میں تنکوں کی طرح ہلتی دکھائی دیتیں +

پندرہ منٹ کے عرصہ میں سٹیمر وِسل کی بھاری اور دہشتناک آواز کے ساتھ جو رات کے سناٹے کو چیرتی ہوئی تیل کی ٹانکیوں کے ساتھ ٹکرا کر فضا میں پھیل گئی تھی۔ ساحل کے ساتھ لگا۔ جب ہم لوگ موٹروں میں بیٹھکر سٹیشن پر اُترے تو گاڑی روانگی کے لئے تیار تھی۔ انجن دھوئیں کے سیاہ بادل اُڑا رہا تھا۔ اور ہمارے بیٹھنے کے تھوڑی دیر بعد ایک لمبا پُر شور وِسل دے کر وہ گھنٹیوں اور سیٹیوں کی کرخت آوازیں پلیٹ فارم کو پیچھے چھوڑ کر آہستہ آہستہ آگے بڑھنے اور رفتہ رفتہ رفتار تیز کرنے لگی۔ اور کچھ عرصہ میں فرّاٹے بھرتی کہیں سے کہیں پہنچ چکی تھی۔ ٹھنڈی ہوا چونکہ کھڑکیوں کی راہ اندر داخل ہو رہی تھی۔ اس لئے میں نے دروازہ پھیر دیا۔ اور شیشے چڑھا دینے کے بعد گدّے پر سونے کی نیت سے دراز ہو گیا۔ جب دو گھنٹہ کی خوشگوار نیند کے بعد آنکھ کھلی تو برسات بند ہو چکی تھی۔ لیکن مطلع بدستور غلیظ تھا۔ اور بجلی آتشی کھنکھورے کی مانند چمک رہی تھی۔ سیاہ بادل غیر مختتم قطار میں دوش نسیم پر اُڑتے چلے جا رہے تھے۔ اگر ہوا کی سرکشی اُنہیں منتشر کر دیتی تو چاند کی روشنی میں صحرا کا ہیبتناک وسنسان ویرانہ حدِ نگاہ تک پھیلا ہوا دکھائی دیتا جس کی بھیگی ہوئی بنجر پہاڑیوں کے ڈھلوانوں پر برسات کا جمع شدہ پانی آہستہ آہستہ بہ رہا تھا۔ اور جہیں سیاہ جنگلوں کے بڑے بڑے پیڑ ہوا کے آگے تنکوں کی طرح ہلتے تھے +

آدھ گھنٹہ کے بعد گاڑی قاہرہ کے عظیم الشان سٹیشن پر پہنچی۔ تو برسات دوبارہ شروع ہو چکی تھی۔ بہرکیف ٹھیک دو بجے ہم لوگ شیپرڈ ہوٹل میں داخل ہوئے۔ ایک ریشائل گندمی رنگ کے عمر رسیدہ مصری نے موٹر کا دروازہ کھولا۔ اپنے داہنے ہاتھ کو داڑھی تک بلند کرتے ہوئے میری تقدیم کی۔ اور سامان اُٹھا کر میری رہنمائی کرتا ہوا ہوٹل کے اندر داخل ہوا۔ سنگی زینہ کو طے کرنے کے بعد ہم تھوڑی دیر تک سنسان ہوٹل کے تنگ راستوں کے چکر کاٹتے رہے۔ پھر وہ ایک دروازہ پر پہنچکر رکا۔ جیب سے چابی نکالی۔ اندر دروازہ کھول کر اُس نے میرا سامان میز پر رکھا۔ اور بوٹ اُتارنے میں میری مدد کرنے لگا۔ پھر قدرے جھک کر مسکراتے ہوئے بولا:۔

"جناب والا مجھے یقین ہے یہ جگہ آپ کے لئے بالکل آرام دہ ہوگی"+

اور پچھلے پیروں ہٹتا دروازہ کھول کر رخصت ہو گیا۔ اُس کے جانے پر دروازہ کے بند ہونے کی آواز آئی۔ پھر کمرہ میں موت کی سی خاموشی چھا گئی۔ باہر تند ہوا کھڑکیوں سے اپنا سر پھوڑ رہی تھی۔ اور بارش کے پٹ پٹ کر کے گرتے ہوئے پانی کی آواز آ رہی تھی۔ جس وقت میں شب خوابی کا لباس تبدیل کر چکا۔ تو عین اُسوقت دستک ہوا اور دروازہ

بڑی آہستگی سے کھلا۔ اور وہی پیر پروہی بوڑھا مصری خادم نمودار ہوا +

"معاف کیجیگا جناب والا!" اُس نے حسب معمول جھک کر کہا۔ "آپ کا بستر مجھے ٹھیک کرنا ہے" +

اور دروازہ کو بند کرتے ہوئے اندر داخل ہوا۔ میں نے کوٹ کی جیب سے سگار نکال کر سلگایا اور ایک آرام کرسی پر ستانے کے لئے بیٹھ گیا۔ دفعتاً فاصلہ پر سے کسی گھنٹہ کی خوفناک آواز کا مدّھا شور طوفانی سمندر کی غضبناک موجوں کی تند آواز سے ملتا ہوا۔ کانوں میں آیا۔ ایک ایسا مدھم شور جو اُن مبہم آوازوں کے اشتراک سے علیحدہ ہو۔ جو رات کے سناٹے میں دوش نسیم پر سنائی دیا کرتی ہیں۔ اور رفتہ رفتہ بڑھ کر پھر فنا ہوگیا۔ لیکن وہ اسقدر مقبول ذہن تھا کہ مجھ پر عجب طرح کا خوف طاری ہونے لگا۔ ایسے گھنٹے کی آواز عموماً برما کے بدھ مندروں میں سنائی دیا کرتی ہے۔ یا اس قسم کا جرس قرون وسطی کے زمانۂ جاہلیت کی خوفناک مذہبی جماعتوں میں بجا کرتا تھا +

میں نے مصری کی طرف دیکھا وہ بڑی خاموشی سے چادر کی سلوٹیں درست کرنے میں منہمک تھا۔ اُس کا چہرہ بالکل مطمئن اور سنجیدہ تھا۔ معلوم ہو رہا تھا۔ اُس نے کوئی خوفناک آواز نہیں سنی۔ کام سے فارغ ہوکر وہ جانا چاہتا تھا۔ کہ میں نے اُسے روکا۔

"ٹھہرو!" میں نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا "تم بتلا سکتے ہو یہ آواز کس چیز کی تھی؟"

"جناب والا! کون سی آواز؟" اُس نے حیرت و استعجاب کے عالم میں دریافت کیا

"تم نے نہیں سنا؟ ..... وہی آواز ....." ابھی اُس کی پوری تفصیل میں بتانا چاہتا ہی تھا کہ دور افتادہ مقام سے کسی ڈھول کی تھرتھراتی ہوئی ہولناک آواز تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد سنسناتی ہوئی ہمارے کانوں تک پہنچی +

ایک خوفناک تبسم بوڑھے مصری کے خشک ہونٹوں پر نمودار ہوا +

"آہ! میں سمجھا۔ جناب والا!" اُس نے آگے سے زیادہ مسکراتے ہوئے کہا "میں سمجھا تھا تم غزوبی کے مندر میں نقارہ پیٹا جا رہا ہے۔ وہ نقارہ۔ وہ عظیم و مہیب نقارہ جس کو دیکھنے کے لئے دنیا کے ہر کونے سے آئے دن لوگ قاہرہ میں آتے ہیں۔ جناب والا! اس وقت وہاں کوئی مذہبی رقص شروع ہونے والا ہوگا" وہ کچھ دیر کے لئے خاموش ہوگیا۔ جس کے دوران میں نقارہ کی تھرتھراتی ہوئی آواز بدستور آرہی تھی۔ پھر بولا "آہ وہ کیسا عجیب منظر ہوتا ہے۔ لوبان و عنبر کی بوئے جاں افزا میں اس وقت بھی یہاں کھڑا سونگھ رہا ہوں۔ جناب والا! یقین کیجئے رقص درحقیقت قابل دید ہے" +

اس کے بعد وہ حسب معمول جھکا اور پیشتر اس کے کہ میں اس سے کوئی سوال گھنٹے کے متعلق کرتا وہ دروازہ کھول کر چلا گیا۔ اور فاصلہ پر اُس کے قدموں کی ہلکی سی چاپ بھی بند ہوگئی۔ میں نے سگار کو میز پر رکھدیا۔ اور سونے کی نیت سے اُٹھا۔ اُس وقت اچانک سڑک پر سے کسی شخص نامعلوم کی کسی دستی باجہ کی سمع خراش آواز کے ساتھ ایک بھیانک لے میں ناقابل فہم غیر ملکی گیت گانے کی آواز آئی۔ اور پھر یکلخت بند ہوگئی۔ کچھ دیر کمرہ میں وہی پہلے کی سی موت کی خاموشی طاری رہی۔ مگر رفتہ رفتہ بیشمار آوازیں کانوں میں آنے لگیں وہ عجیب مدھم شور جو رات کی سنسانی سے مخصوص ہے۔ باہر سڑک پر کسی راہرو کی ہلکی چاپ۔ کتوں کے بھونکنے کی آواز۔ ہوائی سائیں سائیں ہوٹل کے کسی حصہ میں تختوں کا چرچرانا۔ یہاں تک کہ کھڑکی کی ٹک ٹک بھی میرے لئے باعث اضطراب ہونے لگا۔ بہت دیر اسی حالت میں رہا۔ آخر میں گھبرا کر اُٹھا اور کمرہ میں ٹہلتے ہوئے نیند کو مائل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ نہ معلوم کتنا عرصہ ٹہلتا رہا۔ گھڑی دیکھی تو تین بج رہے تھے۔ عین اُس وقت اُسی شیطانی گھنٹہ کی مہیب اور کرخت آواز گونجتی ہوئی سنائی دی۔ خوف سے لڑکھڑا کر میں پیچھے ہٹا۔ لیکن کسی غیبی تحریک سے مرعوب ہوکر میں نے سامنے کی کھڑکی جلدی سے کھولی۔ ساتھ ہی تیز ہوا کا تیز چاقو کی دھار کے مانند کاٹتا ہوا داخل ہوا۔ برسات بند ہوچکی تھی۔ کچھ فاصلہ پر درختوں کے جھنڈ تیز ہوا کے آگے سجدہ ریز تھے۔ آسمان پر ابر کے ٹکڑے سیاہ دیوؤں کی طرح ہوا کے پردوں پر ایک دوسرے کے تعاقب میں اُڑ رہے تھے۔ اور اُن کے اندر کبھی کبھی نصف چاند دکھائی دیتا تو اُسکی پھیکی سرد روشنی میں درختوں سے پرے کچھ دھندلے مکان اور اُن سے پرے شہر کا وحشت خیز ویرانہ نظر آتا۔ سڑک پر لیمپوں کی روشنی تاروں کی مانند چمکتی تھی۔ عین اُس وقت جبکہ میں واپس ہونا چاہتا ہی تھا۔ کہ کسی سیاہ چیز کو دیکھ کر رُکا۔ آہ یہ کیا؟

کوئی سیاہ پوش پُراسرار مرد سر پر چینی وضع کی ٹوپی لئے۔ آہستہ آہستہ ہوٹل کی جانب آتا ہوا دکھائی دیا۔ پہلے تو اُس کی شکل اچھی طرح دکھائی نہ دیتی تھی۔ تاہم جب وہ برقی لمپ کے کھمبے کے نیچے پہنچا تو میں نے غور سے اُس کی جانب دیکھا۔ لیکن اُس کے لباس سے اُس کی قومیت مترشح نہ ہوسکی۔ اور وہ بڑی سرعت کے ساتھ ہوٹل میں داخل ہوگیا۔ کچھ دیر میں وہیں کھڑکی کے سامنے ساکت کھڑا رہا۔ پھر خیالات کو توہم پر محمول کرتے ہوئے بستر پر لیٹ گیا۔ اور تھوڑی دیر بعد آنکھ لگ گئی +

اُٹھا تو دن چڑھا ہوا تھا +

غسل کر چکا تو ہوٹل کا ویٹر ناشتہ کے تیار ہونے کی اطلاع دینے آیا۔ چنانچہ تبدیل لباس کے بعد میں کھانے کے کمرہ میں گیا۔ کچھ لوگ کھانا کھا کر اُٹھ گئے تھے۔ اور کچھ ابھی تک میزوں پر بیٹھے ہوئے کھا رہے تھے۔ میں آرام سے ایک خالی نشست پر بیٹھ کر کھانوں

کی فہرست میں سے چند ایک کا انتخاب کرنے لگا۔ کاغذ سے سر اُٹھایا تو میز پر بہت سے دوسرے آدمی جو میری آمد پر موجود نہ تھے آکر بیٹھ چکے تھے۔ چائے کی پیالی میں شکر کی ڈلیاں ڈالنے کے بعد میں نے دودھ کے برتن کو میز پر تلاش کرنے کے لئے متجسس نظریں اِدھر اُدھر دوڑائیں تو کیا دیکھتا ہوں۔ میرے مقابل کی قطار میں تیسری نشست پر وہی پُراسرار بیٹھا ہوا انڈے کو کانٹے میں پھنسانے کی ناکام کوشش کر رہا ہے جسے پچھلی رات میں نے سڑک پر سے ہوٹل کی جانب آتے ہوئے دیکھا تھا۔ ہاں یہ وہی تھا۔ وہی گول گول آنکھیں۔ وہی زرد رنگ +

دل نے کہا ممکن ہے گھنٹہ کی آواز جو ہوٹل کے کسی کمرہ سے دو دفعہ سنائی دی تھی اسی سے تعلق رکھتی ہو۔ لیکن ان خیالات کو دل سے نکال کر میں نے کھانا ختم کیا اور شہر کی سیر کے لئے تیاری کرنے کی نیت سے اُٹھ کر اپنے کمرہ میں چلا آیا تیار ہونے کے بعد جس وقت موٹر میں میں نے قدم رکھا تو میں نے دیکھا وہ شخص میری آمد سے بیشتر اگلے گدّوں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایک کوئی ترک نوجوان۔ دوسرا وہی مردِ پُراسرار۔ راستہ میں ہم نے بہت کم باتیں کیں لیکن جب ہم مسجد محمد علی خدیو مصر کی سیر کے بعد دوبارہ موٹر میں بیٹھے تو باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ ترک کا نام مصطفیٰ صغیر ہے اور مردِ پُراسرار کا آہ فنگ خو +

آہ فنگ خود در اصل چین کا باشندہ تھا لیکن کاروباری ماحول کی وجہ سے دو تین سال سے اُس نے جاپان کے شہر اوساکا میں اپنی بود و باش اختیار کر لی تھی۔ اور اب وہ تجارت کے سلسلہ میں انگلستان جا رہا تھا۔ مصطفیٰ صغیر ترکی افواج میں کسی ممتاز عہدہ پر فائز تھا۔ اور اس وقت مصر میں سیر و تفریح کے لئے آیا ہوا تھا ـــــ ان باتوں کا علم اُس وقت ہوا جب ہمارا موٹر قاہرہ کے کشادہ اور فراخ بازاروں میں سے گذر رہا تھا جہاں مشرق و مغرب کے ہر ملک و قوم اور ہر مذہب و ملت کے مختلف انداز کے افراد اپنی قومیت کے جداگانہ لباس پہنے ایک دوسرے کے دوش بدوش چل رہے تھے۔ مسجد محمد علی۔ جامع ازہر اور قلعہ کی مشہور عمارتوں کو اچھی طرح دیکھنے کے بعد ہم لوگ اہرام مصر کی جانب روانہ ہوئے۔ شام کے چھ بج چکے تھے۔ غروب ہونے والے سورج کی روپہلی کرنیں نیلگوں آسمان پر بکھرے ہوئے سفید رنگ بادلوں کو سنہری رنگ دے رہی تھیں۔ تھوڑی دیر میں ہم لوگ اہرام کے نزدیک پہنچ گئے۔ آسمان کی فضا اور صحرا کا دامن آفتاب کے آخری اثرات سے تمتع اندوز ہو رہے تھے۔ درختوں کے قہقہے فضائے آسمانی میں گونج رہے تھے۔ ہلکی ہوا سرسبز پتوں کو گدگدا رہی تھی۔ سامنے حدِ نگاہ تک پھیلا ہوا ریت کے بیشمار ذرّوں کا ہموار میدان تھا جس میں بائیں جانب کھجور کے لہلہاتے درختوں کی اوٹ میں اہرام مصر اور ابوالہول کا چھپا ہوا چہرہ نظر آتا تھا +

موٹر وہیں کھڑا کر دیا گیا۔ اور ہم لوگ اپنے گائیڈ (رہبر) حسین کی معیت میں کھنڈرات کی طرف بڑھنے لگے۔ سامنے کھدائی کرنے والے مزدوروں کا سامع خراش شور و شغب شام کی آمد کی وجہ سے کم ہو گیا تھا۔ اور افسر چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بنائے اُفق کی سرخی پر نگاہ غلط انداز ڈالتے ہوئے اِدھر اُدھر ٹہل رہے تھے۔ قریب ہی (ایکسکویٹر) کا بڑا بھاری انجن دن بھر کی تھکان کے بعد ساکت و صامت کھڑا تھا اور کچھ پژمردہ و ملول مزدور کپڑے جھاڑ جھاڑ کر اُس راہ پر ہو رہے تھے جس سے ہم لوگ آئے تھے۔ دو منٹ تک پیدل چلنے کے بعد ہم لوگ اہرام کے پاس پہنچ گئے۔ چاروں طرف وسیع چٹیل میدان خشک اور غیر مزروعہ خطہ تھا۔ جس میں کہیں کہیں تاریک گہری کھڈیں۔ اونچے اونچے ریتلے ٹیلے اور خاک سے ڈھلے ہوئے سفید پتھر نظر آتے تھے۔ فضا میں کوئی دیوہیکل صحرائی پرندہ اپنے گھونسلے کی جانب مراجعت کرتا ہوا (بحالت تباہ) ہم کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے سوا آدمی کا نام و نشان تک نظر نہ آتا تھا۔ یہاں تک کہ اس وقت رہے سہے مزدور بھی جا چکے تھے۔ اور اُن کی شکلیں دور فاصلہ پر دھندلے اور تاریک سایوں کی طرح نظر آتی تھیں۔ نظارہ بہت ہیبتناک تھا۔ سنسانی ہر قدم پر بڑھتی جاتی تھی۔ دور کسی مختصر سے قافلے کے اونٹوں کی مدھم صدائے جرس کے سوا کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی +

کچھ دیر اِدھر اُدھر گھومنے کے بعد ہمارا رہنما ہمیں اُس ندی کے پاس لے گیا جو صحرا میں نیلے کور کی طرح خاموش بہتی تھی۔ اور جس کا گدلا پانی کنارے پر اُگی ہوئی سبز گھانس اور اُس میں بکھرے ہوئے چٹانوں کے سیاہ ٹکڑوں کے ساتھ ٹکرا ٹکرا کر بہ آہستگی بہہ رہا تھا۔ سرد صحرائی ہوا۔ اُس دردناک آواز کے ساتھ جو پستہ قد پودوں میں سے تندی کے ساتھ گذرنے سے سنائی دیتی تھی۔ چل رہی تھی۔ ہم لوگ کچھ دیر کھڑے اُس کے پانی کو دیکھتے رہے۔ پھر حسین ندی کی طرف اشارہ کر کے بولا:-

"سرکار اِس دریا میں غرق شدہ موتوں کی خبیث اور ناپاک روحیں شام کو یہاں آ موجود ہوتی ہیں۔ اور وہ رات کے اندھیرے میں آوارہ پھرتی ہوئی اُن لوگوں کو جو آس پاس گذر رہے ہوں۔ ہلاک کر دیتی ہیں۔ چنانچہ اس وقت تک ایسی ہزاروں موتیں ہو چکی ہیں" +

مجھے تو واقعی اُس وقت یوں معلوم ہونے لگا جیسے فضا پر یہی بے شمار خبیث روحیں اِدھر اُدھر بے آواز پھرتی ہوئی ہمارے سروں پر منڈلا رہی ہیں، مگر ترک حقارت اور حیرانی کے لہجہ میں بولا:-

"تم عجیب گاؤدی انسان ہو۔ کہ اس زمانہ میں بھی بھوتوں کی ہستی کے قائل

بنے بیٹھے ہو" +

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی جیسے شاید جواب میں کچھ سوچ رہا تھا۔ کہ چینی زور سے ہنسا +

"ہا ہا ہا۔ ہا ہا ہا۔ ہو ہو ہا ہا......" اُس کی آواز آجتک میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ یقیناً اس طرح کا خوفناک شیطانی قہقہہ جو اس وقت اس چینی نے لگایا بہت کم سننے میں آیا ہو گا۔ عجیب مکروہ آواز تھی +

پھر آہ فنگ خو نے اپنا ہاتھ ترک کے کندھے پر رکھتے ہوئے کہا:۔

"میرے دوست بھوتوں کا وجود اتنا ہی یقینی ہے۔ جتنا آپ کے سامنے اس ندی کی موجودگی" +

ترک نے ایک روکھے لہجے میں جواب دیا:۔

"ممکن ہے آپ اپنے کسی تجربہ کی بنا پر ایسا کہہ رہے ہوں۔ لیکن یہ امرِ واقعہ ہے کہ میں ان کا قائل نہیں" +

تھوڑی دیر چینی اُس کی جانب دیکھتا رہا۔ پھر بولا:۔

"ہو گا۔ مگر میں بھوتوں کے ایسے ہوشربا واقعات دیکھ چکے ہیں۔ جسکی نظیر مشکل سے کسی کو دنیا میں میسر آئیگی"۔

اُس کی آنکھیں خوفناک طور پر بند ہوتی اور کھلتی تھیں اور اُس کے ہونٹ تھرتھرا رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کوئی بڑا بھاری راز جسے وہ چھپانا چاہتا تھا۔ اُس کے منہ سے نکل گیا ہے +

"واقعی ؟" ترک نے حیرت و استعجاب کے انتہائی لہجہ میں دریافت کیا "آہ تب تو آپ ہمیں ضرور کسی محیّر العقول واقعہ کی داستان سنائیں گے"۔ اور استفہامی نظروں سے چینی کے پشیمان چہرہ کی طرف دیکھنے لگا +

اشتیاق میرا بھی بڑھا ہوا تھا۔ چنانچہ ترک کی تائید میں "ضرور۔ ضرور" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ اور ہم لوگ چینی کو آمادہ پا کر وہیں ریت کے فرش پر بیٹھ گئے۔ دہکتے ہوئے لوہے کی مانند سرخ آفتاب لمحہ بہ لمحہ صحرا کے ایک کونہ میں غروب ہوتا جا رہا تھا۔ اور تاریکی رفتہ رفتہ شوخ نظروں سے کائنات کو دیکھتی ہوئی نمودار ہو رہی تھی۔ چینی کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر گرد آلود سمٹی ہوئی ابروؤں کے نیچے اُس کی چھوٹی چھوٹی درخشاں آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ اور اُس نے کہا:۔

"یہ پُراسرار حالات ہرچند پردۂ راز میں رکھے جانے کے قابل ہیں۔ مگر آپ لوگوں کو تبلانے میں میں کوئی خطرہ نہیں دیکھتا"۔ اور وہ حسب معمول کچھ دیر کے لئے رُکا۔ پھر آہستہ آہستہ بولا:۔

"اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا۔ تو ایک سال سے زیادہ عرصہ گذرا۔ ایک رات جب کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں اور پانی زور سے برس رہا تھا۔ میں اوسکا میں اپنے مکان پر بیٹھا تجارتی کاغذات کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ بادلوں کی مہیب کڑک اور زہرہ گداز تبسّم برق سے دل سینہ میں بیٹھا جا رہا تھا۔ اتنے میں ایک دفعہ بجلی کہیں اس زور سے گری۔ گویا توپوں کی ایک بڑی باڑھ چھوٹی ہو۔ اس کے بعد سیڑھیوں پر کسی کی بھاری چاپ سنائی دی۔ جو کمرہ کے دروازہ پر آ کر رک گئی اور ساتھ ہی کسی کے دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ مگر میں اُسے ہوا کی سرتوشی سمجھ کر خاموش بیٹھا رہا +

"کھٹ کھٹ کھٹ وہی آواز دوبارہ سنائی دی۔ کوئی شخص زور زور سے میرے دروازہ پر دستک دے رہا تھا +

"میں اٹھا اور دروازہ کھول کر برستے ہوئے پانی میں دیکھنے لگا۔ باہر بالکل اندھیرا تھا۔ مگر پھر بھی سیڑھیوں پر کوئی شخص سیاہ پوش صاف طور پر نظر آتا تھا۔ وہ مجھ کو دیکھتے ہی چلّایا +

"آہ فنگ خو اس بے وقت آمد کے لئے معافی کا خواستگار ہوں۔ لیکن تم سے ملنا کچھ ایسا ضروری تھا جو یوں چلا آیا" +

"آواز میری بارہا کی سنی ہوئی تھی۔ لیکن اُس وقت میں اُسے قطعاً نہ پہچان سکا۔ بالآخر میں نے حیرانی کے عالم میں اُس سے کہا:۔

"اندر چلے آؤ۔ باہر سردی اور ہوا تیز ہے" +

"مگر جس وقت وہ روشنی میں پہنچا تو اُسے پہچان کر میں حیران و ششدر رہ گیا +

"'تم ؟ لی فان !' میں نے بصد دقت اپنی آنکھوں پر یقین کرتے ہوئے کہا۔ 'کیا میں تمہاری روح کو دیکھ رہا ہوں' ؟

"'نہیں' لی فان نے میری تردید کی 'اطمینان رکھو میں تمہارے سامنے جسم کے ساتھ ہی آیا ہوں'

"'لیکن تم ابتک زندہ کیونکر ہو' میں نے بڑھتی ہوئی پریشانی سے کہا۔ 'عرصہ ہوا حکومت چین کی طرف سے تم کو سزائے موت کا حکم ملا تھا'

"'یہ ٹھیک ہے' اُس نے تسلیم کیا۔ 'لیکن اگر حیات باقی ہو تو انسان جہنم کی آگ سے بھی بچکر واپس لوٹ سکتا ہے'

"'اس کے کیا معنی ؟ مگر ٹھہرو ! —— تم سردی اور بارش میں آئے ہو۔ تم کو قہوہ کی ضرورت ہے۔ پہلے میں تمہارے لئے ایک دو پیالیاں قہوہ کی تیار کرتا ہوں لیکن تم اپنا قصہ بیان کر سکتے ہو۔ اور میں نے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا +

"اُس نے اپنا بھیگا ہوا کوٹ اتار کر ایک کونہ میں رکھدیا۔ اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے

میز پر جھک کر کہنے لگا۔

"در اصل موت کا حکم تو حکومت نے خود ہی تبدیل کر دیا تھا" پھر وہ میری طرف مشکوک نظروں سے دیکھتا رہا۔ "آہ! وہ رات بڑی بھیانک رات تھی۔ جس بدنصیب کے خلاف موت کا فتویٰ صادر ہو چکا تھا اور جس کو علم تھا کہ وہ دنیا میں صرف دو گھنٹوں کا مہمان ہے۔ وہ چین و آرام کی تلاش میں اپنے قیمتی لمحے کیونکر کھو سکتا تھا۔ تاہم میں بیٹھا اُس نیند کو مدعو کر رہا تھا جس کے بعد ایک ایسی، ایسی میٹھی نیند آنے والی تھی۔ جس سے کبھی کوئی سونے والا بیدار نہیں ہوتا۔ اتنے میں کوٹھری کا دروازہ کھلا اور جیل کے داروغہ نے آ کر اطلاع دی کہ حکومت نے میری سزا کو عمر قید میں تبدیل کر دیا ہے۔ آہ تم میری اُس وقت کی خوشی کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ جب معلوم ہوا کہ مجھے دنیا میں زندہ رہنے کی دوبارہ مہلت دی گئی ہے۔ اس کے بعد رشوت — ایک ہیرے کی انگوٹھی کی رشوت — آج تین ماہ ہوئے میری خلاصی کا باعث ہوئی۔ اور اس وقت میں تمہارے سامنے موجود ہوں"۔

"وہ ہنسنے لگا۔ لیکن میں نے اُس کی ہنسی کو روکنے کے لئے کہا:۔

"آخر یہ سزا کس جرم میں ہوئی تھی؟"

وہ کچھ عرصہ خاموش رہنے کے بعد بولا:۔

"ٹینٹش کے تقدس مآب پجاری می یونشی کو قتل کر دینے کے جرم میں"

"مگر تم نے ایسا کیوں کیا" میں نے چونک کر پوچھا۔

"آہ تم نہیں جانتے" وہ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔ "میں نے اُسے ہلاک کر کے کیا چیز حاصل کی۔ دیکھو" وہ کچھ عرصہ جیبوں کو ٹٹولتا رہا۔ پھر اُس نے میرے سامنے گوتم بدھ کا ایک چھوٹا سا کانسے کا بنا ہوا بت میز پر رکھ دیا۔ "تم کہو گے یہ ایک بہت معمولی شے ہے۔ لیکن درحقیقت یہ ایک بہت بڑے کمالات کا ایک مخفی خزینہ ہے۔ یہ بھوتوں کو مسخر کرنے کا آلہ ہے۔" اور وہ کچھ عرصہ کے لئے میری طرف دیکھنے لگا۔ پھر بولا "مگر یہ اتنا ہی سستا نہیں جتنا تم تصور کرو گے۔ سال بھر میں ایک دفعہ انسان کے دل کا خون اس پر ملنا پڑتا ہے۔" وہ رک گیا اور میری طرف مشکوک نظروں سے دیکھنے لگا۔

"اور بصورت دیگر" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"بصورت دیگر جان زی دیوتا کا غضب اُس کے مالک کی جان لے لیتا ہے۔ چنانچہ ٹینٹس کے پجاری پر میرے ذریعہ اُس کا عتاب نازل ہوا۔ اور اس بوڑھے کو اپنی جان ضائع کرنی پڑی۔ تم دیکھ سکتے ہو اس کا خون اس کے جسم پر ابھی تک لگا ہوا ہے"۔

"میں نے دیکھا تو واقعی کہیں کہیں ابھی تک خون کا کوئی نہ کوئی داغ موجود تھا۔ بالآخر میں نے حیرت سے کہا۔

"اگر یہ بات جیسا تم دعویٰ کرتے ہو صحیح ہے تو پھر تم تسخیر الارواح کا عمل کیوں نہیں شروع کر دیتے"۔

"تمہارا اعتراض ٹھیک ہے۔ لیکن جب تک وہ گنڈہ جو توتوکوجی کے بت خانے کے پجاری کے پاس ہے حاصل نہ ہو کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ مگر میں آج اس کے پاس جا رہا ہوں۔ اگر تم چاہو تو تم کو بھی اپنے ساتھ لیجا سکتا ہوں"۔

"پہلے تو میں نے انکار کیا۔ لیکن بالآخر اُس نے مجھے راضی کر لیا۔ اور اُس وقت گیارہ بج رہے تھے تو ہم لوگ گھر سے نکلے۔ بجلی کے قمقموں سے شہر جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ رات نکھری ہوئی تھی اور مطلع بالکل صاف تھا۔ ہر ایک چیز پر چاند کی دلکش اور مدھم نقرئی روشنی کی سرد چمک بہٹ رقص کر رہی تھی۔ اور سمت مشرق میں تھوڑے فاصلے پر آتش فشاں فیوجی کی بادلوں سے ڈھکی ہوئی چوٹی نظر آتی تھی۔ رات زیادہ نہیں گئی تھی پھر بھی برسات کی وجہ سے ابھی سے شہر پر ایک سناٹا اور سکون چھایا ہوا تھا۔ ہمارے گھوڑے سرپٹ دوڑے جا رہے تھے۔ کیونکہ رات کی تاریکی بڑھتی جا رہی تھی اور اندھیرے میں وہ راستہ جس پر ہم لوگ گامزن تھے۔ سخت خطرناک سمجھا گیا ہے۔ ایک گھنٹے کی مسافت کے بعد ہم شہر نارا میں داخل ہوئے تو مطلع دوبارہ تاریک ہونے لگا تھا۔ اور سیاہ بادلوں کے تیز رو ٹکڑے اطراف و اکناف میں اڑتے پھرتے تھے۔ توتوکوجی کا مندر شہر سے تھوڑی دور ہی ہے۔ اس لئے ہمیں وہاں پہنچنے میں پانچ منٹ سے زیادہ عرصہ صرف نہیں کرنا پڑا۔ اُس وقت ہوا تیز چل رہی تھی۔ اور سوکھے ہوئے پتے کھڑکھڑا کر رات کے خوفناک سناٹے کو قطع کر رہے تھے۔ لیکن پھر بھی ہر طرف خاموشی تھی۔ اُس خوفناک سنگی عمارت کے اندر یا باہر کوئی متنفس دکھائی نہ دیتا تھا۔ بی خان نے گھوڑوں کو ایک محفوظ مقام پر باندھا۔ اور دروازہ کے مقابل کھڑے ہو کر اُسے زور سے کھٹکھٹایا لیکن باوجود انتظار کے کوئی جواب نہ ملا۔ پھر دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ مگر مثل پیشتر کے کوئی آواز سنائی نہ دی۔ تیسری مرتبہ پھر کوشش کی گئی۔ لیکن جواب ندارد۔ آخر جب ہم مایوس ہو گئے تو ایک تنگ دریچہ کھلا اور منڈا ہوا سر جس سے بہت لمبی چوٹی وابستہ تھی نمودار ہوا۔ اور ساتھ ہی آواز آئی:۔

"کون ہے؟"

"چند نحیف و ناتواں مسافر جو امن کی تلاش میں یہاں تک آئے ہیں" میرے ساتھی نے عاجزانہ انداز میں کہا۔

"لیکن وہ مقدس بندوں کے پاکیزہ سکون میں کیوں مخل ہوتے ہیں۔ جاؤ یہ وقت یہاں آنے کا نہیں"۔ اور وہ دریچہ کو بند کرکے واپس ہوا چاہتا تھا کہ لی فان چلایا "اگر ٹھہرو پہلے آجائے تو ہوفان سے ہماری نسبت دریافت کرلو"۔ اب اسکا لہجہ تحکمانہ تھا۔

لیکن دریچہ بند کردیا گیا اور چینی کے قدموں کی چاپ کچھ فاصلہ پر جاکر بند ہوگئی۔ نہ معلوم ہم لوگ وہاں کتنے عرصہ تک ٹھہرے رہے۔ پھر اندر کی طرف سے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ مگر دریچہ کی بجائے دروازہ کھلا اور وہی پستہ قد خمیدہ کمر چینی نمودار ہوا۔ ہم کو دیکھ کر جھکا اور بولا:۔

"حضور عالی مقام کا ارشاد ہے۔ کہ سردست معزز مہمانوں کو رخصت نہ کیا جائے اس لئے میں رفیع المرتبت نوواردوں کو اندر آنے کی دینے کا شرف حاصل کرتا ہوں"۔

"ہم لوگ اندر داخل ہوئے شمع کی جھلملاتی ہوئی روشنی عمارت کے اندھیرے کو دور کرنے کی بجائے اُسے اور تاریک کررہی تھی۔ میں اُس پراسرار عمارت کے پتھریلے فرش پر کھڑا چار سو بھیانک دیواروں پر نظریں دوڑا رہا تھا۔ رات کی خاموشی اور مکان کی ویرانی۔ پھر سناٹا اور تنہائی۔ اس پر ان بھیانک اثرات میں اضافہ کرنے کی باد تند سیاہ پردوں کو جو دیواروں پر لٹکے ہوئے تھے۔ پھڑپھڑاتی اور لوبان و عنبر کی تیز بو کو پھیلاتی سائیں سائیں کرتی چل رہی تھی۔ یہ وہ حالت تھی جو قوی سے قوی دل کو حراساں کردیتی ہے۔ کبڑا دروازہ بند کرچکا تو اُس نے ہمیں اپنے پیچھے چلنے کا اشارہ کیا۔ جگہ جگہ پر مشتعل شمعیں جھانک رہی تھیں۔ اور اُن کے کثیف و زہریلے دھوئیں سے پریشان ہوہوکر بڑی بڑی چمگادڑیں ہمارے سروں پر پھڑپھڑاتی ہوئی منڈلا رہی تھیں۔ اور کمروں کا بادامی رنگ کا چوبی سامان دھندلی روشنی میں انگاروں کی طرح چمکتا تھا۔ ہم ایک دوسرے کے پیچھے چلتے اُن سنگی حجروں سے گذر رہے تھے جو دھوئیں یا گرد و غبار کی وجہ سے سیاہ ہورہے تھے۔ کچھ دیر کے بعد ہمارا رہنما ایک دروازہ پر پہنچکر رُک گیا۔ پہلے اُس نے مڑکر ہماری جانب دیکھا۔ پھر ایک چھوٹا سا پیتل کا گھنٹہ جو پاس ہی پڑا ہوا تھا آہستگی بجایا۔ اُس کی گونج ہوا کو مرتعش کرتی ہوئی ایک لمحہ تک سنگی حجروں کی ٹھوس دیواروں سے ٹکراکر سنائی دیتی رہی۔ پھر وہی خاموشی چھاگئی۔ اس کے بعد دفعتاً کسی دور افتادہ مقام سے کسی نغمۂ شیریں کی دلکش و دل آویز صدا جس کے سامنے موسیقی کے روح گداز نغموں کی مقناطیسیت اور چنگ و رباب کی سحر آفرینیاں بھی ماند ہوں ایک ملائم خوشگوار سُر کے ساتھ ہوا کو لرزاتی ہوئی ہمارے کانوں میں آئی۔ مگر رفتہ رفتہ تیز ہوکر تلخ اور خوفناک ہوگئی اور پھر یکلخت بند ہوگئی۔ اسکے بعد ہمارے مقابل کا پردہ ہلا اور ایک تباہ حال لڑکا ہم کو اندر آنے کا اشارہ کرکے اُس کے پیچھے غائب ہوگیا۔ ڈرتے ڈرتے ہم نے اُس کی تقلید کی لیکن میں نے دیکھ لی فان کا چہرہ مسرور تھا۔ اندر ایک لمبا ریشائی نحیف و ناتواں چینی جس کی عمر اسّی سال سے کم نہ ہوگی ناک پر عینک چڑھائے اور سر پر جو روئیدگی سے اس طرح پاک تھا جیسے تربوز، ایک لمبی چوٹی لٹکائے طلائی مسند پر بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کا لاغر جسم ایک سنہری رنگ کی ریشمین چادر میں ڈھپا ہوا تھا۔ اُس کا رنگ زرد تھا۔ گویا ہزار سال کی بیماری کے بعد چارپائی سے اُٹھا ہے۔ اور اُس کے رخساروں میں گڑھے پڑے ہوئے تھے۔ ہم کو دیکھتے ہی بولا:۔

"دن کے سکوں سوز ہنگامے۔ غیروں کے جرم و عصیاں دیکھنے کے لئے اور رات کی تنہائی کا سکوت اپنے نیک و بد افعال کی پڑتال کے لئے ہے۔ پھر ایسے وقت میں اگر میں نے تمہیں پیشتر ہی سے ملنے کی اجازت نہ دی ہوتی تو تم اندر نہ آسکتے تم نے کچھ شک نہیں ایک تنہائی پسند بچاری کا سکون توڑا ہے۔ لیکن تمہیں اسکی رعایت پہلے سے مل چکی ہے۔ مگر بتلاؤ کیا چاہتے ہو"۔

"لی فان لرزہ براندام آگے بڑھا۔ اور کانپتے ہوئے ذرا جرأت آمیز الفاظ میں بولا:۔

"سیدی! میں چان زی دیوتا کے جرس اور اُس کے کارہائے نمایاں کو دیکھنے کے لئے آیا ہوں۔ جس کی آپ نے مجھے کل اجازت دی تھی"۔

"اچھا بیٹھ جاؤ۔ بڈھے چینی نے جس کا اداس و غمگین چہرہ بڑا خوفناک معلوم ہوتا تھا ہاتھ سے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اور مسند سے اُٹھ کر خود کمرے کے کونے میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد پھولوں کی بھینی بھینی مہک اور عود و عنبر کی تیز بو آنے لگی۔ اور اُس مقام سے جہاں چینی چٹائی پر بیٹھا ہوا تھا سرخ روشنی کبھی مدھم کبھی تیز ہوتی تھی۔ کوئی نصف گھنٹہ تک وہ اپنا عمل کرتا رہا پھر فراغت حاصل کرنے کے بعد وہ ہمارے پاس آیا اور یوں بولا گویا تقریر کررہا ہے:۔

"کوئی مخلوق ایسی نہیں جو انسان کی طرح مصائب و تکالیف برداشت کرنے کی خوگر ہو۔ حیات کے جانکاہ خارستان کو عبور کرنے کے لئے اور جسم و جان کے اتحاد کو برقرار رکھنے کی کشمکش اور جد و جہد میں انسان کی کتنی قوت صرف ہوتی ہے لیکن زندگی کی تمام تلخیاں اُس وقت کافور ہوجاتی ہیں اور ہم اس جہان کون و فساد کو اُس کے دشوار گذار مراحل سمیت خوشی اور مسرت کا گہوارہ سمجھتے ہیں۔ جب ہماری کوئی تحقیق پایۂ تکمیل کو پہنچتی ہے۔ دنیا بری ہے۔ اُس کے لوازم و اجزا بُرے ہیں۔ ان کو مانتے ہوئے بھی انسان موت و حیات کی کشمکش میں بھی اُس کے مناظر اور نقش و نگار دل سے محو نہیں کرتا۔ وہ مصیبت اُٹھاتا ہے۔ دُکھ سہتا ہے۔ تکلیف جھیلتا ہے۔ لیکن دنیا

سے رخصت ہونا نہیں چاہتا۔ لیکن یہ سب مصائب اُس وقت معدوم ہو جاتے ہیں۔ جب ہم کسی مقصد میں جسے ہم اپنا نصب العین قرار دے لیں کامیاب ہوتے ہیں۔ دیوتا چان زی کا گھنٹہ دنیا کی مشترکہ روحانی طاقتوں کی لمبی تجسّس و کاوش کا نتیجہ ہے۔ آجکل سائنس کے اصولوں کی مدد سے ہر ایک چیز کی نقل تیار ہو رہی ہے۔ فی الحقیقت نقلی چیزوں کو ہی بنانا اگر کمالاتِ انسانی میں داخل ہے تو اس میں شک نہیں سائنس ایک شیطانی تحریک کا نام ہے۔ اور اسی شیطانی تحریک کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کرنے کے لئے یہ گھنٹہ ساخت کیا گیا ہے"۔

وہ کچھ عرصہ کے لئے رُک گیا اُس کی آواز میں ایک عجیب حلم پایا جاتا تھا۔

پھر وہ کمرہ کے دوسری جانب ایک الماری کے پاس گیا جسمیں بیشمار چھوٹی چھوٹی شیشیاں۔ مفرد و مرکب دوائیں اور لاتعداد دیگر چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ اور اُس میں سے ایک زرد رنگ کی ضخیم کتاب نکالی جس میں معلوم ہوتا تھا اُس نے بہت سے مسودے، نسخے اور یادداشتیں جمع کر رکھی ہیں۔ اور اُسے لیکر ہماری جانب آیا۔

"یہ کتاب آج سے پانصد برس پیشتر شہنشاہ میداگر کے زمانہ میں لکھی گئی تھی"۔ اس کو کھول کر اُس نے اُسے دُہرایا تو وہ طائرِ نیم بسمل کی مانند کانپ رہی تھی۔ پھر کتاب کو یکلخت بند کر کے بولا:-

"خیر میں ان فردعات کو نظرانداز کر کے اصل مطلب کی طرف متوجہ ہوتا ہوں یہ میری غلطی تھی۔ ابھی تم ان چیزوں کے سمجھنے کے اہل نہیں۔ آؤ میرے پیچھے آؤ"۔ اور وہ ہمارے آگے آگے چلنے لگا۔ دروازہ سے گذر کر ہم لوگ اُس جگہ پہنچے جہاں پتھر کا ایک فراخ زینہ تھا۔ اُس کو طے کر کے ایک چوڑے صحن میں پہنچے جس کے چاروں طرف پتھر کے بنے ہوئے متعدد حجرے تھے۔ اور وسط میں مہاتما بدھ کا ایک عظیم الشان دو سو فٹ اونچا سنگی بت تھا۔ جس کا ایک ہاتھ پہلو میں رکھا ہوا اور دوسرا کہنی کے سہارے اوپر کو اس طرح اُٹھا ہوا تھا جیسے چوک پر گاڑیوں کی آمد و رفت کو قابو میں رکھنے کے لئے سپاہی کا ہاتھ اشارہ کے لئے اُٹھا ہوتا ہے سر پر سونے کا تاج تھا۔ اور سامنے سونے کے شمعدان اور چاندی کے گلدان رکھے ہوئے تھے۔ اور اُس کے سر کے گرداگرد چینی ساخت کے بیشمار چھوٹے چھوٹے بت حالہ کے طور پر لگے ہوئے تھے۔ اُس اندھیرے مقام پر بڑے بت کے سر اور آنکھوں میں نصب شدہ لعل اور یاقوت اس طرح جگمگا رہے تھے جس طرح شبِ دیجور کی تاریکی میں چرخِ چنبری پر تارے۔ مشعل کی دھندلی روشنی میں تنہائی اور نفس کشی کی وہ تمام ابدیتیں جو ریاضت کی وجہ سے اُس بڈھے پجاری خوہوفان نے گذاری تھیں۔ اُس کی آنکھوں میں سے جھانک رہی تھیں۔ جو حلقوں میں اندر دھنسی ہوئی تھیں۔ پھر اُس کے پژمردہ چہرہ پر مختصر سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اور سامنے دیوار پر اشارہ کرتے ہوئے اُس نے میرے ساتھی سے آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ دریافت کیا۔ لی فان دیوانوں کی طرح سامنے اُس شیر کی تصویر کو دیکھ رہا تھا۔ جو دیوار پر بنی ہوئی انسانی ہنر کے کمالِ فن کا ثبوت دے رہی تھی۔ دفعتاً کسی نادیدہ مقام سے گھنٹے کی آواز کا وہ شورِ قیامت خیز پیدا ہوا کہ الاماں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آسمان سے بجلی گری اور عمارت ریزہ ریزہ ہو رہی ہے۔ اُس کی گونج خانقاہ کے ہر حصہ میں پھیل کر دس گنا شدت اختیار کر چکی تو آخر یہ آواز مدھم ہوتی ہوئی بالکل بند ہوگئی۔ تھوڑی دیر تک سکوت رہا۔ مگر پھر وہی گھنٹہ بجا اور ویسی ہی بھیانک اور مہیب آواز پیدا ہوئی۔ اور کچھ عرصہ بتدریج تیز ہوکر گم ہوگئی"۔

یہانتک پہنچکر چینی رُکا۔ اور اُس نے پہلے ابوالہول کے خوفناک بت کو جو اہرام کے پاس کسی کہن سال محافظ کی طرح لیٹا ہوا تھا۔ پھر آسمان کو دیکھا۔ رات کی مشکیں نسب اور لیلیٰ تمثال شہزادی اپنی سیاہ عنبری چادر پھیلا رہی تھی۔ شفاف نیلے آسمان پر تارے ایک ایک کر کے نمودار ہو رہے تھے۔ وہ تیز جگمگاتے ہوئے تارے جو بلادِ مشرق کے سوا کہیں نظر نہیں آتے۔ پھر کہانی کو جاری رکھتے ہوئے بولا:-

"آہ آج یہاں بیٹھکر بھی جب اُس منظر کا تصور کرتا ہوں تو روح کانپتی ہے اور خوہوفان پجاری کی مرجھائی ہوئی شکل اس طرح واضح نظر آتی ہے۔ جیسے آپ لوگوں کے چہرے۔ خیر ——— گونج کے بند ہونے پر بڈھا پجاری بولا:-

"فقیہوں اور راہبوں کے سوا کسی اور مرد دنیادار کا اس جگہ پر گذر محال و ناممکن ہے مگر تم نے چونکہ تین ماہ تک اس جگہ ریاضت کی ہے۔ اس لئے یہ کمالات تمہیں دکھائے جاتے ہیں"۔

"اور اُس نے ایک اونچے مقام سے کانسے کا لٹکتا ہوا ایک جرس اُٹھایا میں نے دیکھا۔ لی فان خفیف سا کانپا۔ اُس کے چہرہ کی رنگت پہلے سرخ۔ پھر ہلدی کی طرح زرد ہوگیا۔ اُس کے ہونٹ بے رنگ ہوگئے اور دبی ہوئی آواز میں اُس کے منہ سے مسرت کی چیخ نکلی۔ سانس بہت تیزی سے آنے لگا۔ اوم۔ پدی ہونگ کا ورد کرتے ہوئے پجاری نے ایک چھوٹی سی چوبی منگلی اُٹھا کر گھنٹہ پر ضرب لگائی۔ ایک مدھا شور رات کے سکوت میں بھیانک اور مہیب گونج پیدا کرتا ہوا اُٹھا اور ساتھ ہی خانقاہ کے ہر حصہ سے ایک عجیب غل سُنائی دیا اور بہت سے گھنٹوں کے بجنے کی آوازیں پیدا ہوئیں۔ پھر شور ہر لحظہ قریب آنے لگا۔ یہانتک کہ اُس کمرہ میں پہنچکر جہاں ہم تھے اس طرح کی خوفناک آواز پیدا ہوئی جیسے زور سے بجلی کڑکتی ہو اور دفعتاً وہ دیوا

پھٹ گئی جس پر شیر کا نقش تھا اور شیر ایک دہاڑ مار کر مجسم ہوگیا۔ یقین کیجئے اُس وقت میری حالت بہت غیر تھی۔ رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ میں بیٹھ گیا تو میرے حواس بجا ہوئے۔ پُجاری نے لی فان کے چہرہ کی طرف دیکھا جو فرط حیرت و استعجاب سے مضمحل ہو رہا تھا پھر اُس نے ایک تھیلی سے تھوڑا سا سیاہ سفوف چٹکی میں لے کر دہکتے ہوئے کوئلوں پر پھینکا اور کثیف دھوئیں کا ایک گہرا بادل کمرہ کے ہر حصہ میں محیط ہوگیا۔ تھوڑی دیر تک تو اس دھوئیں کی وجہ سے کچھ نظر نہ آیا۔ مگر رفتہ رفتہ جب دھواں منتشر ہوا تو بدھ کی دیوقامت سنگی مورت اندازِ وقار سے ہلی اور اپنے دونوں ہاتھوں کو اُٹھا کر آسمان کی طرف بلند کیا۔ پھر ویسی ہی مُہیب آواز سُنائی دی اور بُت ویسے کا ویسا ہو کر رہ گیا۔

”اس قسم کی دو تین اور کرامات دیکھنے کے بعد جب ہم لوگ گھر کو واپس لوٹے تو رات خاصی جا چکی تھی۔ گھوڑوں کی ٹاپوں کی کرخت آواز رات کی ویرانی اور سنسانی میں بڑی وحشتناک گونجیں پیدا کر رہی تھی۔ اور خاموش وادی میں دوڑتے ہوئے مرکبوں کے قدم تیز تیز ادھر اُدھر اُٹھ رہے تھے۔ میں نے ایک دفعہ لی فان کو بُلایا۔ مگر وہ بالکل خاموش رہا۔ ممکن ہے میری آواز اُس نے سنی ہی نہیں یا ویسے ہی جواب کسی مصلحت کی بنا پر نہیں دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی گہرے معاملہ کو بغور سلجھا رہا ہے۔ بڑی دیر کی خاموشی کے بعد اُس کے مُنہ سے بے اختیار چیخ نکلی۔ وہ کہہ رہا تھا:۔

”میں نہیں چھوڑونگا۔ میں ہرگز نہیں چھوڑونگا“

”کیا؟“ میں نے حیرانی سے دریافت کیا۔

”گھنٹہ۔ اس بڈھے منحوس راہب کا مافوق الادراک گھنٹہ“

”میں نہیں ٹھہرا اور طنزاً کہا ”لی فان! تم قدرے بیوقوف بھی ہو۔ شاید تمکو معلوم نہیں کہ اگر تم پکڑے گئے تو تمہاری خلاصی خنجر ہی کرے گا“

”اُس نے پہلے میری جانب حقارت سے دیکھا پھر جواب دیا ”ہر امر میں فتح و شکست کا امکان مساوی ہوتا ہے“

”تھوڑے عرصہ بعد ہم اوساکا پہنچ گئے۔ پچھلی رات کا وقت اور ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کسی اکے دکے سپاہی یا گھر کو جاتے رکشا قلی کے سوا راستہ میں کوئی متنفس نظر نہ آتا تھا۔ میرے مکان میں بھی ہر طرف اندھیرا اور گورستان کی سی بھیانک خاموشی تھی۔ احاطہ کا پھاٹک کھولکر میں اندر داخل ہونے لگا تو لی فان مجھ سے معذرت کر کے رخصت ہونے پر مصر ہوا۔ میں نے بہتیرا سمجھایا اور اپنے پاس ٹھہرانے کی کوشش کی۔ مگر اُس نے نہ نہ کر کے گھوڑے کو ایڑ لگا ہی دی اور تھوڑی دور نظر آنے کے بعد رات کی تاریکی میں غایب ہوگیا۔

اس رات کے ایک ماہ بعد جبکہ میں اس معاملہ کو بالکل بھول گیا تھا۔ ایک شب بہت دیر گئے میں شہر کے ان تنگ اور غلیظ بازاروں سے جہاں گندے فقیر جن کی گھناؤنی صورتیں دیکھ کر طبیعت بے اختیار مالش کرتی تھی۔ قدم قدم پر بیٹھے اپنی مکروہ آوازوں سے گذرنے والوں کو اپنے بدنوں کے فرضی اور نمائشی آزار دکھلا رہے تھے۔ گذرتا ہوا گھر آرہا تھا۔ اُس وقت آسمان جو پہلے صاف اور نکھرا ہوا تھا ابر آلود ہو رہا تھا۔ سیاہ رنگ کے چھوٹے چھوٹے بادل۔ کوّے سے کے پروں سے زیادہ سیاہ۔ چاروں طرف پھیلے ہوئے گرج رہے تھے۔ اور جانبِ بحر انکی سیاہی میں بجلی تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد کھنکھجورے کی مانند کوند رہی تھی۔ میں ابھی تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے اپنی جانب کھینچا۔ مڑا تو دیکھا کہ ہون لی فان کھڑا ہنس رہا ہے۔ اُس کی آنکھیں روشن تھیں اور سپید دانت چمک رہے تھے۔

”آخر میں نے پا لیا“ اُس نے مجھ سے کہا ”میں نے پا ہی لیا“

”کیا“

”جان زی دیوتا کا گھنٹہ“

”تم نے؟ مگر وہ کیسے؟“

”وہ اپنے منہ کو میرے داہنے کان کے پاس لاکر مہین آواز میں بولا ”اُسے قتل کرنے کے بعد“ اور پیچھے ہٹ کر مسکرایا۔ مسرتِ کامیابی کا خندۂ زیرلب اُس کے خبث باطن سے بھی زیادہ بھیانک تھا۔

”مجھے دکھاؤ تو“ میں نے اُس سے کہا اور وہ کھلکھلا کر ہنسا۔ پھر اِدھر اُدھر دیکھ کر کہنے لگا:۔

”یہ جگہ موزوں نہیں چلو سڑک کے پار شراب خانہ میں چلیں“۔ اس نے بھیڑ کو دیکھتے ہوئے سامنے کی دوکان پر اشارہ کیا ”سربازار کھڑے ہو کر گفتگو کرنا معیوب ہے“

”اور ہم دونوں سڑک عبور کر کے شراب خانہ میں داخل ہوئے۔ ادنیٰ قیمت کی تلخ شراب کی بدبو اور تمباکو کا دھواں کمرہ میں پھیلے ہوئے تھے۔ ایک جانب شرابیوں کی بھیڑ تھی۔ دوسری طرف کلوار اور اُس کے ملازم کھڑے تھے۔ شراب کے دو گلاسوں کو طلب کر دینے کے بعد ہم ایک میز پر بیٹھ گئے تو وہ بولا ”آہ دوست تم میری خوشیوں کا اندازہ تو کرو۔ میں دنیا کے کتنے بڑے خزانے کا مالک ہوں“

”میں نے نفرت سے کہا ”لی فان! مجھے خدشہ ہے تمہارے افعال تمہارے لئے جہنم میں ایندھن کا کام نہ دیں“

”مگر اُس نے میری بات کو اَن سُنا کر کے کہا ’لو دیکھو تم کو یقین نہیں آتا تھا. کیا یہ وہی گھنٹہ نہیں‘؟

”میں نے غور سے اُسے دیکھا تو معلوم ہوا گھنٹہ وہی ہے۔ جسے میں نے فوہو فان کے پاس اُس رات دیکھا تھا۔ پھر وہ بولا ’اب تم دیکھو گے میں کیا کچھ کرتا ہوں۔ مگر یار آہ فنگ خدا یقیناً تم کو تکلیف نہ ہوگی۔ اگر میں آج کی رات تمہارے ہاں ہی بسر کروں۔ میں تھکا ہوا ہوں۔ اس لئے واپس نہیں جا سکتا‘ +

” ’بہتر۔ مگر مجھے خدشہ ہے کہیں توفوکوچی اور سینٹس کے پجاریوں کی طرح میرا انجام بھی حسرتناک نہ ہو‘۔ میں نے طنزاً کہا جس پر وہ بے اختیار ہنسا +

” ’ہا ہا ہا! ہو ہو ہو !! تم اور انجام —— ہا ہا ہا! ہو ہو ہو !! — آؤ چلیں تم اور —— ہا ہا ہا‘

”راستہ جلدی جلدی طے کرنے کے بعد ہم مکان پر پہنچے۔ اُس وقت تارے کہیں کہیں ٹمٹما رہے تھے۔ کچھ ننھی ننھی بدلیاں فضا میں منڈلا رہی تھیں جن میں بارش کے جمع شدہ پانی پر برقی لیمپ کی شفاف و بے داغ روشنی بکھر رہی تھی۔ اور کسی مینڈک کی کرخت آواز عجیب زیر و بم کے ساتھ اُٹھتی تھی۔ جو رات کے سناٹے میں مرنے والے انسان کے ٹوٹتے ہوئے سانس کی طرح تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد سنائی دیتی۔ نوکر کو لی فان کیلئے بستر تیار کرنے کا حکم دینے کے بعد ہم دونوں بڑے کمرے میں بیٹھ کر قہوہ پیتے رہے۔ دو تین گھنٹے بعد جب میں سونے کی نیت سے اُٹھا تو لی فان نے مجھ سے کہا:۔

”بہتر ہو گا تم ان اشیا کو اپنی حفاظت میں رکھ لو۔ میں کل تم سے جاتی دفعہ لے لونگا۔ اور اُس نے نکال کر دی گھنٹہ۔ کانسے کا بت اور ایک کسی سیاہ سفوف سے پُر تھیلی میرے حوالے کئے۔ میں نے ان سب کو ایک دفعہ بغور دیکھنے کے بعد آہنی تجوری میں مقفل کر دیا۔ اور خود اپنے کمرے میں چلا گیا۔ بستر پر لیٹتے ہوئے میں نے سونے کی بہت کوشش کی لیکن نیند شاید اُچٹ گئی تھی۔ باوجود بہت دیر تک کروٹیں لینے کے آنکھ نہ لگ سکی۔ ایک عجیب پریشانی جی کو بے چین کر رہی تھی۔ اور رات کے سناٹے میں طرح طرح کے ہولناک اور متوحش خیالات دل میں پیدا ہو رہے تھے۔ دو گھنٹے تک آنکھ بند رکھنے کے بعد بھی نیند پاس نہ پھٹکی۔ تو میں نے اُٹھ کر کھڑکی کھولی۔ باہر چاند نکلا ہوا تھا۔ اور اُس کی دھیمی روشنی باغ میں لہرا رہی تھی۔ ہوا عشق پیچے کی بیلوں میں سے سائیں سائیں کرتی ہوئی چل رہی تھی۔ مگر میں نہیں جانتا اُس وقت اتنا بزدل کیوں بنا جا رہا تھا۔ سینے میں دھڑکن پاؤں میں لغزش۔ دماغ میں عجیب اندیشوں کا ہجوم۔ کیا تقدیر کوئی نیا رنگ کھانا چاہتی تھی؟ میں نے خیال کیا ممکن ہے روشنی کی وجہ سے نیند نہیں آتی۔ اس لئے پہلے گھڑی دیکھی، معلوم ہوا ڈیڑھ بجا ہے۔ پھر روشنی گل کر کے بستر پر دوبارہ لیٹ گیا اتنے میں دفعتہ بند کمرہ سے کسی کے مسلسل کھانسنے کی بلند آواز آئی۔ پھر ساتھ ہی ایک مدھم چیخ میرے کانوں میں پہنچی۔ واقعی یہ کسی آدمی کی چیخ تھی۔ جو اندھیرے اور سناٹے میں بڑی خوفناک تھی۔ پھر کسی کمرے کا دروازہ زور سے کھلا اور اس سے زیادہ زور کے ساتھ بند ہوا۔ اور کسی کے سرپٹ دوڑنے کی آواز آئی پھر خاموشی چھا گئی۔ میں گھبرا کر بستر پر سے اُٹھا۔ دل زور زور سے دھک دھک کر رہا تھا۔ اُٹھنے کے بعد پہلا احساس یہ ہوا کہ کوئی میرے کمرے میں موجود ہے کیونکہ کسی کے تنفّس کی مدھم خوفناک آواز آ رہی تھی۔ کوئی شخص تجوری کے پاس کھڑا تھا میں گھبرا کر ٹھٹک گیا۔ یہ کون تھا؟ —— کوئی چور؟ — یا لی فان کے افعال کی تفتیش کرتی ہوئی پولیس؟ آخر کیوں وہ میرے کمرے میں داخل ہوا۔ یکلخت بادل ہٹے تو چاند کی ہلکی روشنی میں جو کھڑکی کی راہ کمرہ میں داخل ہو رہی تھی۔ میں نے اُسے پہچانا۔ ایک ہلکی چیخ میرے منہ سے نکلی اور میں لڑکھڑا کر دو قدم ہٹ گیا +

”یہ تو لی فان تھا +

”بڑی مشکل سے اپنے حواس کو ٹھکانے لگاتے ہوئے۔ میں نے غصہ میں اُس سے پوچھا ’آخر کس نیت سے اس وقت تم یہاں آئے ہو‘؟

”مگر وہ خاموش تھا۔ اُس کا رنگ بالکل سفید تھا۔ سرد پسینہ کے قطرے اُس کی پیشانی پر بہہ رہے تھے۔ اور وہ اس طرح کانپ رہا تھا جیسے بادِ نسیم کے آگے کسی نوزائیدہ پیڑ کے نازک پتے۔ اُس نے ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ پھر خوف سے لڑکھڑاتا ہوا دروازہ کے پاس جا کر اُسے —— کھول دیا +

کسی دراز قد چینی کی دھندلی صورت جس کی چھوٹی چھوٹی گول آنکھیں اور منڈے ہوئے سر سے لٹکتی ہوئی بہت لمبی چوٹی نمایاں طور پر نظر آتی تھی۔ اندھیرے سے نکل کر زینہ کے نچلے حصہ پر سے بڑی آہستگی کے ساتھ اوپر چڑھتی دکھائی۔ دو منٹ کے بعد وہ اوپر پہنچے تو ہم دونوں نے اُسے پہچانا —— وہ توفوکوچی مندر کا بڈھا پجاری فوہو فان تھا۔ میں نے دیکھا اُس کی پتھرائی ہوئی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ اور اُس کی زبان اور ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور میرے پاس سے گزر کر لی فان کے مقابل جا کھڑا ہوا۔ کچھ دیر وہاں ساکت و صامت کھڑے رہنے کے بعد اپنے تھرتھراتے ہوئے زرد ہاتھ آگے پھیلا کر اُس نے گڑگڑاتی ہوئی آواز میں جو بڑی خوفناک

تھی مطالبہ کیا :-

' دیدو میرا مسروقہ مال واپس دیدو۔ لاؤ لاؤ اُسے لاؤ۔ تم اُس امانت کے اہل نہیں۔ لاؤ میں تم سے کہتا ہوں لاؤ'

"اُس کی بھاری آواز سے یوں معلوم ہو رہا تھا۔ گویا وہ کنوئیں کے اندر سے باتیں کر رہا ہے ۔

"لی خان بے حس و حرکت بت بنا کھڑا تھا۔ اور میری حالت ! اُف مجھ میں لہو کا دورہ ختم ہو چکا تھا۔ آنکھوں سے کچھ دیکھنے سے جواب دیدیا تھا لیکن کسی غیبی ترغیب سے متاثر ہو کر میں نے جلدی سے اپنا ہاتھ سرہانے کی جانب بڑھایا۔ جہاں رات کو سوتے وقت میں اپنا پستول بھر کر رکھا کرتا تھا۔ مگر معلوم ہوا وہ غائب ہے۔ خدا معلوم کسی نے چرا لیا یا میں رکھنا ہی بھول گیا۔ بہرحال وہ چیز جو اس وقت سب سے زیادہ کار آمد ہو سکتی تھی مفقود تھی ۔

"اتنے میں بڈھا چینی دوبارہ بولا ' لاؤ ـــ اچھا کیا تم واپس نہیں دوگے ؟ ـــ بہتر بہتر اور وہ دو قدم پیچھے ہٹا پھر نظروں سے غائب ہو گیا۔ ہم دونوں متحیر و مبہوت کچھ عرصہ کے لئے خاموش کھڑے رہے۔ اور ہم دونوں میں جو شخص پہلے بولا وہ لی خان تھا۔ کہنے لگا :-

"حیرت۔ استعجاب۔ تحیر۔ تعجب اس معاملہ کے بعد دوبارہ کبھی اسقدر نہ ہوگا۔ ایک مردہ انسان اور میرا اپنا قتل شدہ انسان زندہ ہو کر آتا ہے۔ خیر اب آنے دو ـــ"

"شرو' میں نے اُس کا بازو زور سے اپنی جانب کھینچکر اُسے ٹوکا' تم نے مجھے دھوکا کیوں دیا کہ تم بڈھے پجاری کو قتل کر چکے ہو؟'

"اُس نے حقارت سے میری طرف دیکھا۔ پھر بولا: آہ فنگ خو نادان یہ دیکھو میں نے قتل کرنے کے بعد بڈھے راہب کی چوٹی کاٹ لی تھی۔ اب اُسکے قتل کا یقین آیا ؟' اور اُس نے مجھے وہی چوٹی دکھائی جو فوہو خان کے سر پر میں اُس رات دیکھ چکا تھا۔ پھر وہ مجھے وہیں چھوڑ کر اپنے کمرہ کی طرف چلا گیا۔ اُس کے جانے پر دروازہ بند ہوا تو میں بھی دراز ہو گیا۔ اور لیٹتے ہی آنکھ لگ گئی۔ مگر رات بھر متوحش خواب آتے رہے۔ یاد نہیں کب تک سویا۔ لیکن جب آنکھ کھلی تو پہلی آواز جو میرے کانوں میں آئی وہ شل بیشتر کے لی خان کے چیخنے کی تھی ۔

"آہ فنگ خو۔ آہ فنگ خو! کوئی اُس کا گلا گھونٹ رہا تھا۔" آہ فنگ خو آہ فنگ خو! کوئی اُس کا گلا زور زور سے گھونٹ رہا تھا" آہ فنگ خو۔ آہ فنگ خو' کوئی اُس کو ہلاک کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس کی دردناک چیخیں رُک رُک کر میرے کمرے میں آ رہی تھیں۔ وہ مدد کے لئے مجھے پکار رہا تھا میں نے لحاف کو گھبراہٹ میں اُٹھا کر دور پھینکا۔ اور بھاگتا ہوا لی خان کے کمرے کی طرف گیا۔ دروازہ کھول کر اندر گیا تو دیکھا لی خان پلنگ سے نیچے اوندھا پڑا ہوا تھا۔ دروازہ پر ہی رُک کر میں نے اُسے آواز دی۔ لیکن جواب نہ ملا۔ پھر پاس جا کر اُس کے دل پر ہاتھ رکھا۔ تو معلوم ہوا

" وہ مر چکا تھا ۔

"واقعی وہ مر چکا تھا۔ بڈھے چینی کی قطع کی ہوئی چوٹی جو اُس نے مجھے دکھائی تھی اُس کے گلے میں پھنسی ہوئی تھی۔ معلوم ہوتا تھا اسی کی وجہ سے اُس کی موت ہوئی ہے۔ دوسرے دن میں اُٹھا تو دیکھا خون کے بیشمار قطرے اُسی جگہ پر پڑے ہوئے ہیں جہاں رات بڈھا پجاری لی خان کے سامنے کھڑا دیکھا گیا تھا۔ پھر پستول بھی میرے سرہانے کے نیچے پڑا ہوا مل گیا اور اسی دن لی خان کو دفن کر دینے کے بعد میں نے وہ چوٹی بھی آتشدان میں جلا دی جو رات اُس کی موت کا باعث ہوئی تھی اتفاقاً اسی دن مجھے کسی کام کی وجہ سے ٹوکیو جانا پڑا۔ مگر دوسرے دن ہی علی الصبح میں مکان پر واپس آ گیا صبح صادق کا وقت تھا۔ چاروں طرف چیل اور دیودار کے بلند قامت درختوں پر طیور چہچہا رہے تھے۔ تند ہوا درختوں کے گنجان پتوں میں سرسراہٹ کے ساتھ چل رہی تھی۔ اردگرد کی پہاڑیوں سے پانی ہلکی شورش کے ساتھ گر رہا تھا۔ اور موجوں کے ساحل بحر کو تھپتھپانے کی مدھم آوازیں آ رہی تھیں۔ مجھے سخت حیرانی ہوئی کہ میرا ملازم باوجود میرے کھانسنے کے کیوں میرے استقبال کے لئے حسب معمول سیڑھیوں پر نمودار نہیں ہوا۔ خیر میں خود اوپر گیا۔ دیکھتا ہوں میرے سونے کے کمرہ کا دروازہ کھلا پڑا ہے۔ لیکن اندر قدم رکھا ہی تھا کہ خوف سے چیخ مار کر پیچھے ہٹا۔ تجوری کا تالا ٹوٹا پڑا تھا۔ اور میرا خادم اُس کے پاس ہی بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔ دیوتا جان زنی کا بت اُس کے ہاتھ میں تھا اور ویسی ہی سیاہ چوٹی اُس کی گردن میں پیوست تھی جس سے ایک روز پیشتر لی خان کی موت واقع ہوئی تھی۔ میں نزدیک گیا تو غور کے بعد معلوم ہوا وہ مر چکا ہے۔ لیکن دفعتہً میرے پیچھے کا دروازہ کھلا اور میں گھبرا کر مڑا تو دیکھتا ہوں بڈھا پجاری آہستہ آہستہ باہر جا رہا ہے۔ وہی منڈا سر۔ وہی لمبی چوٹی۔ وہی زرد چہرہ۔ میں اُسے کس طرح بھول سکتا تھا"

آہ فنگ خو نے اپنی ہوشربا داستان ختم کی۔ تو کچھ عرصہ کے لئے فضا میں کامل سکوت طاری رہا۔ بالآخر ترک نوجوان اشتیاق آمیز نظروں سے چینی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا ۔

"مگر کیا وہ گھنٹہ اور بت آپ کے پاس ہیں ؟"

"ہاں۔ لیکن خو ہوفان نے اُسے مجھ سے واپس لے لینے کی کوشش نہیں کی" چینی نے جواب دیا +

اس کے بعد ہم لوگ موٹر پر سوار ہوکر رات کے اندھیرے میں ہوٹل کیسٹر روانہ ہوئے اور تھوڑی دیر بعد قاہرہ کے اُن تنگ کوچوں اور عجیب بازاروں میں سے گزر رہے تھے جہاں گیس کے لیمپوں کی روشنی میں کہیں کہیں کوئی مریل کتا با بدحال عرب نظر آجاتا تھا۔ کئی کوچوں کو طے کرنے کے بعد ہم شہر کے اُس حصہ میں جا پہنچے جو آبادی کے لحاظ سے قدرے گنجان ہے۔ لمبے اور کشادہ بازاروں میں لاتعداد لیمپ جگمگا رہے تھے لیکن خلقت کا ہجوم یا شور و غل زیادہ نہ تھا۔ پان سگرٹ فروشوں قہوہ خانوں اور رسٹورانٹوں کے آگے کچھ کچھ بھیڑ تھی یا کہیں کہیں حیاباختہ عورتیں اِدھر اُدھر گھوم رہی تھیں +

آٹھ بج رہے تھے کہ موٹر ہوٹل کی اونچی دیوڑھی کے نیچے پہنچکر رکا۔ کھانا تیار تھا۔ چنانچہ نو بجے اس سے فارغ ہوکر ہماری مختصر سی جماعت جو قاہرہ میں سیاحت سیر کے لئے آئی تھی۔ نو بجے کی ایکسپرس ٹرین سے قاہرہ کو خیرباد کہکر گیارہ بجے بندر سعید کے سٹیشن پر اُتری۔ جس وقت میں ٹرین میں سے اپنا مختصر سا سامان قلی کے حوالہ کرکے نکلا تو دیکھا ایک لمبا شخص جس کے سر پر ویسی ہی ٹوپی تھی۔ جیسی قاہرہ میں آہ فنگ خو نے پہن رکھی تھی۔ سیکنڈ کلاس کے ڈبہ سے اُتر رہا ہے مگر میں کو اچھی طرح پہچان نہ سکا۔ کیونکہ وہ جلدی ہی اس بھیڑ میں چھپ گیا جو ٹرین سے اُتر اُتر کر باہر جارہی تھی۔ میں ایک گاڑی میں بیٹھ کر گھاٹ کی جانب روانہ ہوا۔ لیکن جس وقت گاڑی ریوڈی کا مرس پر پہنچی تو پیچھے سے ایک موٹر شور کرتی ہوئی آئی اور ایک چینی کی دوکان پر آکر ٹھہر گئی۔ جس کے آگے سے ہم گذر رہے تھے وہی شخص جسے میں نے سٹیشن پر دیکھا تھا موٹر سے اُترا اور چشم زدن میں دوکان کے اندر چلا گیا۔ ریوڈی لامیونسیل سے مڑ کر جب میری گاڑی شارع سلطان میں پہنچی تو دوسری مرتبہ وہی موٹر پھر بھوں بھوں کرتی پاس سے نکل گئی۔ ساحل پر پہنچکر میں نے گاڑی کو رخصت کیا۔ اور خود جہاز کی جانب روانہ ہوا۔ گھاٹ پر برقی لیمپوں کی روشنی تاروں کی مانند چمک رہی تھی۔ سمندر کی لہریں ساحل سے ٹکرا ٹکرا کر ایک دلنواز نغمے پیدا کر رہی تھیں۔ اور سطح آب پر چلنے والی پُرنم ہوا کنارے کی چھوٹی چھوٹی کشتیوں کو جھولا جھلا رہی تھی۔ چوں کہ رات بہت جا چکی تھی۔ اس لئے پانی پر سیر کرنے والوں کی آخری کشتیاں اس وقت ایک ایک کرکے رخصت ہو رہی تھیں جب سب مسافر سوار ہو چکے تو ٹھیک ایک بجے ہماری روانگی ہوئی۔ جہاز کے اگلے حصہ میں لنگر اٹھانے کا شور ہوا۔ اس کے پانچ منٹ بعد جہاز نے حرکت کی اور تھوڑی دیر میں وہ بحر عمیق کی متلاطم موجوں میں مصروف خرام تھا +

یوں تو بجنے کو ایک بج چکا تھا۔ مگر نیند آنکھوں سے عنقا تھی۔ چنانچہ میں شہر کے آخری منظر کو دیکھنے کے لئے جہاز کے صحن پر آگیا۔ گھاٹ کے پاس روشن عمارتیں کسی سنہری لکیر کی مانند نظر آتی تھیں۔ اور جگمگاتے ہوئے لیمپ جگنو معلوم ہوتے تھے چاند کی قرمزی شعاعیں سمندر کی نیلی سطح پر بکھر رہی تھیں۔ اور غضبناک لہریں ان لمعات نور کو جذب کرتی جارہی تھیں میں ریلنگ پر جھکا ہوا پانی کی لہروں پر اُچھلتی ہوئی جھاگ کو دیکھ رہا تھا۔ کہ کسی شخص کے بھاری جوتوں کی چاپ سنائی دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو معلوم ہوا سٹیشن پر جو خیال میرے دل میں گذرا تھا وہ ٹھیک نکلا + آہ فنگ خو جہاز کے پچھلے حصہ کی طرف جلد جلد جارہا تھا +

"آخاہ مسٹر آہ فنگ خو!" میں نے اُسے آواز دی۔ لیکن یا تو اُس نے سنا ہی نہیں۔ یا جواب دینا پسند نہ کیا۔ بہرحال وہ سیکنڈ کلاس کی سیڑھیوں پر غائب ہوگیا۔ دوسرے روز سارا دن اُس کا انتظار کرنے کے باوجود میں نے اُسے عرشۂ جہاز یا کھانے کے کمرے میں نہ دیکھا۔ نہ معلوم وہ کہاں چلا گیا تھا۔ شام کو رفع اضطراب کے لئے میں جہاز کے دفتر میں گیا۔ ایک اطالوی کلرک بیٹھا قلم سے کچھ گھس گھس کر رہا تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا:۔

"کیا آپ مجھے اُس چینی کے کمرہ کا نمبر بتلا سکتے ہیں جو کل بندر سعید سے جہاز پر سوار ہوا ہے ؟"

"اُس نے قلم ہاتھ سے رکھدی اور مجھے دیکھا پھر ایک موٹی سی کتاب اُٹھا کر کچھ دیر اُس کے صفحات دیکھتا رہا +

"مارٹن۔ اینڈریو۔ ڈوزیا۔ جیکین۔ علی۔ ولسن" یہاں پہنچ کر وہ رکا پھر میری طرف دیکھ کر کہنے لگا۔ "افسوس ہے آپکو کوئی غلط فہمی ہوتی ہے۔ جہاز پر کوئی چینی پورٹ سعید سے سوار نہیں ہوا" +

اُسی رات جبکہ ٹمٹماتے ہوئے تاروں اور مرطوب ہوا کے آگے ہمارا جہاز سمندر کی ساکت و صاف سطح پر بطخ کی مانند تیر رہا تھا۔ اور میں کھانے کے بعد ایک کرسی پر بیٹھا ہوا کوئی کتاب دیکھ رہا تھا کہ جہاز کے اگلے حصہ پر کچھ شور ہوا۔ آنکھ اُٹھا کر دیکھا تو میں ڈر کر رہ گیا۔ کوئی دراز قامت سیاہ پوش چینی جس کے منڈے ہوئے سر پر ایک لمبی سیاہ چوٹی لٹک رہی تھی پانی میں شور پور آہنی باڑ کو پکڑ کر جہاز پر چڑھتا دکھائی دیا۔ میں گھبرا کر کرسی سے اُٹھا۔ لیکن پھر جو غور سے دیکھا تو وہ غائب تھا +

تیسرے روز جہاز وینس پہنچ گیا۔ جہاں دو روز قیام کرنے کے بعد میں پیرس چلا گیا +

پیرس میں ٹھہرے مجھے پانچواں روز تھا۔ اور اسی رات مجھے لندن جانا تھا کہ ہوٹل کا فرانسیسی ملازم شام کے وقت میرے پاس آیا اور کہنے لگا:۔

"موسیو آج آپ جا رہے ہیں۔ لیکن جانے سے بیشتر کیا آپ مجھ پر ایک نوازش کر سکتے ہیں؟" وہ تھوڑی دیر میری جانب مشکوک نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر بولا:۔

"آپ ہندوستان کے رہنے والے ہیں۔ چنانچہ آپ یقیناً اصنام کے متعلق ضرور کوئی واقفیت رکھتے ہوں گے۔ کیا آپ بتلا سکتے ہیں یہ کس قسم کا بت ہے؟"

اور اُس نے ایک چھوٹا سنہری بت نکال کر میز پر رکھ دیا۔ میں نے اُسے اُٹھا کر غور سے دیکھا۔ دل میں ایک یونہی خیال سا گذرا۔ کیا یہ چان زی دیوتا کا ہی بت تو نہیں۔ پھر میں نے ضبط سے کام لے کر پوچھا:۔

"مگر تم کو یہ کہاں سے دستیاب ہوا؟"

کہنے لگا "آپ کے آنے سے بیشتر ہوٹل میں ایک چینی آکر ٹھہرا تھا۔ اُس کی روانگی کے بعد میں اُس کے کمرہ کو صاف کرنے کے لئے گیا تو اسے پڑا ہوا پایا۔ لیکن موسیو یقین کیجئے آجکل اس کی وجہ سے مجھے عجب متوحش خواب نظر آتے ہیں۔ کل رات جب میں نے اپنے کمرہ کی کھڑکی کھولی تو دیکھا ایک دراز قد چینی جس کے منڈے سر پر لمبی چوٹی تھی اپنی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا ہے۔ اور پھر خود بخود غائب ہو گیا"۔

میں کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر کہا:۔ "یہ کوئی خاص قسم کا بت نہیں بلکہ معمولی پیتل کا بنا ہوا ہے۔ لیکن اگر تم اسے فروخت کرنا چاہو تو میں اسے پچیس فرانک کو مول لے سکتا ہوں"۔ چنانچہ رقم جیب میں ڈالنے کے بعد وہ بت مجھے دیکر چلا گیا۔

جب رات کو سیر کے بعد میں واپس آیا تو چان زی دیوتا کا بت بدستور میز پر پڑا ہوا تھا۔ میں نے اُسے اُٹھا کر شمع کے پاس استادہ پر رکھ دیا۔ میں اس بات کا حلف اُٹھا سکتا ہوں کہ اُس وقت میرے اور سامنے کی دیوار کے درمیان کوئی متنفس نہ تھا۔ دفعتاً ایسا معلوم ہوا کہ ایک دُھندلا سایہ زمین سے اُٹھ کر میری جانب آ رہا ہے۔ پاس آکر اُس نے واضح صورت اختیار کر لی۔ تو میں نے دیکھا کہ اُس کے منڈے سر پر لمبی چوٹی لٹک رہی ہے اور گول گول پتھرائی ہوئی آنکھوں سے خون بہہ رہا ہے۔ اُس کی شکل بالکل اُس چینی سے مشابہ تھی جسے میں نے جہاز پر ریلنگ پکڑ کر چڑھتے دیکھا تھا۔ پھر یکلخت وہ غائب ہو گیا۔ ممکن ہے یہ میرا وہم ہو لیکن میں نے روشنی میں دیکھا کہ دیوار کے پاس عین اُس جگہ خون کے چھوٹے چھوٹے قطرے پڑے ہوئے ہیں جہاں وہ چینی نمودار ہوا تھا۔

اُس رات مجھ پر کچھ ایسا خوف اُس بت کی وجہ سے چھایا کہ دوسرے دن لندن پہنچتے ہی میں نے اُسے ایک کباڑیے کی دکان پر فروخت کر دیا۔ ایک ماہ بعد ایک رات میں ایسٹ اینڈ کے تنگ اور غلیظ بازاروں سے ہوتا ہوا کریم ریل روڈ پر جہاں میں رہا کرتا تھا واپس آ رہا تھا۔ اُس وقت آسمان ابر آلود تھا اور سیاہ بادلوں میں چاند اور تارے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ لندن کے اس حصہ میں جہاں جرم و معصیت کی بڑی دہشتناک مثالیں ملتی ہیں۔ میں خیالات میں غرق جا رہا تھا کہ اتنے میں سامنے سے آہ خنگ خو وہی چینی وضع کی عجیب و غریب ٹوپی پہنے آتا دکھائی دیا۔ اور مجھے پہچان کر رُکا۔ میں نے بھی مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ مگر میں نے دیکھا اُس کی حالت بہت زیادہ خراب تھی۔ اُس کا رنگ دق کے مریض کی طرح بالکل زرد ہو رہا تھا۔ اور آنکھوں میں گڑھے پڑے ہوئے تھے۔ بالآخر میں نے کہا:۔

"کسے امید تھی کہ یہاں آپ سے ملاقات ہوگی۔ لیکن آپ کون سے جہاز پر یہاں آئے ہیں؟ کیونکہ میں پتہ لینا چاہتا تھا کہ اُس رات جہاز پر میں نے کسے دیکھا تھا۔ سو میرا خیال ٹھیک نکلا۔

"میں پریزیڈنٹ ولسن پر آیا تھا" اُس نے آہستہ سے کہا۔

"معاف کیجئے گا" میں نے انتہائی حیرت کے عالم میں کہا "اُسی جہاز پر میں آیا ہوں لیکن آپکو میں نے کہیں نہیں دیکھا"۔

مگر میری اس بات کا اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ نہ ہی اپنے بت کی نسبت کچھ بات کی۔ اور میں نے بھی پیرس میں اُس بت کو خریدنے کا تذکرہ نہیں کیا۔ تھوڑی دیر بعد وہاں سے رخصت ہوا۔ تو رات آدھی سے زیادہ جا چکی تھی۔ لندن کے بازاروں پر ویرانی اور سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ہوٹلوں۔ قہوہ خانوں تھیئٹروں اور دوا فروشوں کے سوا اکثر دکانیں بند تھیں۔ مگر راستہ بھر آہ خنگ خو کی مرجھائی ہوئی شکل یوں نظر آتی جیسے ہر موڑ پر سے بھاگتی ہوئی میری جانب آ رہی ہے۔

سردی کی شدت کی وجہ سے لندن کی تمام خوبیاں ماند پڑ چکی تھیں۔ اس لئے میں پانچ چھ روز بعد نیس سے ہوتا ہوا مونٹ کارلو چلا گیا۔ ایک شام میں وہاں ایک سبزہ زار پر بیٹھا ہوا تھا جہاں پام کے پیڑوں کے سایہ میں سدابہار پھولوں کے ہریالے پودوں کے پاس زنگار رنگ کی چھتریوں کے نیچے حسنِ مغرب کے بہترین نمونے مردوں کے دوش بدوش بیٹھے ہوئے تھے۔ یا پیرس کی تتلیاں انگریزی پریوں سے ملی ہوئی محوِ خرام تھیں اور افسانہ و شعر کی اس دنیا میں گوئیڈا اپیرا کے منتخب سازندے اپنے شکریں نغموں سے راگ اور موسیقی کی جانفزا تانیں اُڑا رہے تھے۔ کہ کسی نے

ایک بازو میرے شانے پر رکھا۔ اور ایک پہچانی ہوئی آواز میرے کانوں میں آئی ــــ چونک کر پیچھے مڑا ــــ تو آہ فنگ خو!

وہ بڑا اسراسیہ معلوم ہوتا تھا۔ اُس کے ہونٹ نیلے۔ لب بند اور گال پچکے ہوئے تھے۔ آنکھیں اندر دھنسی ہوئی اور کلوں کی ہڈیاں باہر نکل رہی تھیں۔ میں حیرت سے تکنے لگا +

"میرے دوست" اس نے دبی ہوئی آواز میں کہا "خدارا میری مدد کرو۔ میں ابھی ابھی انگلستان سے آپکی تلاش میں آیا ہوں۔ پیرس کے قیام کے دوران میں ہوٹل کے کسی خادم نے میرے بکسوں سے وہ عجیب وغریب مورتی جس کا تذکرہ میں نے بارہا آپ سے کیا تھا۔ ایک نادر شے سمجھ کر چرالی تھی۔ پہلے تو سرے سے ہی اس کی نسبت وہ اپنی لاعلمی ظاہر کرتا تھا لیکن لالچ اور دباؤ کے اثر سے اُس نے مجھے بتلایا کہ ایک ہندوستانی کے پاس جس کا سامان لندن کے فلاں پتے پر روانہ کیا گیا تھا۔ فروخت کر دیا گیا۔ اُس کے دیئے ہوئے پتہ سے مجھے آپ کا نام ملا ہے اس لئے میں سیدھا آپ کے پاس آیا ہوں۔ اب کیا میں امید کر سکتا ہوں کہ آپ اسے ازراہ کرم اتنی ہی یا دوگنی قیمت لے کر مجھے واپس کر دیں گے۔ آپ جانتے ہیں میرے لئے یہ موت وحیات کا سوال ہے" +

میں نے کہا "بیشک میرے پاس ایسا ہی بُت فروخت کیا گیا تھا لیکن مجھے علم نہ تھا کہ وہ آپ کا مسروقہ مال ہے۔ اس لئے اُسے معمولی شے سمجھ کر میں نے لندن میں ایک کباڑیئے کے ہاں فروخت کر دیا تھا" +

اس جواب نے اُس پر صاعقہ کا اثر کیا اور اُس کا رہا سہا رنگ بھی زرد ہو گیا بڑی دیر زمین کو دیکھتے رہنے کے بعد وہ بولا:-

"میں ساری عمر آپ کا رہین منت رہونگا۔ اگر آپ مجھے اُس کباڑی کی دوکان کا پتہ دیدیں یا خود میرے ہمراہ چلیں" +

چنانچہ دوسرے ہی دن لندن پہنچکر ہم دونوں برمپٹن روڈ پر کباڑی کی دکان پر گاڑی سے اُترے۔ وہ تو موجود نہ تھا۔ اُس کا لڑکا کھڑا سامان کو ٹھیک کر رہا تھا۔ میں نے پوچھا:-

"آپ کے والد کہاں ہیں؟" اُس کی آنکھیں پرنم ہو گئیں۔ شاید میرے سوال نے اُس کے جذبات کو مجروح کیا ہو +

"افسوس دو دن ہوئے وہ مر گئے" لڑکے نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"اُن کی سفاکانہ موت بڑی دردناک اور حیرت خیز ہوئی ہے۔ آپ کو یقین نہیں آئے گا۔ اُن کی گردن پر سیاہ بالوں کی ایک گندھی ہوئی رسی پیوستہ پائی گئی جس سے اُن کی موت واقع ہوئی" +

یہ سنتے ہی ہم دونوں ٹھٹک کر رہ گئے۔ کچھ دیر دوکان میں خاموشی رہی پھر آہ فنگ خو مایوسانہ انداز میں بولا:-

"آپ کے والد کے انتقال کا ہمیں سخت صدمہ ہے۔ لیکن اُن کے پاس چھوٹا سا ایک پیتل کا بت ہے۔ ہمیں وہ درکار ہے۔ کیا آپ اُسے مہیا کر سکتے ہیں؟"

"مجھے افسوس ہے کہ آپکی آمد سے ایک روز پیشتر وہ ایک چینی کے ہاتھوں فروخت کر دیا گیا" اس مایوس کن جواب کو سُنکر آہ فنگ خو کی شکل بہت بھیانک بن گئی۔ اور اُس نے یاس آمیز لہجہ میں کہا +

"نہیں نہیں یقیناً ایسا نہیں ہو سکتا۔ دیکھئے تو سہی کہیں رکھا ہوگا" +

لڑکا طوعاً وکرہاً اُٹھا اور بہت دیر کی دیکھ بھال کے بعد آکر کہا "جناب من میں افسوس کرتا ہوں۔ وہ چیز واقعی بک چکی" +

چینی نے حسرت بھری نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ الماریوں تصویروں اور اشیا سے پُر صندوقوں پر ایک مایوسانہ نظر ڈالی۔ پھر افسردگی سے کہنے لگا "آہ معلوم ہوتا ہے۔ اب قسمت یاور نہیں" +

وہاں سے نکلکر اُس سے دوسرے دن ملنے کا وعدہ کرتے ہوئے میں ہوٹل میں لوٹ آیا۔ دوسرے دن علی الصبح چاء کے بعد ٹائمز کا تازہ پرچہ اُٹھایا۔ سب سے پہلے جس خبر پر میری نظر پڑی وہ یہ تھی "**ایک چینی کی پُراسرار خودکشی**

کل رات بارہ بجے ایک چینی جس کا نام آہ فنگ خو تھا اپنے مکان واقع ایسا اینڈیا ڈاک روڈ میں مردہ پایا گیا۔ سیاہ بالوں کی ایک رسی اُس کے گلے میں کسی ہوئی تھی۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی نامعلوم وجہ سے خودکشی کر کے مر گیا۔ پولیس تفتیش کر رہی ہے اور اُس کا سامان جو چند کپڑوں اور ایک پیتل کے گھنٹے اور ایک سیاہ سفوف کی تھیلی پر مشتمل ہے۔ سکاٹ لینڈ یارڈ والوں کے حوالہ کر دیا گیا ہے" +

مرزا محمود نظامی

(خاص)

نارنگی کی کلیاں

مشہور ہندوستانی ادیبہ مس حجاب اسمٰعیل کے قلم سے

(۱)

اتنی مدت تو کسی کا عشق پنہاں دل میں تھا
اب سرِ بازار میرے راز کی تشہیر ہے

میری عمر چھ سال کی تھی۔ اُس وقت میرے والد نے مجھے اور میری بوڑھی اَنّا زوناش کو لے کر ایک سمندری سفر کیا تھا۔ دراصل یہی سفر ہمارے اور ہمارے دوست لفٹنٹ کرنل جاذب آئی۔ ایم۔ ایس کے دوستانہ تعلقات کا باعث ہوا۔ ایک خوشگوار صبح میں کھیلتی ہوئی عرشۂ جہاز پر آگئی اور تھوڑی ہی دیر میں بوڑھی انّا کی غفلت کہئے، یا شدنی امر کہ سمندر کے تھپیڑوں میں میرا نازک اور ننھا سا جسم تڑپتا ہوا نظر آیا۔ اللہ! عجب وقت تھا!

مجھے آج تک اچھی طرح یاد ہے کہ اُس وقت ایک خوشرو نوجوان نے جس کی عمر تقریباً بتیس سال ہوگی۔ بڑے جان جوکھوں کا کام کیا تھا۔ یعنے بڑی دلیری سے سمندر کی بے پناہ موجوں میں کود کر مجھے ظالم موت کی سرد اور ڈراؤنی آغوش سے زبردستی نکال لیا۔ میں بیہوش ہوگئی تھی۔ بڑی دیر بعد جب مجھے ہوش آیا۔ تو ایک طرف میں نے اپنے والد کو دیکھا۔ جو قریب ہی اک چھوٹی سی کرسی پر بیٹھے مجھے تک رہے تھے۔ دوسری طرف میرا وہی محسن کھڑا مجھے ترحم آمیز نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ جس نے میری جان بچائی تھی۔ انّا زوناش میرے لئے دودھ لئے قریب آگئی۔ اور دودھ کا کٹورا میری طرف بڑھا کر کہا:۔

”جانِ من! کچھ پی لو“

میں نے کٹورا ہٹا دیا۔ والد سے سوال کیا ”یہ کون صاحب ہیں؟“

میرے والد نے مسکرا کر تشکر آمیز لہجہ میں ان سے تعارف کرایا ”بیٹی روحی پیاری! یہ تمہارے محسن لفٹنٹ کرنل جاذب آئی۔ ایم۔ ایس ہیں۔ ان کا شکریہ ادا کرو“

اُس زمانہ میں میری حیثیت ایک چھوٹے سے کیڑے کی تھی۔ کیونکہ میں یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ اظہارِ تشکر کے کیا طریق ہوتے ہیں۔ میں نے زوناش سے ان صاحب کا شکریہ ادا کرنے کو کہا۔ مگر بوڑھی انّا نے مسکرا کر کہا کہ یہ کام میرا ہے۔ اُس وقت میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ میں اٹھی اور اپنے محسن سے لپٹ گئی۔ اُس زمانہ میں میرے خیال میں یہ بہترین اظہارِ تشکر تھا۔ اور میرا خیال تھا کہ ہر شخص اپنے محسن کا شکریہ اُس سے ایک دفعہ بغلگیر ہو کر ادا کرتا ہے۔

(۲)

آج اُس واقعہ کو گیارہ بارہ سال کا عرصہ گذر گیا ہے۔ مگر میرے ننھے دل میں اپنے محسن کی قدر اب تک اُسی جوش و خروش کے ساتھ موجود ہے جیسے پہلے لمحے میں تھی۔

جس شہر میں مَیں اور میرے والد رہتے تھے۔ اُسی شہر میں کرنل جاذب بھی کئی سال سے رہتے تھے اور رفتہ رفتہ ہمارے خاندانی طبیب بن گئے تھے۔ اور نہ صرف طبیب بلکہ میرے اور میرے والد کے دلی دوست اور رفیق تھے۔

اگرچہ میں کرنل جاذب کو اپنا بزرگ تصور کرتی تھی۔ پر ہماری بے تکلفی کا یہ عالم تھا کہ اکثر اوقات باتوں باتوں میں ہم ہم سنوں کی طرح ایک دوسرے سے لڑ پڑتے تھے۔ پھر جلد ہی ملاپ بھی ہو جاتا تھا۔ وہ جتنے خوش مزاج، خوش مذاق، اور ظریف الطبع ہیں۔ اُتنے ہی مہربان اور رحمدل بھی۔

مجھے جہانتک علم تھا۔ اُن کی کوئی شادی نہیں ہوئی تھی۔ یا کم از کم میں نے ان کے ساتھ کبھی کسی خاتون رفیق کو نہیں دیکھا تھا۔ آج سے گیارہ بارہ سال قبل جب میں نے انہیں پہلی مرتبہ دیکھا تھا تو اُس وقت بھی وہ اکیلے تھے۔ اور اب بھی وہ تنہا ہی رہا کرتے تھے۔ ایک دفعہ میں نے مزید اطمینان کے لئے اُن سے پوچھا بھی ”کہ کرنل! آپ کی بیوی نہیں ہیں؟“ تو کہنے لگے ”نہیں ہیں!“

”کیوں نہیں ہیں؟“ میں نے سوال کیا۔

بے ساختہ ہنس کر کہنے لگے ”کوئی نہیں ملی“

میں یہ سُنکر خاموش ہوگئی۔ اُن کی تنہائی پر اکثر میں متاسف ہوا کرتی تھی مگر اس کا کیا علاج کہ وہ خود مجرد زندگی کو پسند کرتے تھے۔ سمندر کے کنارے ایک شاندار وسیع نیلے بنگلے میں ثمر یفانہ زندگی بسر کیا کرتے تھے۔ وہ سوسائٹی سے ازبس متنفر تھے۔ مگر ہفتہ میں ایک دفعہ شہر کے بورپین ملٹری کلب کو بہ حیثیت ممبر اُنہیں جانا ہی پڑتا تھا!

(۳)

برسات کے دن تھے۔ اکثر گھٹا اُٹھتی تھی اور زور کی بارش ہوا کرتی تھی، ایک دن شام کے وقت میں کالج سے بھیگ کر گھر آئی۔ سردیوں کے دن تھے۔ راستے میں مجھے سمندری ہوا لگی۔ گھر پہنچتے پہنچتے طبیعت بگڑ گئی۔ اور خفیف بخار محسوس ہوا۔ میں نے زوناش کو قہوہ لانے کے لئے کہا اور کرنل جاذب کو ٹیلی فون کر کے بستر پر لیٹ گئی۔ اُس شام میرے والد، کلب کے ایک ممبر کے ہمراہ گھوڑ دوڑ میں گئے تھے۔ اس لئے میں تنہا اپنے کمرے میں پڑی گھبرا رہی تھی۔ بخار سے آنکھیں جل رہی تھیں اور ڈاکٹر جاذب کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی +

میں سچ کہتی ہوں، ایک محب کے لئے اپنے محبوب کا چہرہ اتنا جاں نواز، اسقدر روح پرور نہ ہوتا ہوگا، جتنا ایک مریض کے لئے حالت مرض میں اپنے طبیب کا!!!

خدا خدا کر کے دروازہ کھلا۔ اور کرنل جاذب مُسکراتے ہوئے ہاتھ میں آلۂ سینہ بین لئے اندر داخل ہوئے۔ اُنہیں دیکھ کر میری جان میں جان آئی۔ بستر پر اُٹھ بیٹھی +

"میری چھوٹی دوست! تم کو کیا ہوگیا ہے؟" اُنہوں نے اپنے مخصوص لہجہ میں مجھے مخاطب کیا +

"بخار" میں نے جواب دیا +

اُنہوں نے یہ سُنکر اپنی تین سفید انگلیاں میری نبض پر رکھدیں مسکرا کر کہنے لگے: "آج شاید کھٹی کھٹی نارنگیاں کھائی ہیں۔ اسی کا یہ سبب ہے" +

میں چڑ گئی "میں نے نارنگیاں نہیں کھائیں۔ آپ کو بھی مذاق اچھے وقت سوجھتا ہے کرنل۔ آخر نارنگیوں کا کیوں خیال آیا آپ کو؟ زوناش نے آج دوپہر گلدان میں نارنگی کی چند کلیاں سنوار دی تھیں۔ شاید اسی کی بو آرہی ہے"

"کہاں سے؟" کرنل صاحب نے عجب بے خبری سے سوال کیا "وہ گلدان کہاں ہے؟"

"کیوں؟" میں نے متحیر ہو کر پوچھا +

"نارنگی کی کلیاں کہاں ہیں!" اُنہوں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پریشان لہجہ میں پوچھا +

میں حیران ہو کر بولی "بھلا اس میں پوچھنے کی کونسی بات ہے؟ تیز بو کمرے میں بھر گئی ہے! کیسی اچھی بو ہے! وہ دیکھئے ——— دریچے کے پاس گلدان میں" +

کرنل صاحب نے مڑ کر دیکھا، اور پھر ایک عجیب لہجے میں بولے "خداوندا! انہیں نکال پھینکو، نکال پھینکو۔ میں انہیں برداشت نہیں کر سکتا!"

اُنہوں نے باغ کی طرف چہرہ پھیر لیا۔ ایک دریچی کے آگے کوچ پر بیٹھ گئے۔ ان کی سفید پیشانی پر دریچے میں سے ہو کر ایک قسم کی اودی روشنی ناچ رہی تھی۔ وہ مصر کی کسی قدیم ممی کی طرح ساکت بیٹھے دریچے کو گھور رہے تھے +

میں ڈر گئی ——— اللہ! سفید ہوگئی! ویسے میں کچھ زیادہ مضبوط دل کی عورت نہیں ہوں۔ وہ تو بھلا ہوا کہ اسی وقت زوناش قہوہ لئے اندر آگئی۔ ورنہ میں مارے دہشت کے چیخ مار کر کمرے سے باہر بھاگ جاتی!

کرنل نے التجا کے پیرائے میں دوبارہ کہا "روحی! ان پھولوں کو دریچے سے باہر پھینکدو" +

"پیارے کرنل! کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا +

"پہلے انہیں باہر پھینکدو" +

زوناش نے میرے کہنے پر گلدان خالی کیا۔ تب کہیں جا کر ہمارے ڈاکٹر صاحب سنبھلے۔ بخار تو ایک طرف رہا۔ اب ڈاکٹر صاحب کی بیماری بڑھ گئی۔ ابتک میری سمجھ میں کوئی بات نہ آتی تھی +

آخر میں نے پوچھا "کیا ہوگیا تھا!؟"

کرنل جاذب ابتک ہانپ رہے تھے۔ اُن کی صورت درندوں کی سی ہو رہی تھی۔ میرے اصرار پر کہنے لگے:-

"بچی! مجھ سے اس کے متعلق کچھ نہ پوچھو! میں واقعی اک جانور بن گیا تھا"

"جانور نہیں" میں کہنے لگی "بلکہ ایک پُر اسرار دلچسپ روح! بھلا جانوروں کی زندگیوں میں ایسے پُر اسرار واقعات بھی ہوتے ہیں!"

"تم افسانہ نگاروں کو اور آتا کیا ہے؟" اُنہوں نے سگار سلگا لیا اور اُس کے دھوئیں کو متبسم نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہنے لگے "اپنے دوستوں، واقفکاروں ملاقاتیوں کی زندگی کو قصہ بنا کر پبلک کے آگے پیش کرنا۔ تم لوگوں کا محبوب شغل

زندگی ہے۔ مگر روحی! اس وقت بچہ مت بنو۔ اس ذکر کو چھوڑ دو (چھوٹی سی آہ بھر کر)

گذاری ہیں خوشی کی چند گھڑیاں — اُنہیں کی یاد میری زندگی ہے!"

یہ کہتے ہوئے اُن کا چہرہ بے حد اُداس اور سفید ہوگیا۔ اُنہوں نے پھر ایک دفعہ گلدان کو دیکھ کر کہا:۔

"خالی کردیا تم نے؟"

"ہاں" ——— میں نے جواب دیا "کرنل! آپ کیا نارنگی کی کلیوں سے ڈرتے ہیں؟"

"ڈر؟ ہاں ذرا وحشت ہوتی ہے" یہ کہہ کر اُنہوں نے اپنے سگار سے راکھ جھاڑی ✤

"آخر کیا بات ہے؟ وحشت کیوں ہوتی ہے؟"

وہ تنگ آکر کہنے لگے "تمہیں استدر اصرار کیوں ہے؟ اس میں کسی قسم کا راز یا افسانہ نہیں ہے۔ میری بچی! تم نے اکثر دیکھا ہوگا کہ بعض لوگ جھینگر سے خوف کھاتے ہیں۔ دور کیوں جاؤ۔ تمہارے پروفیسر صاحب مکڑی سے کانپ جاتے ہیں۔ بعض سانپ سے ڈرتے ہیں۔ بالکل اسیطرح نارنگی کے پھولوں سے میں خوف کھاتا ہوں ✤"

"تعجب بالعجب"

میں رات بھر اس پُر اسرار "الف لیلوی" واقعہ پر غور کرتی رہی پر کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکی۔ اور ذرا خیال تو کیجئے کہ بھلا مجھ جیسی عورت جس کی تمام زندگی افسانہ نویسی اور شعر و شاعری میں گذر رہی ہو۔ کیونکر اس افسانوی واقعہ کو فراموش کرسکتی ہے!

بخار کم ہوگیا تھا، اور خیال سرزمین خواب کی طرف گھومنے چلا گیا تھا۔ رات تاریک تھی، پر سنسان! میں نے الماری سے ٹھیکرے کی ایک شگفتہ مضمون والی کتاب نکالی۔ اور رات بھر لیٹی لیٹی پڑھتی رہی ✤

(۴)

کالج میں چھ دن کی تعطیل تھی،

صبح کا وقت تھا۔ میں برآمدے میں ایک کرسی پر دھوپ میں بیٹھی تھی۔ اور سوچ رہی تھی کہ تعطیلات کس شغل میں بسر کروں۔ والد اپنے کسی دوست کے ہمراہ شکار کو گئے ہوئے تھے۔ مگر آپ جانئے مجھ جیسی خواب و خیال کی شیدائی رحمدل عورت کو شکار جیسے موذی مشغلے سے کیا دلچسپی ہوسکتی ہے؟ میں نے انکار کردیا تھا۔ اور گھر پر تنہا تھی ✤

لفٹنٹ کرنل جاذب کوئی دو ہفتوں سے "اودے پہاڑوں" پر گئے ہوئے تھے۔ میری خواہش تھی کہ چھ دن کے لئے ڈاکٹر صاحب کے پاس چلی جاؤں۔ اتنے میں زوناش نے ایک تار پیش کیا۔ میں نے کھولا تو دیکھا کہ کرنل کا ہے "دل را بدل راہست" سمجھ کر میں خوب مسکرائی۔ وہ مجھے دعوت دے رہے تھے ✤

"آج شب یہاں ہیملیٹ کھیلا جارہا ہے۔ تم ضرور آؤ۔ جاذب"

ہاملیٹ! ——— وہ عجیب و غریب جادو نگار کھیل جس نے ایک شاعر کو استقدر مقبول و محبوب بنا دیا کہ وہ سب کی آنکھوں کا تارا بن گیا! ایسے کھیل کو نہ دیکھنا کفران نعمت ہے!

یہ سوچتے ہوئے میں نے وقت دیکھا۔ دس بجکر پچیس منٹ ہو گئے تھے۔ اور میرے لئے کافی وقت تھا۔ کیونکہ "اودے پہاڑوں" کی ایکسپرس بارہ بجے نکلنے والی تھی ✤

ساڑھے چار گھنٹوں کا سفر تھا ✤

(۵)

جب میں کرنل جاذب کے گھر پہنچی تو ایک بڑا سا ستارہ مجھے بادلوں میں سے جھانک رہا تھا۔ موسم بہت سرد تھا۔ اور ہوا تیز چل رہی تھی۔ پورے گاؤں میں دھواں دھواں سا نظر آرہا تھا۔ کرنل جاذب اپنے مختصر سے دار المطالعہ میں بیٹھے ایک جنتی ماہانہ رسالہ دیکھ رہے تھے ✤

مجھے دیکھ کر وہ اُٹھ کھڑے ہوئے، بولے "مجھے تمہارے آنے کی مطلق امید نہ تھی۔ میرا خیال تھا کہ تم بوڑھے دوست کی دعوت قبول نہ کروگی! مجھے خبر ہوتی تو میں خود اسٹیشن پر موجود ہوتا" ✤

مجھے ہنسی آگئی "اور میں کیا اندھی ہوں؟ کہ تمہارے گھر تک نہ پہنچ سکوں؟"

(۶)

او مالک! میں اُس عجیب و غریب رات کو کبھی نہ بھولونگی! اپنی زندگی بھر نہ بھولونگی۔ بات اصل یہ ہوئی اُس شب مجھے کہانی لکھنے کے لئے بہت سا مضمون مل گیا! ایسے موقعے عموماً کہاں نصیب ہوتے ہیں!

کھیل کے اختتام پر ایک عجیب واقعہ پیش آیا، جو افسانے سے بھی زیادہ عجیب معلوم ہوتا ہے! میرے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے! الٰہی تیری پناہ!

اُس شب لوگوں کی غیر معمولی آمد و رفت تھی۔ میں اور کرنل صاحب ہال کے ایک دروازے سے انسانی تنفس کے جھونکوں سے بمشکل بچکر نکل رہے تھے کہ دفعتاً ایک خاتون جو بظاہر ایک نئی دلہن معلوم ہوتی تھیں۔ سینے پر نارنگی کی

کلیوں کا گچھا سنوارے ہمارے قریب سے گذریں۔ ان خاتون کا گذرنا ہی تھا کہ کرنل کے چہرے کا رنگ برف کی مانند سفید ہو گیا اور ایک عجب اضطراب کی حالت میں اُس نے اپنے ہاتھ ادھر ادھر پھینکنے شروع کئے +

وہ ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ میں نے چھو کر دیکھا تو یخ کی مانند سرد تھے۔ اور کسیقدر کانپ رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد بے اختیار چیخ اُٹھے +

"آہ معبود! وہ نارنگی کے پھول ـــــ یہاں بھی موجود ہیں!

مجھے برانڈی سے مذہبی کراہیت ہے! مگر اس موقع پر میں نے تھوڑی سی کرنل کے لئے مہیا کی۔ تھوڑی دیر بعد اُن کی حالت کچھ سنبھلی۔ مگر قدم لڑکھڑا رہے تھے

تھوڑی دیر بعد ہم دونوں باہر آ گئے۔ سردی خوب تھی۔ شہر میں سب دھواں دھواں سا نظر آ رہا تھا۔ سڑکیں شبنم کے پردوں میں غائب ہو گئی تھیں۔ خیر یہ سب مجبوریاں ایک طرف تھیں سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ مجھے اب خود کرنل صاحب سے ڈر لگتا تھا۔ الٰہی! کرنل دراصل کہیں شیطان تو نہیں! بھوت تو نہ ہوگا! کیا عجب کوئی بدروح ہوگی! جو مجھے دھوکہ دے رہی ہے!

وہ شب مجھے کبھی نہ بھولے گی! گھر پہنچکر ڈاکٹر نے مجھ سے کہا "پیاری بیٹی! تم جنوبی طرف کے کمرے میں سو رہو۔ میں آج رات مطالعہ میں گذاروں گا۔ طبیعت بے چین ہے اور دماغ بہت تھکا ہوا"

خادمہ نے موم بتی میرے ہاتھ میں دیدی اور میں ڈاکٹر کے بتائے ہوئے کمرے میں چپ چاپ سو رہی +

(۷)

دوسری صبح گرم اور خوشگوار تھی +

ناشتے کے کمرے میں ڈاکٹر صاحب اپنے ایک نفیس صندلی فلالین میں کھڑے تھے اور مسکرا رہے تھے "آداب روحی! مزاج شریف"

"اور آپ کا مزاج کیسا ہے؟"

کرنل نے مسکراتے ہوئے کرسی پر بیٹھ کر کہا "بہت اچھا، رات بھر میں پڑھتا رہا۔ مگر پانچ بجے سو گیا تھا۔ ہوا بہت تیز اور سرد چل رہی تھی"

"مگر مجھے تو نیند نہیں آئی" میں نے کہا +

"کیوں!"

"کیونکہ رات کے واقعات نے میرے خیالات کو پراگندہ کر دیا تھا! بھلا میں کیونکر سو سکتی تھی!"

کرنل نے ایک دلفریبی کے انداز میں مسکرا کر کہا: "میں اپنے راز اپنے دوستوں پر ظاہر کرنے کا عادی نہیں۔ سقراط کہتا ہے کہ جب تمہارا راز تمہارے سینے میں نہیں سما سکتا تو دوسرے کے سینے میں کیونکر سمائے گا؟"

میں ذرا کھسیانی ہو کر بولی: "ٹھیک ہے! تم بہت اچھا کرتے ہو کہ اپنا راز کسی پر ظاہر نہیں کرتے۔ مگر تم نے یونانیوں کے چشم و چراغ ویاس کا وہ قول بھی سنا ہے؟ وہ ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ "ہر کس و ناکس کو اپنا رازدار نہ بناؤ" اس سے ویاس کا یہی مطلب تھا کہ سوائے اپنے نہایت محبوب و معتبر دوست کے کسی غیر پر اپنا راز افشا نہ کرو۔ اس کے یہ معنے تو ہو نہیں سکتے کہ اپنا راز اپنی قبر میں لیجاؤ بھلا کرنل، دوست دنیا میں پھر کس مرض کی دوا ہیں؟"

اُس نے ایک گہری سانس لے کر کہا "روحی! معلوم ہوتا ہے وہ وقت قریب آ گیا ہے کہ میں اپنی زندگی کے عظیم الشان راز کو افشا کر دوں۔ میں نے آج تک اس کو اپنے سینے میں چھپائے رکھا۔ مگر اس وقت مناسب یہی معلوم ہوتا ہے اپنے قصۂ حیات کو تمہارے آگے من و عن بیان کر دوں ؎

یہ قصہ نہیں تم جس کو قصہ خواں سے سنو!
مرے فسانۂ غم کو مری زباں سے سنو!"

"زہے نصیب" میں نے کہا +

وہ کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا بولا: "مگر یہ جگہ موزوں نہیں ہے۔ چلو ہم دوپہر کے کھانے تک باغیچے میں بیٹھیں" +

باغ میں سرور آگیں ہوائیں چل رہی تھیں۔ زیتون کے درختوں پر سرخ چونچ والے پرندگیت گا رہے تھے +

ہم دونوں باغ کی ایک چھوٹی سی دیوار کے قریب ایک بانس کی کوچ پر بیٹھ گئے۔ کرنل نے اک سگریٹ سلگایا، کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر کہنے لگا:-

(۸)

"میں یہ نہیں جانتا کہ عورتیں محبت میں صادق القول ہوتی ہیں یا نہیں ـــ! مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ محبت کے متعلق عورتوں کے کیا خیالات ہوتے ہیں! میں جانتا ہوں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ عورتیں جب کسی سے ـــــ کسی خوش قسمت سے واقعی محبت کرنے لگتی ہیں۔ تو وہ کائنات کو ایک جزیرۂ عشق خیال کرنے لگتی ہیں۔ اور اگرچہ وہ خود نہایت کمزور ہوتی ہیں۔ مگر اُن کی محبت کی طاقت کا مقابلہ، خدا اگر مجھے معاف کرے، تو میں یہ کہنے کو تیار ہوں کہ الوہیت کی قوت بھی نہیں کر سکتی!"

ایک زاہد خشک کی زبانی ان عشقیہ الفاظ کو سن کر میں تو ششدر رہ گئی +

"کرنل! تم نے کیا اپنی عمر میں کسی عورت سے محبت کی ہے؟"

وہ ایک مغرور مسکراہٹ سے کہنے لگا "ہاں! اور نہ صرف میں نے کی ہے بلکہ ایک عورت کی طرف سے چاہا جا چکا ہوں +

یہ سنکر میں نے کرنل پر ایک نقادانہ نگاہ ڈالی۔ واقعی وہ اپنی جوانی میں ضرور قابلِ محبت ہوگا۔ اب بھی اُس کی حرکات سے ایک دل کشی ٹپکتی تھی شکیل و عورت بھی بُری نہیں تھی۔ چھوٹی چھوٹی گہری نیلی آنکھیں، مختصر سی سنہری مونچھ دراز قد اور سڈول جسم +

اُس نے پھر کہنا شروع کیا:۔ "مجھے وہ رات کبھی نہ بھولے گی! آج سے پچیس سال قبل کا واقعہ ہے ——— میں ستمبر کی ایک دھندلی شام اپنے دارالمطالعہ میں بیٹھا اپنی طبی درسی کتابوں کا مطالعہ کر رہا تھا۔ ماہ کے اختتام پر میرا امتحان تھا۔ میں مکان میں تنہا تھا کیونکہ میرا بھائی زرتاش تجارتی سلسلے میں بصرہ اور بغداد کی طرف گیا ہوا تھا۔ دفعتاً کسی نے باہر اطلاعی گھنٹی بجائی۔ میں باہر نکل آیا۔ میرا بھائی موٹر سے اُتر رہا تھا۔ اُس کے ساتھ ایک نوجوان خاتون سیاہ برقعہ اوڑھے کھڑی تھی۔ ایک خاتون کو ساتھ دیکھ کر میں متحیر ضرور ہوا۔ مگر کسی قسم کا اظہار کئے بغیر زرتاش کے پاس چلا گیا۔ میرے بھائی نے مجھے بغور دیکھا، پھر یہ کہتے ہوئے:۔

"یہ میرا چھوٹا بھائی جاذب ہے"+

مجھے اس نوجوان خاتون کے آگے پیش کیا۔ پھر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب میرے بھائی نے مجھ سے کہا:۔

"یہ تمہاری بھاوج ہیں"

نوجوان خاتون نے سر جھکا کر میرے سلام کا جواب دیا۔ رسم تعارف کے ادا ہوتے ہی اُس خاتون نے اُلٹ دیا۔ میں نے کبھی اسقدر پیارا چہرہ نہ دیکھا تھا۔ مشرقیوں کا حسن تھا۔ سرخ و سفید چہرہ، ایشیائی حسن سے معمور سیاہ آنکھیں سیاہ چمکیلے لمبے لمبے بال، چھوٹا سا قد۔ اور شریف مسلم خواتین کی سی فطری شرم و حیا بظاہر کوئی عربی لڑکی معلوم ہوتی تھی +

میں نے حیران ہو کر اپنے بھائی کو دیکھا۔ اور میری زبان سے بے ساختہ نکلا "بھائی صاحب! آپ نے کیا پردیس میں شادی کر لی ہے؟"

میرا بھائی ایک بہت ہی خشک مزاج آدمی تھا۔ اُس نے میرے سوال کے جواب میں صرف "ہاں" کہا اور اُس خاتون کا ہاتھ پکڑ کر اندر چلا گیا +

(۹)

دن گذرتے جاتے تھے۔ میرا بھائی تجارتی سلسلے میں اکثر سفر پر رہا کرتا تھا اور میرا بہت سا وقت میڈیکل کالج میں گذر جاتا تھا۔ میری نوجوان بھاوج کو مکان پر تنہا رہنا پڑتا تھا۔

ایک شام سات بجے کے قریب میں کالج سے تھکا ماندہ واپس آیا چونکہ میں نے اپنے کمرے میں قدم رکھا۔ میری نظر میز کی طرف پڑی جہاں میری کمسن بھاوج بیٹھی (شاید) کچھ لکھ رہی تھی۔ غالباً اُسے میرے آنے کا علم نہ تھا۔ اس کو اپنے کمرے میں دیکھ کر مجھے کسقدر حیرت ہوئی +

آج عمر میں پہلی دفعہ میں نے اسے غور سے دیکھا تھا۔ وہ کچھ حد سے زیادہ حسین و جمیل نظر آ رہی تھی۔ پیازی رنگت کا لباس پہن رکھا تھا۔ سیاہ ریشم کے رومال سے سر لپٹا ہوا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ چہلقدمی سے واپس آئی ہے۔ کانوں میں موتی کے آویزے تھے! آج زندگی میں پہلی دفعہ مجھے ایک عورت کی دل کشی کا احساس ہوا۔ اور اسقدر گہرا اثر میرے قلب پر ہوا کہ میں اس زاہد فریب منظر کو چھوڑ کر تنہائی پسند نہ کرتا تھا۔ دو لمحے میں اسی حالت میں کھڑا رہا۔ عالمِ بے اختیاری میں میں نے زور سے اپنا ہاتھ میز پر رکھا، وہ چونک پڑی۔ اور کاغذ اُس کے ہاتھوں سے نکل کر دور جا پڑا +

"اُس کو اُٹھا لاؤ" اُس نے بلبل کے سے لہجے میں کہا۔ اُس کی آواز میں کسی قسم کی جھجک یا شرم مطلق نہ تھی +

میں مقناطیسی پتلے کی طرح فوراً تعمیلِ حکم میں مصروف ہو گیا۔ اور کاغذ لے کر اُس کی طرف گیا +

اتنا کہہ کر کرنل نے چونک کر میری طرف دیکھا "اے روحی! یہ کیا! کیا میری زندگی کا فسانہ لکھ رہی ہو؟"

میں مجرموں کی طرح کرنل جاذب کی طرف دیکھنے لگی +

قصہ پھر شروع ہو گیا +

"مگر اُس نے وہ کاغذ نہیں لیا۔ کہنے لگی "جاذب"! یہ تو تمہارے ہی لئے لکھا گیا ہے۔ اس لئے مجھے واپس نہ کرو"۔ ——— ! وہ عربی زبان میں تقریر کر رہی تھی۔ اور میں عربی کچھ کچھ سمجھ سکتا تھا۔ روحی! پہلی مرتبہ اس لڑکی کی زبان سے اپنا نام سُنکر مجھے واللہ بڑا پیار آیا۔ میں نے کاغذ کو دیکھا جس پر میرا نام تین دفعہ نہایت خوبصورت حروف میں لکھا ہوا تھا

جاذب، جاذب، جاذب

میں مبہوت رہ گیا، میرے جسم سے اک گرم بھانپ نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔ اور میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اُس وقت کی دلی کیفیات کو میں الفاظ میں ظاہر

روحی! کمرے کی ہر چیز ارگن معلوم ہوتی تھی جس سے دلچسپ اور محبّت آمیز راگ نکل رہے ہوں۔ میں نے اس جاں بخش تحریر کو دوبارہ دیکھا میری پیاری روحی! تم یقین کرو۔ میں شدّت مسرّت سے پاگل ہو رہا تھا۔ میری زندگی میں پہلی دفعہ ایک عورت مجھ سے اظہار محبّت کر رہی تھی۔ تم عشق و محبّت کی چاشنی کو کیا جان سکو گی تم اس کو جس سے ناواقف ہو۔ بھلا کسی نے تم سے کبھی اظہار محبت و شوق کیا بھی ہے؟ ——— ننھی لڑکی! ؎

لطفِ مے تجھ سے کیا کہوں زاہد
ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں!

ناولوں میں اکثر مجھے عشقیہ گفتگو پڑھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ سینما کے پردوں پر میں نے بہت سی شوق محبّت میں ڈوبی ہوئی حرکتیں دیکھی تھیں، پر مجھے کبھی زبانی سننے کا موقع نہیں ملا تھا۔ میں دل ہی دل میں کہہ رہا تھا اُفوہ! یہ لڑکی ——— یہ کمسن سیاہ چشم لڑکی، ہاں یہ میری بھاوج مجھ سے محبت کرتی ہے ——— ! محبّت، وہی ——— عطیۂ الٰہی، جو آدم و حوّا کو نیچر نے عطا کیا تھا! آج وہی مجھے ملنے والا تھا! اے خوش بخت! ——— کیا اسے زر تاش سے محبّت نہیں ہے! مجھے زر تاش پر ترجیح دے رہی ہے! مجھے! ۔ زہے نصیب! زہے نصیب میرے! بے شک! کوئی وجہ نہیں کہ دنیا میں خوبصورتی اور مسرّت میرے بھائی کے حصّہ میں آئے۔ اور میں اس سے محروم کر دیا جاؤں! میں دفورِ شوق میں دیوانہ ہو رہا تھا۔ اور حسین شیریں کے لئے ایک دریائے محبّت میرے سینے میں موجزن تھا ✢

کمرہ تاریک پڑا تھا۔ کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ چاند کھجور کی سبز اور نازک ٹہنیوں پر مسکرا رہا تھا۔ اور میں کمرے میں تنہا تھا۔ وہ باہر چلی گئی تھی ——— شیریں، میری سجدہ گاہِ آرزو، میری مرکزِ زندگی، میری پیاری شیریں باہر چلی گئی تھی، کمرے سے باہر!

اب ایک لمحے کے لئے بھی مجھ سے اس کی جدائی برداشت نہیں ہو سکتی تھی۔ واللہ کیا دن تھے! نئے نئے ولولے، نئے نئے خیالات میرے دماغ کو بے چین کر رہے تھے ✢

شیریں! راحتِ جاں شیریں! کہتا ہوا میں دروازے تک بھاگا۔ خدا جانے میں شدّتِ وحشت میں کیا کر گذرتا! اچانک مجھے یاد آ گیا کہ شیریں میری قابلِ تعظیم بھاوج ہے!

میں ایک ستون کا سہارا لئے کھڑا ہو گیا۔ دل سے کہنے لگا "واہیات! محض واہیات! شیریں میری بہن ہے! میری بھاوج ہے! میرے بڑے بھائی کی بیوی! اس لئے اس کی تعظیم و تکریم مجھ پر فرض ہے۔ سنتا ہوں عورتیں اکثر ہسٹریا کا شکار ہو جایا کرتی ہیں اور اس مرض میں مبتلا ہو کر جنونی حرکات کا مرتکب ہوتی ہیں ✢

میں واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔ جیب میں سے وہ جاں بخش تحریر نکالی۔ چراغ کی روشنی میں پڑھنے لگا۔ مسکراہٹ بے اختیار میرے ہونٹوں پر کھیلنے لگی۔ بے چینی بڑھی۔ آہ سچ ہے ع

"کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا!"

بے قراری لحظہ بہ لحظہ بڑھ رہی تھی۔ میں باغ کے دریچے میں جا کھڑا ہوا۔ سامنے چاندنی کا فرش بچھا ہوا تھا۔ میرے دل، میری روح سے اک آواز آ رہی تھی، ایک نغمہ نکل رہا تھا اور وہ نغمہ یہ تھا کہ اگر واقعی وہ مجھ سے محبّت کرتی ہے ——— کر رہی ہے ——— کرنے پر مجبور ہے، تو انکار میرے بس کی بات نہیں!"

اسی سوچ و فکر میں بیٹھا ہوا تھا کہ کسی نے میرا شانہ چھوا۔ اور نرم و نازک ارغنوں کی سی آواز نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا ✢

"تم اسقدر حیران کیوں ہو؟"

میں نے مڑ کر دیکھا نورِ راحتِ جان شیریں کھڑا مسکرا رہی تھی۔ چاند کی زرد روشنی میں اس نازنین عورت کا سفید اور دلربا چہرہ اسقدر محبوب اور خوبصورت نظر آ رہا تھا کہ اگر اُس وقت دنیا کی ساری عورتیں بھی مجھے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتیں تو میں متوجہ نہ ہوتا۔ خدایا! کیا واقعی یہ زہد فریب عورت مجھ سے محبّت کرتی ہے۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب قسم کا بھولپن اور فرشتوں کی سی سادگی برس رہی تھی ✢

"میری پیاری شیریں! ———"

بے ساختہ میری زبان سے نکلا۔ وہ بغور میرے چہرے اور میری حرکات کو دیکھ رہی تھی۔ اور میں ——— کبھی بے تاب، کبھی بے قرار ہو ہو کر اُس پر گرنا چاہتا تھا۔ اور پھر سنبھل جاتا تھا ✢

یکایک کسی خیال نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے شیریں کی طرف دیکھا! ——— وہ میرے بھائی کا خیال تھا، بیساختہ میری زبان سے نکلا "میری بھاوج!"

"بھاوج! ———!" اُس نے حقارت کے لہجہ میں کہا "بھاوج! تمہاری بھاوج! بھلا ایک غیر شادی شدہ عورت کسی کی بھاوج کیونکر ہو سکتی ہے! مرد واقعی بڑے کم فہم ہوتے ہیں!"

تو یوں کہئے! یہ ہمارے بھائی صاحب کی کارستانی تھی! یہ اُنکی بیوی

نہیں! تو یوں کہئے، یہ ہماری بھاوج نہیں ——— ! یہ سوچ کر میں نے مڑ کر شیریں سے ایک سوال کیا +

"تو کیا تمہیں میرے بھائی سے محبت نہیں ہے ؟"

پر آہ ——— وہ کمرہ سے باہر جا چکی تھی۔ میری شیریں مجھے میرے تمام ہم جنسوں کو کم فہم بنا کر باہر جا چکی تھی +

میں دیوانہ وار یہ گاتا ہوا شیریں کے پاس چلا ؎

تم سے کچھ کہنے کی خواہش ہے مری خاطر نشیں
آہ لیکن کیا، مجھے خود بھی خبر اس کی نہیں
اور اگر تم اتفاقاً پوچھ لو مجھ سے کہیں
تو فقط اتنا کہونگا "تم سے اُلفت ہے مجھے"
اضطراب شوق میں اک خط تمہیں لکھوں اگر
اور اُس میں رکھ بھی اپنا دلِ محزوں اگر
تم پہ ظاہر کر بھی دوں جذباتِ گوناگوں اگر
تو یہ مطلب ہوگا "بے حد ہی محبت ہے مجھے!"
میں کبھی آمادہ ہوتا ہوں جو گانے کے لئے
لیتے اپنا رازِ دل تم کو سنانے کے لئے
تو یہی دو لفظ ہیں میرے ترانے کے لئے
"تم سے راحت ہے مجھے، تم سے مسرت ہے مجھے!"

(لانگ فیلو) کی اس نظم کو میں عالمِ بیخودی میں چیخ چیخ کر گا رہا تھا۔ دنیا کی ہر چیز مجھے عشق و محبت کے فسانے سنا رہی تھی +

اللہ! کیا دن تھے! کیا راتیں تھیں!

(۱۰)

یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ اس کے بعد میرے اور میرے بھائی کے آپس میں کیسے تعلقات رہے!

ہم آپس میں ایک دوسرے سے بہت کم بولنے لگے۔ اشد ضرورت پڑ یا جب کھانے پر اکٹھے ہوتے تو مجبوراً دو ایک لفظ ہماری زبان سے نکلتے۔ ورنہ ہر وقت مکان پر ایک سکوت مطلق چھایا ہوا رہتا۔ سوائے اس کے کہ شیریں اکثر شام کے وقت پیانو پر عربی شعرا کی غزلیں بجا کر گایا کرتی۔ جس کو میرا بھائی اپنی جگہ چپ چاپ بیٹھا سنا کرتا۔ اور میں اپنی جگہ اس سے لطف اندوز ہوتا۔ میرے بھائی کو موسیقی کا بہت شوق تھا +

ایک دن شام کے وقت میرا بھائی بالاخانہ سے نیچے اُتر رہا تھا۔ اور میں اوپر جا رہا تھا۔ دفعتاً دونوں کی نگاہیں ملیں۔ وہ زینے پر کھڑا ہو گیا۔ یہ دیکھ کر کہ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے میں بھی کھڑا ہو گیا +

"جاذب! کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ تم کہیں اپنی رہائش کا علیحدہ انتظام کر لو۔ تم خدا اب تم جوان ہو۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ میں تمہاری تعلیم و تربیت کے فرض سے سبکدوش ہو چکا ہوں +

میں نے مستعد لہجہ میں جواب دیا:۔ "میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اگر آپکی یہی خواہش ہے تو میں انشاء اللہ کل ہی اس کا انتظام کر لونگا"

"بہتر ہے" یہ کہہ کر میرا بھائی نیچے چلا گیا +

میں اپنے مستقبل کے متعلق کچھ سوچتا ہوا اوپر چلا آیا۔ بالاخانے کے برآمدے کی دیوار کہنیاں ٹکا کر نیچے باغیچے کے شگفتہ پھولوں کو دیکھنے لگا۔ وہ بڑی خوشگوار شام تھی۔ دسمبر کے مہینے کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ ہوا میں ارغنوں کا سا شور تھا۔ سنہرے پرند آسمان پر گیت گا رہے تھے اور باغ پر سورج خوب چمک رہا تھا۔

شیریں کی مفارقت میرے لئے موت سے بدتر تھی۔ آہ! میں کیونکر اس کو چھوڑ جاؤں! اللہ یہ محبت بھی کیسی عجیب چیز ہے کتنی پاکیزہ! مگر کسقدر جان لیوا اور تکلیف دہ!

ابھی میں فلسفۂ محبت پر غور کر ہی رہا تھا کہ کسی کی گرفت نے مجھے چونکا دیا۔ دو ہاتھ میری گردن میں حائل تھے۔ مڑ کر دیکھا تو شیریں!

وہ ایک سفید رومال سے آنکھ پونچھ رہی تھی۔ میں نے انتہائی محبت کے لہجہ میں اُس سے پوچھا:۔

"یہ تم کیا کر رہی ہو؟"

اُس نے دھیمی آواز میں بتایا "رو رہی ہوں"

"روتی کیوں ہے؟ میں نے اس طرح جیسے کوئی اپنی یا التو بلی سے مخاطب ہوتا ہے۔ اُس سے باتیں شروع کیں "کیا ہو گیا میری شیریں کو؟"

وہ کہنے لگی۔ "جاذب! میں یہاں نہیں رہ سکتی! میں تمہارے بھائی کے ساتھ نہیں رہ سکتی"

"کیوں نہیں رہ سکتی؟" میں نے اُس کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ پھر کہنے لگا:۔ "شیریں! تمہیں معلوم ہے کہ میں کل تم سے جدا ہو جاؤنگا؟"

"نہیں مجھے اس کی خبر نہیں! کیونکر جدا ہو گے؟"

میں نے اُسے بغور دیکھتے ہوئے کہا:۔ "علیحدگی! میں ہوٹل میں جا رہونگا۔ زرتاش

کی یہی خواہش ہے۔

"تو اس میں جدائی کا کیا ذکر ہے۔ میں تمہارے ساتھ چلونگی! جاذب! تمہارے بھائی ایک نہایت سفاک آدمی ہیں۔ تم جانتے ہو گے گذشتہ شب، اُنہوں نے مجھ سے کیسی سخت کلامی کی تھی! ایک سخت کلام بے پرواہ مرد ایک عورت کے ساتھ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا!"

مگر میں تو کسی اور مسئلہ پر غور کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد چیخ اُٹھا "میرے ساتھ!" میرا سانس پھول گیا "تم میرے ساتھ چلو گی؟ شیریں! تم میرے ہمراہ آنے پر رضامند ہو——؟ مگر—— زرتاش—— !"

"واہیات مت بکو"۔ اس نے بے زار ہو کر کہا "جاذب! تم واقعی ایک بہت ہی پیارے احمق ہو—— کیا تم اتنا نہیں سمجھ سکتے کہ میں اُس کی بیوی بننا نامنظور کر چکی ہوں!"

(۱۱)

روحی پیاری!—— یہ بیان کرنا میرے لئے آسان نہیں ہے کہ دوسرے دن میں کن مصائب کا شکار ہوا!

میں نے اپنا اسباب گرین ہوٹل کے چوتھی منزل پر بھجوا دیا تھا۔ اس سے فارغ ہو کر میں نیچے زرتاش اور شیریں سے الوداعی مصافحہ کرنے آیا۔

شیریں نے بے اختیار میرے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

میرے بھائی کی آنکھیں سُرخ ہو گئیں وہ تو خیریت گذری کہ پستول یا ریوالور جیسی کوئی چیز کمرے میں موجود نہ تھی۔ ورنہ خدا جانے کیا حشر ہوتا۔

زرتاش غصے کے مارے کانپ رہا تھا۔ اُس وقت وہ ایک ڈراؤنا اژدھا معلوم دیتا تھا جو کوئی دم میں مجھے نگل جائے گا۔ جب وہ بولا تو اُس کی آواز شدّت غصہ سے کانپ رہی تھی۔

"جاذب! بڑی شرم کی بات ہے کہ تم اس شخص سے بیوفائی کر رہے ہو اور دھوکا دے رہے ہو جس نے تمہارے پیچھے اپنی عمر برباد کی! جس نے تم کو تعلیم و تربیت دلوائی۔ حیوان سے انسان بنایا۔ ان تمام باتوں کا معاوضہ آج تم اس طرح ادا کر رہے ہو کہ میری زندگی کی مسرّت اور میری اُمیدوں کی روشنی کو مجھ سے ہمیشہ کے لئے چھیننا چاہتے ہو۔ خدا تم سے سمجھے! خدا تم سے اسکا بدلہ لے! ذرا خیال تو کرو—— یہ لڑکی جس سے تم محبت کرنے کے آرزومند ہو جسے تم ورغلا رہے ہو، وہ کون ہے؟—— وہ تمہارے بھائی کی ہونے والی بیوی ہے! تمہاری قابلِ تعظیم بھاوج۔ . . . ."

"بھائی صاحب خدا عظیم ہے!—— میں نے کبھی . . . . ."

میں اسیقدر کہنے پایا تھا کہ شیریں اُٹھ کھڑی ہوئی۔ کہنے لگی:-

"غلط ہے! محض غلط! میں کسی کی ہونے والی بیوی نہیں ہوں۔ جاذب! خدا کے لئے مجھے یہاں سے لے چلو—— زرتاش! تم نے جس طرح مجھے دھوکا دیا ہے، اسیطرح آج فطرت تم کو دھوکا دے رہی ہے! اُفوہ! تمہاری آنکھیں کسقدر ڈراؤنی ہیں۔"

واقعی میرے بھائی کی آنکھیں لہو کی مانند سرخ ہو گئی تھیں۔ اور چہرے پر درندوں کی سی وحشت برس رہی تھی۔ اس وقت وہ سخت طیش میں تھا۔ اُس نے مٹھیاں بھینچ رکھی تھیں۔

"اے پیارے خدا!" میرا بھائی بلند آواز سے کہنے لگا "تو ان پر اپنا قہر نازل کر—— تو نے نوح کی اُمت کو تباہ کر دیا، لوط کی قوم کو برباد کیا۔ اسیطرح انہیں فنا کے گھاٹ اُتار"۔

یہ بد دعائیں سُن نہ سکا:- "بھائی صاحب۔ بھائی صاحب—— خدا کے لئے اپنے چھوٹے بھائی"

میں اسیقدر کہنے پایا تھا کہ اُس نے مجھے دھکیل دیا اور یہ کہتا ہوا ؎

"تو بھی اچھا نہ رہے دل کے جلانیوالے"

کہتا ہوا باہر نکل گیا۔

دروازہ کھلا اور پھر بند ہو گیا!

(۱۲)

اس کے آخری الفاظ اب بھی جب کبھی یاد آتے ہیں۔ تو گھنٹوں قلب پر ایک عجب وحشت سی طاری رہتی ہے!

میرے بھائی کو گئے کامل تین ماہ کا عرصہ گذر چکا تھا۔ شیریں ان پے در پے حادثات سے کسقدر بیمار ہو گئی تھی۔ اس لئے اُسے میں جنوبی ساحل پر بغرض تفریح لے آیا تھا۔

ایک دن میں نے شیریں سے عقد کا تذکرہ کیا۔ جس کو سُنکر وہ کہنے لگی:-

"تمہاری مرضی"

(۱۳)

۳- جنوری کی رات وہ رات تھی، جس کی صبح ہمارا عقد ہونے والا تھا۔ اللہ غنی! وہ بھی کیسی رات تھی۔

چاندنی خوب نکھری ہوئی تھی۔ زرد چاند کوہساروں سے جھانک رہا تھا۔ پہاڑی درخت ہوا کے سرد جھونکوں سے ہل رہے تھے۔ میں برآمدے کے زینے پر کھڑا رات کی کسی چڑیا کا دلگداز نغمہ سن رہا تھا۔ جو پاس ہی ایک شمشاد کے درخت پر بیٹھی تھی +

دفعتاً ہوائیں معطر ہوگئیں۔ خوشبو کی لپٹیں آنے لگیں۔ نارنگی کے پھولوں کی تیز بو نے جو عموماً عروسی خوشبو کہلاتی ہے میرے دماغ کو معطر کردیا۔ میں جدھر جاتا تھا، مکان کے جس حصہ میں جاتا تھا یہ جاں بخش عروسی خوشبو میرا تعاقب کررہی تھی +

میں بے تابانہ اپنی دلہن کے کمرے کی طرف چلا۔ اور بغیر کسی قسم کی اطلاع یا اجازت کے دیوانہ وار اندر چلا گیا۔ میری شیریں نارنگی کے پھولوں میں لپٹی ہوئی دریچے کے آگے آرام کرسی پر بیٹھی چاندنی کی سیر کررہی تھی۔ سفید ریشمی لباس اور نارنگی کی نوشگفتہ کلیوں سے آراستہ دلہن، اُس وقت چاند کی ضیا و شفاف روشنی میں یونانیوں کے حُسن و عشق کی دیوی معلوم ہوتی تھی۔ میں شدّت شوق میں پاگل ہورہا تھا۔

"شیریں! دیکھو تو کیسی اچھی رات ہے! ایسی ہی راتیں ہمیں زندگی سے محبت کرنا سکھاتی ہیں۔ نارنگی کے پھولوں کی یہ خوشبو مجھے مدت العمر تمہارے زمانۂ عروسی کی یاد دلایا کرے گی! شیریں! میری پیاری شیریں! خدا کا شکریہ ادا کرو۔ اُس نے ہمیں کیسی کیسی نعمتیں عطا کی ہیں!"

مگر اُس کی بے وقت کی خاموشی نے میرے خرمنِ آرزو پر بجلی گرائی۔ میں نے جھک کر اُس کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا +

پر ——— میں نے ایک چیخ کے ساتھ اُس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ میرے مُنہ سے بے اختیار چیخیں نکل رہی تھیں۔ ہاتھ یخ کے مانند سرد تھا +

میں نے جھک کر اُس کا چہرہ چھوا +

پر آہ روحی! وہاں کیا تھا ——— ہائے وہاں رکھا ہی کیا تھا ——— دلہن نوجوان دلہن ——— ہمیشہ کے لئے اس کثیف دنیا سے رخصت ہوگئی تھی!

کیا کہوں قاتل تڑپتا چھوڑ کر کیوں چل دیا؟
وار بھی پورا نہ تھا اور تیغ بھی پوری نہ تھی!

ہر طرف موت کا سا سکوت تھا ——— بس صرف نارنگی کی کلیوں کی بُو کمرے میں مہک رہی تھی +

ہائے روحی! اب تم کو معلوم ہوا کہ بددعا کیسی ہوتی ہے؟ ممکن ہوسکے تو تم ہر ایک کی دعا لینے کی کوشش کیا کرو۔ اور جلے دل کی بددعا سے ڈرو +

(۱۴)

میں نے ایک چھوٹی سی آہ بھری۔ کرنل کو دیکھ کر کہنے لگی "آہ کس قدر دردانگیز ہے تمہاری داستان! تقدیر نے عجب گل کھلائے!"

"ہاں ——— یہ سب نوشتۂ تقدیر تھا! اچھا تو میری بیٹی! اب بقیہ کہانی بھی سن لو" اُس نے دوسرا سگریٹ روشن کیا اور کہنے لگا:۔

(۱۵)

"جب مجھے معلوم ہوا کہ میری شیریں مجھے اس مصائب و آلام کی دنیا میں تنہا چھوڑ گئی ہے تو میں غش کھا کر نیچے گر پڑا +

مجھے اس کی خبر نہیں کہ اس کے بعد کیا ہوا۔ مختصر یہ کہ ؎

جہاں جہاں بھی کوئی زندگی کی ٹھوکر تھی!
لئے پھری مری قسمت وہیں وہیں مجھ کو!

سُنتا ہوں کہ پاگل ہوگیا تھا۔ میرے دوستوں نے میرا طبّی معائنہ کرا کر مجھے شہر کے پاگل خانہ میں بھیجدیا ——— اس سے زیادہ وہ کر ہی کیا سکتے تھے! کہانی کا یہ حصہ یقیناً بہت دلچسپ ہے! غور سے سُنو!

مجھے یہ ٹھیک ٹھیک معلوم نہ ہوسکا کہ میں کے سال پاگل خانہ میں رہا۔ اور کتنی مدّت محبوس رہا! سنتا ہوں چھ سال!

ایک شب کا واقعہ بیحد دلچسپ اور حیرت انگیز ہے! میں پاگل خانے کے ایک کمرے میں بستر پر پڑا تھا۔ چاندنی ہر طرف چھٹکی ہوئی تھی۔ رات گرم اور نہایت سنسان تھی۔ اُلّو درختوں پر چیخ رہا تھا۔ اور میرے جنونی خیالات سمندر کی موجوں کی طرح اِدھر اُدھر مکرار ہے تھے +

شب کے گیارہ بجے ہوں گے ——— مجھے کچھ ٹھیک یاد نہیں ——— بہرحال رات کچھ زیادہ ہوگئی تھی ——— کہ کمرے کے شمالی طرف کا دروازہ کھلا۔ اور ایک نرس (جو میری نگہداشت پر مقرر تھی) سفید لباس میں اندر داخل ہوئی اُس کے ہاتھ میں یقیناً دوا تھی اور مجھے پلانا چاہتی تھی، وہ مجھ پر جھکی +

اُس کا جھکنا تھا کہ میرے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ اور میں پلنگ سے کود کر نیچے جا گرا۔ دفعتاً میرے خیالات نے اپنا رُخ بدل دیا۔ کہیں سے کہیں جا پہنچے۔ —— اب میں دیوانہ نہ تھا! مجھے ہوش آگیا تھا! اب میں دوسروں کی طرح ہر بات کو سمجھ سکتا تھا! روحی! تم نے دیکھا خدا کے ارادے؟"

وہ آخر کیا ہوا؟ میں نے سوال کیا +

"ہوا یہ، کہ نرس جونہی مجھ پر جھکی، اُس کے سینے پر سنوارے ہوئے نارنگی کے پھول میرے چہرے پر گر پڑے! میں نے ان پھولوں میں شیریں کی روح ملفوف دیکھی۔ میں نے اُنہیں اُٹھا لیا۔ سینے سے لگا لیا اور چلا چلا کر کہنے لگا:۔

جسم فانی ہے! وہ فنا ہو جاتا ہے! پر روح فنا نہیں ہوتی!
نفسی خواہشات فانی ہیں، وہ فنا ہو جاتے ہیں!
پر عشق فنا نہیں ہوتا! عشق ایک الٰہی صفت ہے!
اسی لئے میری روح کو بھی اس سے عشق ہے!

میں چیخ چیخ کر کہتا اور پھولوں کو چومتا جاتا تھا۔ میرا جنون دھیرے دھیرے کم ہوتا جاتا تھا +

نرس میری ان حرکات کو انتہائی دیوانگی پر محمول رہی تھی۔ مگر اس کم بخت کو کیا خبر تھی کہ اب میں اُس سے کہیں زیادہ ہوشمند اور چالاک ہو چکا تھا!

آہ وہ بھی عجب ستم انگیز گھڑی تھی! میں نے نرس کو قسمیں کھا کھا کر یقین دلایا کہ میں پاگل نہیں ہوں۔ مگر اُس خدا کی بندی نے ایک نہ سنی! جی چاہتا تھا کہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اُس اُداس کھڑکی کے باہر پھینک دوں جو ہر روز رات کے وقت میرے سرہانے ہوا کے لئے کھلی رہتی تھی۔ اور جہاں اُلو چیخیں مارا کرتا تھا۔ چاند کی شعاعیں رقص کرتی تھیں اور میں اپنی قسمت پر رویا کرتا تھا!

ہاں اس کھڑکی کے باہر ——— !

نارنگی کے پھولوں کی تیز بو کمرے میں پھیل گئی تھی۔ میں تھوڑی دیر بعد بے تحاشہ چیخیں مار مار کر رونے لگا۔ مجھے چیخیں مارنے میں کسی قسم کی شرم نہیں آتی تھی۔ کیونکہ دنیا مجھے پاگل سمجھتی تھی۔ اور وہ رات میری آزادی کی آخری رات تھی۔ میں نے سوچا اپنی آزادی سے کیوں نہ فائدہ اُٹھاؤں! یہ سوچ کر میں گلا پھاڑ پھاڑ کر رونے لگا۔ اور اپنی دلہن کا نام لے لے کر چیخیں مارنے لگا! شیریں! شیریں!

نارنگی کی کلیوں کی یہ جان لیوا خوشبو! مجھے ماضی کے دل گداز افسانے یاد دلا رہی تھی! او پروردگار! عجب ساعتیں تھیں!

دوسری صبح ڈاکٹر آیا اور اُس نے مجھے رہا کر دیا۔ مجھے اپنے کمرے میں لیگیا اور دوستانہ بات چیت کی۔ میں نے اپنی کہانی من و عن اُس سے بیان کر دی۔ اُس نے مجھے سیر و سیاحت کی رائے دی۔ اُسی کے مشورے سے میں جنوبی افریقہ کے سفر پر روانہ ہو گیا۔ تم کو یاد ہوگا جب تم جہاز سے سمندر میں گر پڑی تھیں تو سب سے پہلا شخص میں ہی تھا جو سمندر میں کود کر تمہاری مدد کو پہنچا تھا۔ بات اصل یہ تھی کہ میں اپنی جان فنا کرنے پر آمادہ تھا۔ مگر جسکو خدا رکھے اُسے کون چکھے میں نے تمہیں بحفاظت پانی سے نکال لیا، اور جہاز پر آ گیا۔ نہ مچھلیوں نے مجھے اس مصائب و آلام سے بھری ہوئی دنیا سے چھڑایا، نہ سمندر کی خوفناک موجوں نے۔

بس یہ ہے میری داستان!

اب تو تم کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ میں کیوں "نارنگی کی کلیوں" کو دیکھ کر اسقدر خوفزدہ ہو جایا کرتا ہوں!"

اجل نے چاک کیا جب سے اس کا دامنِ زیست
نہیں تمیز گریبان و آستیں مجھ کو

(خاص) مس حجاب اسمٰعیل

تصنیفات مصوّرِ غم علامہ راشد الخیری

شام زندگی ——— قیمت عہ
صبح زندگی ——— " عہ
شب زندگی ——— " عہ
اُمت کی مائیں ——— " عہ
الزہرا ——— " ۱۲
منازل السائرہ ——— قیمت حصہ اوّل عہ حصہ دویم عہ
بنت الوقت ——— قیمت ۸ر
سراب مغرب ——— " ۸ر
سات روحوں کے اعمالنامے ——— " ۸ر

ملنے کا پتہ:۔
منیجر نیرنگ خیال بکڈپو شاہی محلہ لاہور

عید مبارک

از ادیب۔ اے۔ آبادی

تو پاس ہو تو ہے مرا ہر روز روزِ عید
تیرے بغیر عید بھی یوم النشور ہے

اس شعر کے کہنے والے کی طرف سے (خواہ وہ کوئی ہو اور خواہ کہیں ہو) اس کو جسے مخاطب کر کے یہ شعر کہا گیا ہے۔ عید مبارک!

کیا خوب کہا ہے غالب دہلوی نے ایکسو گیارہ روپے والے مرقع چغتائی میں

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

نیرنگ خیال کے مستقل خریداروں کو (یعنی اُن کریم النفس اصحاب کو جو سالانہ وی۔ پی وصول کرنے کی زحمت گوارا فرماتے ہیں اور غیر مستقل خریداروں کو یعنی اُن لوگوں کو جو ایجنٹوں اور ریلوے بک سٹالوں سے خرید کر رسالہ پڑھتے ہیں) اور اُن مستقل مزاج ناظرین کو جو ہمیشہ رسالہ پڑھتے ہیں۔ اور ہمیشہ چرا کر یا آڑا کر یا مانگ کر پڑھتے ہیں (اور ایسے لوگوں کا دم بھی ہندوستان میں غنیمت ہے) عید مبارک!

ان رسالوں کے مستقل خریداروں اور مستقل مزاج ناظرین کو جو کبھی عید نمبر شایع نہیں کرتے۔ اور عید نمبر یا کوئی اور خاص نمبر شایع کرنا شعار اسلامی کے منافی خیال کرتے ہیں اور اسے بدعت بتاتے ہیں۔ باوجود ایسے رسالوں کے مستقل خریدار۔ غیر مستقل خریدار اور مستقل مزاج ناظرین ہونے کے۔ عید مبارک!

ان رسالوں کے مستقل خریداروں غیر مستقل خریداروں اور مستقل مزاج ناظرین کو جو کبھی تصاویر شایع نہیں کرتے (کیونکہ اسے شرع شریف کے خلاف سمجھتے ہیں) یا صرف تیسرے چوتھے سال ایک آدھ تصویر شایع کرتے ہیں (کیونکہ اسے اسراف بیجا خیال کرتے ہیں) بوجہ ایسے شرعی رسالوں کے اور باوجود ایسے کفایت شعار رسالوں کے مستقل خریدار غیر مستقل خریدار اور مستقل مزاج ناظرین ہونے کے عید مبارک!

ان موخر الذکر کفایت شعار رسالوں میں سے ایک رسالے نے جو ہر چوتھے یا پانچویں سال ایک تصویر شایع کرتا ہے۔ مدت ہوئی ایک تصویر شایع کی۔ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ یہ رسالے کے ایڈیٹر کی مشبیہ مبارک ہے۔ اسے دیکھ کر ہمیں ملا جامی کا ایک لطیفہ یاد آگیا۔

کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ملا ساغری نے اپنا یہ مطلع مولانا جامی کو جا کر سنایا۔

تا شنیدم کہ تواں لعل ترا جاں گفتن
آتشے در دلم افتاد کہ نتواں گفتن

مطلع خوب تھا اور پھر ملا ساغری کا مطلع تھا۔ مولانا نے خوب داد دی اور بہت تحسین آفریں کہی۔ ساغری نے خوش ہو کر کہا کہ آپ حکم دیں تو اس مطلع کو لکھ کر چوک پر لگا دیا جائے۔ مولانا نے فرمایا ہاں ضرور اور بہتر ہے کہ تمہیں بھی ساتھ ہی لٹکا دیا جائے۔ تاکہ معلوم ہو سکے کہ یہ مطلع کس کا ہے۔

اس رسالے کے مستقل خریداروں۔ غیر مستقل خریداروں اور مستقل مزاج ناظرین کو عید مبارک!

انہی رسالوں میں سے ایک نے ابھی تھوڑی مدت ہوئی کہ تین ادیبوں کی تصویریں شایع کی تھیں۔ ان ادبائے ثلاثہ میں سے ایک ادیب کا ادبی شاہکار (یعنی عدالتی اشتہار) اسی رسالہ میں شایع ہوا تھا۔ لیکن باقی دو ادیبوں کے ادبی مقالات اس رسالے میں یا کسی اور رسالے میں باوجود تحقیق و تفتیش کے ابھی تک ہماری نظر سے نہیں گذرے۔ ممکن ہے گمنام لکھتے ہوں۔ اس رسالے کے مستقل خریداروں، غیر مستقل خریداروں اور مستقل مزاج ناظرین کو۔ عید مبارک!

اُن رسالوں کے مستقل خریداروں، غیر مستقل خریداروں اور مستقل مزاج ناظرین کو جو آج بوڑھے ہو کر بھی اسی لباس میں ملبوس نظر آتے ہیں جو اُنہوں نے پیدا

میر ولی اللہ بی اے "ادیب" ایل ایل بی ایڈووکیٹ ایبٹ آباد

خوش وضع دلکش نمونوں کے

زنانہ سلیپر

کرنال شاپ انارکلی لاہور

ہونے پرزیب تن فرمایا تھا۔ اور تہیہ کر لیا ہے کہ مرکر بھی اسی لباس میں مدفون ہونگے۔ عید مبارک!

اُن رسالوں کے مستقل خریداروں، غیر مستقل خریداروں اور مستقل مزاج ناظرین کو جو پیدا ہوئے، جوان ہوئے۔ بوڑھے ہوئے اور مرگئے یا جو پیدا ہوئے اور جوان ہوئے اور عین عالمِ جوانی میں مرگئے یا جو پیدا ہوتے ہی مرگئے۔ یا جو پیدا ہونے سے پہلے ہی مرچکے تھے۔ بوجہ اور باوجود ایسے رسالوں کے مستقل خریدار، غیر مستقل خریدار اور مستقل مزاج ناظرین ہونے کے۔ عید مبارک!

ان سہ ماہی رسالوں کے مستقل خریداروں، غیر مستقل خریداروں اور مستقل مزاج ناظرین کو جو باوجود سہ ماہی ہونے کے آٹھ روپے سالانہ سے ایک پیسہ کم نہیں لیتے۔ یا جو بوجہ سہ ماہی ہونے کے ایک روپیہ بارہ آنہ سالانہ سے ایک پیسہ زیادہ نہیں لیتے۔ اور جو صرف عالمانہ اور محققانہ مقالات شایع کرتے ہیں (جن عالمانہ اور محققانہ مقالات کو پڑھنے والوں کی تعداد ان عالمانہ اور محققانہ مقالات کے لکھنے والوں کی تعداد سے کبھی زیادہ نہیں ہوئی) یا بوجود عالم اور محقق ہونے کے یا بوجہ عالم اور محقق ہونے کے۔ عید مبارک!

اُن رسالوں کے مستقل خریداروں، غیر مستقل خریداروں اور مستقل مزاج ناظرین کو جو جواہرات کوڑیوں کے مول بیچتے ہیں یعنی بارہ آنہ سالانہ میں پورے بارہ رسالے نذرِ ناظرین کرتے ہیں۔ ثم یعنی اپنے جواہرات کو شیخ محمد اصغر جوہری سے بھی ارزاں تر قیمت پر فروخت کرتے ہیں فثم یعنی کوڑی کے تین تین مضامین کوئی مضمون ایک کوڑی پر فروخت کرکے اہلِ ملک کی علمی۔ ادبی۔ سیاسی۔ بدنی۔ معاشرتی۔ مذہبی۔ اخلاقی، تاریخی اور فلسفی خدمت کرتے ہیں۔ بوجہ مجہول، مظلوم اور مغبون ہونے کے عید مبارک!

اما بعد ان تمام مذکورۂ بالا رسالوں کے ڈائرکٹروں، ایڈیٹروں۔ آنریری ایڈیٹروں، اسسٹنٹ ایڈیٹروں، سب ایڈیٹروں اور مدیرانِ مسئول وغیر مسئول و مدیران سائل وغیر سائل و مدیرانِ منقول وغیر منقول و مدیران ناقل و غیر ناقل و مدیرانِ معقول وغیر معقول و مدیرانِ عاقل وغیر عاقل و مدیران مجہول وغیر مجہول و مدیرانِ جاہل وغیر جاہل و دیگر مصادر لامیہ ثلاثی کے سیستم فعلا کو جو عموماً جج سب جج، وکیل، بیرسٹر، پروفیسر، حکیم، ڈاکٹر، کتاب فروش اور پان فروش (وغیرہ وغیرہ) ہوتے ہیں اور جو رفاہِ عام کی خاطر جج، سب جج، وکیل، بیرسٹر، پروفیسر، حکیم، ڈاکٹر، کتاب فروش اور پان فروش (وغیرہ وغیرہ) ہوتے ہوئے بھی ادبی رسالوں کی ایڈیٹری کے لئے وقت نکال لیتے ہیں اور سالہا سال تک پانچ سو روپیہ ماہوار کے خسارہ پر ان رسالوں کو جاری رکھتے ہیں اور محض اس لئے کہ امت مرحوم کے افراد میں لکھنے پڑھنے کا شوق پیدا کریں۔ گھر کا اثاثہ بیچ بیچ کر رسالے چھپواتے رہتے ہیں۔ عید مبارک!

پھر اس کے بعد ان مضمون نگاروں کو اور اُن مضمون نگارنیوں کو جو رسالوں میں عُریاں عشقیہ کہانیاں لکھ کر رسالوں کے ادبی معیار کو اور ناظرین و ناظرات کے اخلاقی معیار کو بلند سے بلند تر بنانے کی کوشش میں دن رات سرگرداں رہتے ہیں۔ اور ان ادیبوں کو جو مغربیات کو مشرقیات میں یعنی انگریزیات کو ہندوستانیات میں ملا کر بیمار ہندوستان کے لئے معجون مرکب تیار کرتے رہتے ہیں۔ اور ان بزرگوں کو جو قلزم علم میں محققانہ غوطے لگا کر دور کی کوڑی لاتے ہیں اور دیوان حافظ کو دیوان ابن یمین کا جزو مسروقہ ثابت کرتے ہیں اور رباعیات عمر خیام کی مقدار کو کبھی بڑھاتے بڑھاتے پندرہ سو سے اوپر لے جاتے ہیں اور کبھی گھٹاتے گھٹاتے دس پندرہ سے بھی نیچے لے آتے ہیں اور دیوان مخفی کے مصنف کو کبھی مذکر بتاتے ہیں اور کبھی مونث (خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ ابھی تک مخنث نہیں کہا) اور فردوسی کی عین حیات میں شاہنامۂ فردوسی کے چودہ یا پندرہ ایڈیشنوں کا چھپ کر شایع ہو جانا بیان کرتے ہیں۔ اور اردو زبان کو کبھی سنسکرت کی ماں اور کبھی ہندی کی بیٹی اور کبھی پنجابی کی بہو ثابت کرتے ہیں۔ اور جہاں اس بچاری کو کل شاہجہان کے لشکر کی لین چھوکری بتاتے تھے آج راجہ بکرماجیت کے حرم سرا کی لونڈی کہہ رہے ہیں۔ اور ان استادوں کو جو فن تنقید کو صحیح معنوں میں حاصل کرکے تنقید شعری کو اوج کمال پر لے جارہے ہیں۔ اور غالب کے بعض شعروں کو بے معنی اور ذوق کے بعض شعروں کو با معنی بتا رہے ہیں۔ اور ناسخ و آتش کا مقابلہ کرکے ایک دوسرے کو ناسخ و منسوخ بتا رہے ہیں۔ اور مومن کی غزل کو غالب کی غزل سے بہتر اور غالب کی اردو کو قرآن کی عربی سے بہتر کہہ رہے ہیں۔ عید مبارک!

ابھی تھوڑا عرصہ ہی گذرا ہے کہ ادیبان اردو کے ایک گروہ نے ادبیات میں سے ادب لطیف کو پسند کیا اور ادب لطیف کو شاعرانہ نثر میں ایک نئی بحر کی طرح ڈالی یعنی آ آ۔ آ (فع۔ فع فع) یہ بحر ایسی ہر دلعزیز ہوئی کہ چاروں طرف سے آ آ۔ آ کے نعرے بلند ہونے شروع ہوئے۔ ان مستانہ نعروں میں سے چند جو ذہن میں محفوظ رہ گئے ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ ناظرین تک پہنچا دیئے جائیں۔

آ آ۔ اے اپنے مرمریں تبسم سے عاشق کے تبوریں دل کو چور چور کر دینے والی۔ آ +

آ آ۔ اے اپنے ہلال ابرو سے عاشق کے افق تخیّل پر ہلال عید نمودار کر دینے والی۔ آ +

آ آ۔ اے اپنی گرمیٔ رفتار سے عاشقوں کے کرۂ دل کے بحر منجمد شمالی و بحر منجمد جنوبی کو بھاپ بنا کر اُڑا دینے والی۔ آ +

آ آ۔ اے اپنے ہونٹوں کے لبِ مذاب کی سیال سرخی سے میرے آسمانِ دل کی شفق کی رنگینیوں کو تاریکی میں تبدیل کر دینے والی۔ آ +

آ آ۔ اے اپنی لبریز خمار آنکھوں کی گردش سے بزم محبت کے بادہ خوارِ ں کو مدہوش، بیوقوف، احمق اور مجموعا لحواس بنا دینے والی۔ آ

آ آ۔ اے اپنے ترکش مژگاں کے ایک ایک تیر سے سَو سَو دلوں میں ہزار ہزار چھید کر دینے والی۔ آ +

آ آ۔ اے اپنا حنائی انگوٹھا دکھا کر اپنے آوارہ مزاج جاں نثاروں کے خرمن اُمید کو آگ لگا دینے والی۔ آ +

آ آ۔ اے حسن کی دیوی جس نے باوجود اپنی تانیث کے عشق کے دیو کو باوجود اس کی تذکیر کے مغلوب و مقہور کر لیا ہے۔ اپنی اس فتح پر اور فریق ثانی کی اس شکست پر نازاں نہ ہو کیونکہ شکست و فتح نصیبوں پر ہے۔ دیکھ کہ تقاضا تو خوب ہوا ہے۔ اس حقیقت پر نظر کر اور آ +

آ آ۔ اے نشۂ شباب کی متوالی۔ یہ نشہ اُتر جانے والا ہے۔ اور بڑھاپا آ جانے والا ہے۔ دیکھ کہ میں بھی آج سے چالیس سال پہلے جوان تھا۔ اب بوڑھا ہوں۔ انّا للہ و انّا الیہ راجعون پر غور فرما اور آ +

آ آ۔ اے حسین قتالہ۔ قتل عمد جرم ہے۔ اور اس جرم کی سزا پھانسی ہے۔ مکافات عمل سے غافل نہ ہو اور ضرور آ +

آ آ۔ اے حسین و جمیل ساحرہ۔ تو جانتی نہیں کہ سحر گناہ کبیرہ ہے اور اسی گناہ کی پاداش میں مسماۃ زہرا اور اس کے دونوں بھائی مسمی ہاروت و مسمی ماروت چاہ بابل میں قید کر دیئے گئے تھے۔ ان تاریخی واقعات سے عبرت حاصل کر اور آ +

آ آ۔ اے دختر ترسا۔ دیکھ کہ میں تیرا پڑوسی ہوں اور انجیل کا حکم ہے کہ اپنے پڑوسی سے محبت کر (اور اپنے خاوند سے نفرت) اس مقدس حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر اور آ +

آ آ۔ اے مسیحائی کا دم بھرنے والی اور ساتھ ہی طبقات عشاق میں درد سر، درد دل، درد معدہ، بخار، نمونیہ، وجع مفاصل، تپ محرقہ، تپ لرزہ، ہیضہ اور طاعون پھیلانے والی۔ خدا سے ڈر اور آ +

آ آ۔ اے رقیب روسیاہ کے قید خانہ کی چار دیواری میں دن رات بند رہنے والی۔ دفعہ ۴۹۸ تعزیرات ہند کی مطلق پروا نہ کر اور آ۔ وعلیٰ ہٰذالقیاس +

یہ بچاری آنے والیاں جب کبھی بھول کر گھر سے باہر قدم رکھتیں تو چاروں طرف سے یہی آ آ۔ آ کے نعرے سنتیں اور دل ہی دل میں سمجھا جا۔ بیہودہ بکواس نہ کر جا! کہتے ہوئے پھر گھروں میں جا چھپتیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان آنے والیوں نے گھروں سے باہر نکلنا مطلقاً بند کر دیا۔ اور یہ آ آ کہنے والے درد فراق میں ایسے مبتلا ہوئے کہ جاں بر نہ ہو سکے۔ بعض بچارے برد اللہ مضجعہٗ ہو گئے (خدا وند کریم ان کی خوابگاہوں کو گرمیوں میں سرد اور سردیوں میں گرم کرے) اور بعض نور اللہ مرقدہٗ بن گئے (اللہ تعالیٰ اُن کی آرام گاہوں کو شہر میں ہوں تو بجلی کی روشنی سے اور گاؤں میں ہوں تو مٹی کے تیل کے دیوؤں سے روشن کرے)

ان مرحوم و مغفور ادیبوں کے نام لیوا اب بھی اگر باقی ہوں تو انہیں عید مبارک! نیرنگ خیال کے عید نمبر کے کاتب کو بشرطیکہ وہ ہمارے اس علمی، ادبی، اصلاحی، اخلاقی، مذہبی، تنقیدی، صوفیانہ، فلسفیانہ، اور محققانہ مقالے کو ہمارے گذشتہ علمی اور ادبی مقالے (یعنی دال کی فریاد) کی طرح کتابت کی غلطیوں سے کہیں کہیں بے مزہ اور کہیں کہیں بے معنی بنا کر نہ رکھ دے عید مبارک (سہو سے کوئی بشر خالی نہیں اگر کاتبوں کی تصحیح نہ کیجائے تو اسکا کیا علاج؟ منجانب کاتب)

غلام خامۂ آں کاتبم کہ شعر مرا ۔۔۔ چنانچہ بود نوشت، نہ ہرچہ خواست نوشت
اگرچہ شعر فروغ اندر دہم ۔ مے گیرد ۔۔۔ دروغ و راست درو ہرچہ بود لست نوشت

عید ہر سال آتی ہے اور بعض محققانِ لغت عرب و فرس کی زبانی سنا گیا ہے کہ اسے عید اسی لئے کہتے ہیں کہ یہ ہر سال آتی ہے۔ محققین کی اس رائے کی خامی ظاہر ہے۔ کیونکہ روزے بھی (عید سے ایک مہینہ پہلے) ہر سال تشریف لاتے ہیں۔ اور باوجود ہر سال تشریف فرما ہونے کے عید نہیں کہلاتے۔ ہماری ذاتی تحقیقات کا نتیجہ یہ ہے کہ عید کو عید صرف اسی لئے کہتے ہیں کہ یہ عید ہے اگر عید عید نہ ہوتی تو اسے عید کون کہتا۔ اور اگر کوئی کہتا تو بیوقوف کہلاتا۔ اسیطرح روزے بھی روزے اس لئے کہلاتے ہیں۔ کہ وہ روزے ہیں۔ اگر روزے روزے نہ ہوتے تو انہیں کون عقلمند روزے کہتا +

مخفی نہ رہے کہ ہر سال دو عیدیں آتی ہیں۔ ایک چھوٹی عید یعنی عید الفطر اور ایک بڑی عید یعنی عید الاضحیٰ (جسے رسالوں اور اخباروں کے مدیران مسئول و مدیران غیر مسئول عموماً عید اضحیٰ لکھتے ہیں) چھوٹی عید سے پہلے روزے رکھنے پڑتے ہیں اور تراویحیں پڑھنی پڑتی ہیں۔ بڑی عید سے پہلے نہ روزے رکھنے پڑتے ہیں۔

نہ تراویحیں پڑھنی پڑتی ہیں۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ چھوٹی عید کو چھوٹی عید اور بڑی عید کو بڑی عید کہتے ہیں ؂

دولت آں است کہ بے خون دل آید بکنار
ورنہ باسعی و عمل باغ جناں ایں ہمہ نیست

بے شک ایں ہمہ نیست۔ تیس دن روزے رکھ کر ایک دن عید کر لینا بھی اگر عید ہی ہے تو اس عید کو زیادہ سے زیادہ چھوٹی عید ہی کہہ سکتے ہیں۔ زیادہ نہیں ٭

نیرنگ خیال والے ہمیشہ چھوٹی عید کے موقعہ پر عید نمبر نکالتے ہیں۔ معلوم نہیں دن کو روزے رکھ کر اور رات کو تراویحیں پڑھ کر یہ لوگ کون سا معجون کھاتے ہیں کہ دن رات ایک کر کے نیرنگ خیال کے عید نمبر جیسا ایک ضخیم اور بے حد دلچسپ عید نمبر مرتب کر کے تیار کر لیتے ہیں۔ غالباً جہاں تک روزے اور تراویح کا تعلق ہے ان بزرگوں کی چھوٹی عید کسی طرح بھی بڑی عید سے چھوٹی نہیں ہوتی ٭

ایں سعادت بزور بازو نیست — تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اندریں حالات ظن غالب یہی ہے کہ نیرنگ خیال والوں کی عید (یعنی چھوٹی عید) عید کے مندرجہ ذیل اقسام میں سے تیسری قسم کی عید ہے۔ اگر ہمارا یہ ظن ظن المومنین نہ ہو۔ تو یہ صاحبان ہمیں اطلاع دے سکتے ہیں۔ ہم نہایت صدق دل سے تردید شایع کرنے پر تیار ہوں گے۔ اگر اس پر بھی ان کی تسلی نہ ہو تو وہ ہم پر ازالۂ حیثیت عرفی (یا اگر چاہیں تو ازالۂ حیثیت فیضی) کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ خرچہ عدالت و خرچہ وکیل وغیرہ کے وہ خود ذمہ دار ہوں گے ٭

ناظرین کرام پر واضح ہو کہ جہاں ابتدائے اسلام میں مسلمانوں کی صرف ایک قسم ہوتی تھی۔ وہاں اسلامی تیوہار بھی صرف ایک ہی قسم کے ہوتے تھے۔ جوں جوں زمانہ ترقی کرتا گیا اور علم و تہذیب کی برقی روشنی نے انسانی آنکھوں کو خیرہ و تیرہ کرنا شروع کر دیا مسلمانوں کی کئی قسمیں ہو گئیں اور ساتھ ہی اسلامی تیوہاروں کی بھی کئی قسمیں بن گئیں۔ چنانچہ چھوٹی عید بچاری بھی اس تقسیم سے نہ بچ سکی۔ اور چار قسموں میں منقسم ہو گئی ٭

(۱) ان لوگوں کی عید جو روزے رکھتے ہیں اور عید کرتے ہیں ٭
(۲) ان لوگوں کی عید جو روزے رکھتے ہیں اور عید نہیں کرتے ٭
(۳) ان لوگوں کی عید جو روزے نہیں رکھتے اور عید کرتے ہیں ٭
(۴) ان لوگوں کی عید جو نہ روزے رکھتے ہیں اور نہ عید کرتے ہیں ٭

اس تقسیم پر اگر کوئی منطقی منطقیانہ اعتراض یا کوئی مولوی مولویانہ اعتراض کرے تو یہ اس کی حماقت ہے۔ کیونکہ ہم بعونہٖ تعالیٰ نہ منطقی ہیں۔ نہ مولوی۔ صرف مضمون نگار ہیں۔ اور رسالوں کے مضمون نگاروں کو نہ منطقی ہونے کی ضرورت ہے۔ نہ مولوی ہونے کی حاجت۔ صرف رسالوں کا مضمون نگار ہونا کافی ہے ٭

امّا بعد پہلی قسم کی عید اُن لوگوں کی عید ہے جو سیدھے سادے مسلمان ہوتے ہیں۔ نہ روزے کی فلاسفی پر بحث کرتے ہیں اور نہ اس کے طبّی اغراض و مقاصد سے کچھ واسطہ رکھتے ہیں۔ بس اتنا جانتے ہیں کہ روزے آ گئے۔ بڑے اہتمام سے سویرے اُٹھتے ہیں۔ سحری نوش جاں فرماتے ہیں۔ دن بھر نہ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں (پینے میں حقہ پانی دونوں شامل ہیں) شام کو افطاری کا انتظام کرتے ہیں۔ اور بڑے سلیقے سے روزہ کھولتے ہیں۔ مہینہ بھر اسی پروگرام پر عمل پیرا رہتے ہیں۔ مہینہ گذرنے پر (یا ایک دو دن پہلے ہی) بڑے شوق سے ہلال عید کے لئے افق مغرب پر آنکھیں سی دیتے ہیں اور چاند دیکھ کر یا سُن کر کہ کسی نے چاند دیکھ لیا ہے۔ عید کی تیاریوں میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ دوسرے روز صبح سویرے اُٹھ کر منہ ہاتھ دھو کر (یا بعض صورتوں میں نہا کر) نئے یا دُھلے ہوئے کپڑے پہن لیتے ہیں۔ اور عید گاہ میں جانے کے لئے پا برکاب ہو بیٹھتے ہیں۔ جب عید گاہ میں پہنچ کر صفیں سیدھی کر لیتے ہیں (یعنی اتنی سیدھی جتنی ان سے توقع ہو سکتی ہے) تو زاید تکبیروں کے لئے عین نماز میں اِدھر اُدھر دیکھتے جاتے ہیں کہ غلطی نہ ہو جائے۔ نماز ختم کر کے باقی تمام نمازیوں سے بغلگیر ہوتے ہیں اور سال بھر کا کہا سُنا بخشواتے ہیں۔ پھر گھر آتے ہیں اور دہلی کے ہوئے تو سویاں اور لاہور کے ہوئے تو سیویاں کھاتے ہیں۔ اس قسم کے تمام سیدھے سادے مسلمانوں کو عید مبارک!

دوسری قسم کی عید ان لوگوں کی عید ہے جو پکّے مسلمان ہوتے ہیں۔ روزے اس لئے رکھتے ہیں کہ روزے رکھنا فرض سمجھتے ہیں اور عید اس لئے نہیں کرتے۔ کہ عید کا سامان کرنے کی توفیق نہیں ہوتی۔ نئے کپڑے تو خیر پُرانے کپڑوں کی دُھلائی بھی نہیں دے سکتے۔ عید گاہ میں جاتے ہیں۔ لیکن کوئی ان سے بغلگیر نہیں ہوتا۔ بچارے ڈرتے ڈرتے دور ہی سے لوگوں کو عید مبارک کہہ لیتے ہیں اور جو لوگ انکی عید مبارک کے جواب میں عید مبارک کہہ دیتے ہیں وہ گویا بنی نوع انسان کے لئے بڑی قربانی کرتے ہیں۔ اور اس قربانی پر دل ہی دل میں نازاں رہتے ہیں۔ یہ بھی غنیمت ہے کہ محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے تو ہو جاتے ہیں۔ خدا نہ کرے کہ کوئی وقت ایسا آئے کہ یہ بات بھی داستان پارینہ ہو کر رہ جائے۔ ان بے برگ و نوا مسلمانوں کو بہت بہت عید مبارک!

تیسری قسم کی عید اُن مسلمانوں کی عید ہے جو سب سے زیادہ اسلام کے خیر خواہ ہوتے ہیں مگو بوجہ ضعف معدہ یا بوجوہ دیگر وہ روزے نہیں رکھ سکتے۔ لیکن عید سب سے

زیادہ شان وشوکت کے ساتھ مناتے ہیں۔ عیدگاہ میں سب سے پہلے تشریف لے جاتے ہیں اور سب سے پہلی صف میں کھڑے ہوتے ہیں۔ اور غریب مسلمانوں کے ساتھ شانہ بشانہ نماز میں شامل ہو کر دنیا کو جہاد بالنفس کی تعلیم دیتے ہیں۔ عیدگاہ سے نکل کر سیدھے گھر آتے ہیں۔ اور آرام کرسی پر تشریف رکھ کر سامنے دو چار قسم کے خشک میوے اور کچھ شیرینی وغیرہ رکھ دیتے ہیں۔ یہ تمام شہر کے لئے خوان یغما ہوتا ہے۔ لوگ آتے ہیں۔ سلام کرتے ہیں۔ عید مبارک کہتے ہیں اور دو چار دانے کسی چیز کے کھا کر واپسی کی اجازت طلب کرتے ہیں۔ یہ تانا بانا دن بھر لگا رہتا ہے۔ آپ کرسی پر بیٹھے دل ہی دل میں بڑی احتیاط سے ان لوگوں کی فہرست مرتب کرتے جاتے ہیں جو اُن کے پاس سلام کرنے کو آتے ہیں اور صحیح معنوں میں مسلمان کہلانے کا حق رکھتے ہیں۔ جو بچارے کسی معقول یا غیر معقول وجہ سے عید کے سلام کے لئے حاضر نہیں ہو سکتے وہ بلیک لسٹ میں درج کر لئے جاتے ہیں۔ یہ سیاہ فہرست بھی دل ہی میں مرتب ہوتی ہے اور سال بسال بڑھتے بڑھتے ان صاحب کے دل کو بالکل سیاہ کر دیتی ہے۔ یہ لوگ چونکہ اسلام کے خیر خواہ ہوتے ہیں اور بعض صورتوں میں ملت بیضا کے رہنما بھی ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کو بھی عید مبارک!

چوتھی قسم کی عید اُن لوگوں کی عید ہے جو بجے حد تہذیب یافتہ مسلمان ہیں۔ نئی تہذیب کی روشنی نے ان لوگوں کے دلوں کو اس درجہ منور کر دیا ہے۔ کہ وہ ہر ایک چیز کے حقایق و معارف پر نگاہ غائر ڈالنے کے اہل ہو گئے ہیں۔ وہ روزے کی فلاسفی پر غور کرتے ہیں تو کم از کم موجودہ زمانے میں روزے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ اس لئے وہ روزے نہیں رکھتے۔ وہ روزے کے طبی اغراض پر نظر ڈالتے ہیں تو اسے کسی صورت میں ضروری نہیں سمجھتے۔ جب کبھی نصیب اعدا بیمار پڑ جاتے ہیں تو ڈاکٹر کے مشورہ پر ایک آدھ وقت کھانے کا ناغہ کر لیتے ہیں۔ عید یہ لوگ اس لئے نہیں کرتے کہ اس میں انہیں اسراف نظر آتا ہے۔ اور وہ جانتے ہیں کہ آجکل مسلمانوں کے لئے کفایت شعاری ایک ایسی ضروری چیز ہے جس پر تمام تیوہاروں کو قربان کیا جا سکتا ہے۔ عیدگاہ میں وہ اس لئے نہیں جاتے کہ وہ ہمیشہ (یعنی دن رات) انگریزی لباس میں ملبوس ہوتے اور اس لباس میں رکوع سجود اور قعود کا رے دارد۔ ان تہذیب یافتہ مسلمانوں کو اگر کوئی آدمی (غلطی سے) عید مبارک کہہ دے۔ تو وہ اسے بیوقوف سمجھتے ہیں۔ اسنا ہم چونکہ بیوقوف نہیں اور اگر (ناظرین نیرنگ خیال کی رائے میں) ہم بیوقوف ہیں بھی تو بیوقوف کہلانا پسند نہیں کرتے۔ اس لئے ہم ان بیحد مہذب مسلمانوں کو عید مبارک کہنے سے پرہیز کرتے ہیں۔ اور اُمید کرتے ہیں کہ اگر نیرنگ خیال کے پڑھنے والوں میں بھی کوئی صاحب بیحد مہذب مسلمان ہوں۔ تو وہ ہمیں اس امر میں معذور سمجھیں *

یہ تقسیم اصولی تھی۔ اگر فروعات کا خیال کیا جائے تو اور کئی قسمیں بھی عید کی اور عید کرنے والوں کی موجود ہیں۔ مثلاً وہ لوگ جو سحری کھاتے ہیں اور روزے نہیں رکھتے۔ اس صنف کے ابوالآبا پرانے زمانے کے ایک بزرگ تھے۔ رمضان آیا اور آپ نے بیگم صاحبہ کو تاکید کی کہ سحری کے لئے یہ چیز بھی تیار ہونی چاہئے اور وہ چیز بھی۔ یہ کھانا بھی ہو اور وہ بھی۔ اسی طرح کئی عمدہ عمدہ کھانے تیار کرانے کا انتظام فرما لیا۔ اور سحر کے وقت ان کھانوں پر خوب ہاتھ صاف کیا۔ دو چار دن یہی پروگرام چلتا رہا۔ ایک روز بیوی کو معلوم ہوا کہ میاں سحری تو کھاتے ہیں لیکن روزے نہیں رکھتے۔ سحری کے اس بیجا تردد پر ناراض ہوئی اور میاں سے شکایت کی کہ جب آپ روزے نہیں رکھتے تو آدھی رات کو مجھے سحری تیار کرنے کی تکلیف کیوں دیتے ہیں۔ میاں نہایت غصے سے بولے۔ بیوقوف! تم نے مجھے اتنا ہی کافر سمجھ لیا ہے کہ روزے بھی نہ رکھوں اور سحری بھی نہ کھاؤں *

سبحان اللہ کیا معقول جواب ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ جہاں مسلمانوں کو روزے رکھنے کی تاکید ہے وہاں سحری کھانے کا بھی حکم ہے۔ اگر دونوں حکموں کی تعمیل ممکن نہ ہو تو ایک حکم کی تعمیل ہی سہی۔ اسی صنف کے ایک اور مسلمان کی روایت کرتے ہیں کہ وہ نماز نہیں پڑھا کرتا تھا۔ ایک دوست نے گلا کیا کہ تم مسلمان ہو کر نماز نہیں پڑھتے۔ اس نے جواب دیا کہ قرآن کے حکم کی تعمیل کرتا ہوں۔ دوست نے حیران ہو کر پوچھا کہ قرآن میں نماز نہ پڑھنے کا حکم کہاں ہے۔ اس نے کہا قرآن شریف میں آیا ہے۔ لاتقربوا الصلوٰۃ۔ (یعنی نماز یا مسجد کے نزدیک مت جاؤ) دوست نے کہا کہ اگلی عبارت بھی پڑھئے (وانتم سکاریٰ = بحالیکہ تم نشے میں ہو) اس پر وہ شخص جھنجھلا کر بولا کہ سارے قرآن پر تمہارے باپ نے عمل کیا ہوگا۔ ہم سے تو جتنا بن پڑتا ہے کرتے ہیں *

اس قسم کے تمام مسلمانوں کو چونکہ وہ سحری بھی کھاتے ہیں اور عید بھی کرتے ہیں (گو روزے نہیں رکھتے) اور نیز چونکہ ان کے پاس ایسا کرنے کے معقول دلائل بھی موجود ہیں۔ عید مبارک!

اس فروعی تقسیم میں ان لوگوں کا ذکر بھی غالباً بیجا نہ ہوگا جو روزہ رکھ کر دائرۂ انسانیت سے خارج ہو جانا اپنا شرعی حق سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ روزہ رکھ کر دن بھر لڑنے مرنے پر تیار بیٹھے رہتے ہیں۔ اگر کوئی ذرا سی بات بھی ان کے خلاف طبع ہو گئی۔ تو وہ فوراً غصے میں آجاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دیکھو ہوش سنبھال کر بات کرو۔ میں نے

روزہ رکھا ہے (گویا تمام اولاد آدم پر احسان کیا ہے) اگر دوسری طرف سے جواب میں ذرا بھی اونچ نیچ ہوئی تو یہ صاحبان ایک دوسرے کے گلوگیر ہو گئے۔ اور تحفظ حقوق شریعت کو یہاں تک پہنچایا کہ کچہری جا پہنچے۔ اس قسم کے واقعات رمضان میں عام طور پر ہوتے رہتے ہیں۔ اور ایسا کیوں نہ ہو آخر روزہ رکھا ہے۔ اور اگر روزے سے طبیعت پر اتنا اثر بھی نہ ہو تو وہ روزہ روزہ ہی کیا۔ جو لوگ روزے اس قسم سے رکھتے ہیں۔ لہٰذا ان اصحاب کو بھی عید مبارک!

اسی تقسیم میں وہ لوگ بھی آتے ہیں جو رمضان میں سحری اور افطاری کو ملا کر روزانہ اتنا کھا جاتے ہیں۔ جتنا وہ رمضان سے باہر تین دن میں بھی نہیں کھا سکتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معدہ کام کرنے سے جواب دے بیٹھتا ہے۔ انہی لوگوں کی برکت سے رمضان میں اکثر ہضمی اور ہیضہ کی شکایت ہو جاتی ہے۔ دن بھر ان لوگوں کے منہ سے سوء ہضم کی وجہ سے بو آتی رہتی ہے اور ان کے پاس بیٹھنا ایک اچھی خاصی مصیبت بن جاتی ہے۔ مگر یہ لوگ اس بات پر بھی فخر کرتے ہیں۔ اور فخر کیوں نہ کریں۔ مولوی صاحبان ان کو رمضان کے وعظ میں ہمیشہ بتایا کرتے ہیں کہ روزہ دار کے منہ سے جو بو نکلتی ہے۔ اُسے نکلتے ہی فرشتے منہ میں ڈال کر آسمانوں پر چلے جاتے ہیں۔ ممکن ہے یہ بات درست بھی ہو۔ ورنہ یہ لوگ تمام کرۂ ارضی کی ہوا کو متعفن کر دینے کے اہل ہوتے ہیں۔ بہرحال صرف پُرخوری کے الزام پر ان صاحبان کو عید مبارک سے محروم رکھنا قرین انصاف معلوم نہیں ہوتا۔ لہٰذا ایسے تمام روزہ داروں کی خدمت میں بھی عید مبارک!

اکثر دیکھا گیا ہے کہ وہ روزہ دار جنہیں تمباکو پینے کی عادت ہوتی ہے۔ تمام دن حقہ نہ ملنے کی وجہ سے شام کے وقت بالکل بے صبر ہو جاتے ہیں۔ افطار سے ایک گھنٹہ پہلے حقہ لے کر بیٹھتے ہیں اور اسے تازہ کرتے ہیں اور پھر تازہ کرتے ہیں افطار سے چند منٹ پہلے چلم میں خشک پشاوری تمباکو بھرتے ہیں اور دیا سلائی ہاتھ میں لے کر نقارے کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ جب اُدھر ڈم ڈم ہوئی اُنہوں نے تمباکو کو دیا سلائی دکھائی۔ اور دو تین وہ زبردست کش حقے کے لئے کہ الامان الامان پچاس فیصدی کی یہ حالت ہوتی ہے کہ کش لگاتے ہی لیٹ جاتے ہیں۔ اور بیہوش ہو جاتے ہیں۔ ہوش آنے پر آن کی مشتاق نگاہیں زبان حال سے حقے کو مخاطب کر کے کہتی ہیں ؎

من شمع جاں گدازم تو صبح دل کشائی — سوزم گریت نہ بینم میرم چو رخ نمائی
نزدیکت ایں چنینم دور آنچناں کہ گفتم — نے تاب وصل دارم نے طاقت جدائی

فلہٰذا تمباکو نسوار چرس چنڈو مدک گانجا افیون شراب بھنگ اور اسی قسم کے دوسرے مفرحات سے روزہ کھولنے والے روزہ داروں کو عید مبارک!

اور سچ پوچھئے تو عید صرف ان بچوں کی عید ہے جن پر ابھی روزے فرض نہیں لیکن شوق سے روزے رکھتے ہیں۔ دن بھر کی بھوک پیاس اور پابندی ان کے پھول جیسے چہروں کو مرجھا دیتی ہے۔ ابھی روزہ کھلنے میں دو تین گھنٹے باقی ہوتے ہیں کہ وہ گھبرا گھبرا کر ہر پانچ منٹ کے بعد گھر کے بڑوں سے پوچھتے ہیں کہ افطاری میں ابھی کتنی دیر ہے۔ ماں باپ اُنہیں دن میں کئی دفعہ روزہ توڑ دینے کے لئے کہتے ہیں۔ لیکن وہ نہیں مانتے۔ ایک دو نہیں کئی کئی روزے اسیطرح رکھ گذرتے ہیں۔ اور پھر عید بھی اسی شوق سے مناتے ہیں۔ ایسے تمام بچوں کو عید مبارک!

آئندہ تمام مولوی صاحبان کو خواہ وہ "مولوی امام مسجد ہوں" خواہ مولوی غیر امام مسجد (یعنی خواہ وہ نماز اجرتاً پڑھتے ہوں خواہ عادتاً) اور تمام مولوی صاحبان کو خواہ وہ دیوبندی ہوں خواہ فرنگی محلی۔ خواہ مقلد ہوں خواہ غیر مقلد۔ خواہ حنفی ہوں خواہ غیر حنفی۔ خواہ چشتی ہوں خواہ غیر چشتی۔ خواہ سی آئی ڈی ہوں۔ خواہ غیر سی آئی ڈی۔ خواہ پکے تنخواہ دار ہوں خواہ صرف وظیفہ خوار خواہ مسجد کے پڑھے ہوں خواہ مدرسہ کے (یعنی خواہ نماز عید پڑھنی پڑھانی آتی ہو خواہ نہ آتی ہو) خواہ ندوی ہوں خواہ غیر ندوی۔ خواہ لکھ پڑھ سکتے ہوں خواہ مطلق ان پڑھ ہوں۔ بوجہ اس کے کہ اُنہیں روزے کھاتے ہم نے کبھی نہیں دیکھا اور بوجہ اس کے کہ وہ تمام تر ڈاڑھی دار ہوتے ہیں (خواہ وہ ڈاڑھی مختصر ہو خواہ مطول) عید مبارک!

پھر ان تمام واعظ صاحبان کو جو رمضان شریف میں مسجدوں کو منڈیاں سمجھ کر متاع وعظ بیچنے کے لئے شہر بشہر پھرا کرتے ہیں اور ہر وعظ میں بالالتزام یہ بتایا کرتے ہیں کہ اگر کوئی (امیر) آدمی کسی معقول وجہ سے یا کسی غیر معقول وجہ سے روزے نہ رکھ سکے تو وہ فی روزہ کسقدر مال کسی مستحق کو (یعنی خود واعظ صاحب کو) دے۔ نیز ان تمام حافظ صاحبان کو جنہیں تراویحوں میں قرآن سنانے کے لئے کوئی مسجد مل گئی ہو یا جنہیں باوجود تگ و دو کے قرآن سنانے کے لئے کوئی مسجد نہ ملی ہو۔ خواہ قرأت اُن کی بصری ہو خواہ مصری (کیونکہ ہدیہ دونوں کا برابر ہے) عید مبارک!

سب سے بعد (لیکن سچ پوچھئے تو سب سے پہلے) خود ہمیں کہ ہم نے سب کو عید مبارک کہی۔ اور کسی نے ہمیں عید مبارک نہ کہی۔ عید مبارک!

(خاص) **ادیب اے آبادی**

ہاشمی کی یوسف زلیخا اور اردو شہ پارے

از جناب مولانا نجیب اشرف صاحب ندوی ایم اے

جامعہ عثمانیہ کے قیام، انجمن ترقی اردو کے احیاء اور رسالہ اردو (اورنگ آباد) کے اجرا سے اردو زبان کو جہاں دوسرے بہت سے فائدے ہوئے ہیں، وہیں سب سے بڑا اور سب سے زیادہ اہم فائدہ یہ ہوا ہے کہ ان اداروں نے اردو کی مدریجی تاریخ وارتقا کی تحقیق کا ذوق وشوق پیدا کر دیا ہے۔ اور اسکا نتیجہ صرف یہی نہیں ہے کہ پرانے تذکرے، قدیم اردو کے مخطوطے منصۂ شہود پر آرہے ہیں۔ بلکہ یہ کوشش کی جارہی ہے کہ اردو کو صدسالہ بلکہ اگر ہوسکے تو چہار صدسالہ تاریخ کو مسلسل و مربوط طریقہ سے مرتب کیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی چونکہ اردو نے گذشتہ ربع صدی میں خاص اہمیت، وسعت اور عزت حاصل کر لی ہے۔ اس لئے ایسے مصنفین کی ایک بڑی جماعت اس کوشش میں مصروف نظر آتی ہے کہ وہ جس صورت سے بھی ہو اپنے اپنے صوبہ کو اردو کا اصلی وطن نہیں تو کم از کم اس کی ارتقا کا مرکز ہی ثابت کرے اور اس صوبجاتی تعصب و تبختر نے جہاں ذہین محققین سے بہت کچھ فنیتی چیزیں لکھوالی ہیں، وہیں غلط بیانی یا کم از کم مغالطہ سے کام لے کر ہر مصنف نے دوسرے بہت سے صوبوں کے مصنفین کو اپنانے کی کوشش کی ہے۔ اردوئے قدیم، دکن میں اردو، بہار میں اردو پنجاب میں اردو وغیرہ اسی قسم کے سلسلہ کی مختلف کڑیاں ہیں۔ لیکن حال ہی میں ان کے علاوہ ایک اور کتاب اردو شہ پارے کے نام سے حیدرآباد سے شایع ہوئی ہے +

اس کے مرتب اس جدید جامعہ کے فارغ التحصیل اور جامعہ لندن کے سند یافتہ ڈاکٹر، جناب سید محی الدین قادری صاحب زور ایم اے پی ایچ ڈی ہیں۔ جناب زور اپنی دوسری تصانیف اور تنقیدی مقالوں کی وجہ سے اردو داں طبقہ میں محتاج تعارف نہیں ہیں۔ ان کی یہ کتاب جو اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے ایک بڑی حد تک صوبجاتی تعصب سے پاک ہے اور وسعت خیال اور آزادی رائے سے کام لے کر انہوں نے بہت زیادہ غیر جانبدارانہ مرتبہ قایم رکھا ہے لیکن پھر بھی ان کے صفحات کے مطالعہ کرنے والے کو یہ صاف نظر آتا ہے کہ ان کی بھی یہ کوشش ہے کہ جہاں تک ہوسکے تمام قدیم مصنفین کو دکنی ثابت کیا جائے۔ اور اسی لئے وہ ان تصانیف کے متعلق جو اردو کی گجراتی شکل میں لکھی گئیں اور جن کی ایک اچھی تعداد موجود ہے۔ یہ توضیح کرتے ہیں کہ دکنیوں نے نوآمدہ گجراتیوں کے اثرات کے ماتحت اپنی دکنی زبان کو بھی گوجری۔ گوجری، گجری یا گجراتی لکھنا شروع کر دیا تھا۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ گوجری تصانیف ان لوگوں کی ہیں۔ جو گجرات سے کسی نہ کسی وجہ سے دکن گئے یا ان کی تصانیف دکن تک پہنچیں۔ اور یہ لفظ ان کے ہاں اس وقت تک جاری رہا جبتک ان کی زبان دکنی نہ بن گئی۔ دوسرے فاضل ڈاکٹر صاحب نے کہیں بھی اس بات کا حوالہ نہیں دیا ہے اور نہ تذکرہ کیا ہے کہ وہ کون کون سی تصانیف ہیں جن کے مصنفین نے اپنی زبان کے لئے گجری وغیرہ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ مثلاً اتقن نے اپنی مثنوی یوسف زلیخا کو گجری زبان میں لکھا ہے لیکن فاضل مرتب نے نہ صرف یہ کہ اس کا ذکر نہیں کیا ہے بلکہ اس غریب کی تقریباً ... ۴ اشعار کی طویل مثنوی سے ایک سطر بھی نہیں دی گئی۔ یہی حال ان تمام دوسرے مصنفین کی کتابوں کا بھی ہے جن کو فاضل مرتب نے گجراتی تسلیم کیا ہے۔ مثلاً شیخ خوب، علی حیو گام وطنی وغیرہ وغیرہ، لیکن چونکہ یہاں پر ہم کو اس تصنیف کے اس پہلو پر بحث کرنا مقصود نہیں ہے۔ اس لئے ہم اس کو نظر انداز کرتے ہیں اور انشاء اللہ کسی قریبی صحبت میں اس کے متعلق عرض کریں گے۔ یہاں پر ہم اردو شہ پارے کے مرتب کو ہاشمی کی تصانیف کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں +

خوش قسمتی سے مجھے اپنے ایک دوست جناب سید عبداللہ برہان الدین صاحب بی۔ اے کے کتب خانہ میں متعدد گجراتی مصنفوں کی اردو یا گرجری، گوجری یا گجری تصانیف کے قلمی نسخوں کے ساتھ ہاشمی کی یوسف وزلیخا کا ایک قدیم نامکمل قلمی نسخہ بھی مل گیا ہے۔ اور وہ ہاشمی کی ذات، اس کے عقاید اور اس کی تصنیف پر ایک بڑی حد تک روشنی ڈالتا ہے۔ ہمارے فاضل مرتب اردو شہ پارے نے

بجز اُس مختصر ریختی دیوانوں کے جو جناب آغا حیدر حسن کے ذاتی کتب خانہ کی زینت ہے۔ اس کی کسی دوسری کتاب کا مطالعہ نہیں کیا ہے۔ حالانکہ ان کا خود بیان ہے کہ

"معلوم ہوا کہ آغا حیدر حسن صاحب دہلوی کے کتب خانہ میں بھی اِن کا مخطوطہ محفوظ ہے"[1]۔

پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک محقق جو حیدرآباد میں رہتا ہے اُسی شہر اُن ہی آغا حیدر حسن صاحب کے کتب خانہ کی ہاشمی کی ایک کتاب کا نہ صرف مطالعہ کرتا بلکہ اُس کا انتخاب اپنی کتاب میں درج کرتا ہے۔ اور پھر بھی ہاشمی کی اس اہم ترین تصنیف کی طرف نظر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا! کیا فن تحقیق کا یہ کوئی نیا اصول ہے؟ اگر فاضل مرتب اس تکلیف کو گوارا کر لیتے تو شاید ان کو اس اعتراف کی نوبت نہ آتی کہ

"اس کا (یوسف زلیخا) ایک نسخہ جرمنی کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ لیکن چونکہ راقم کو اس کے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ اس لئے وہ اس کے متعلق تفصیلی حالات پیش کرنے سے مجبور ہے"[2]۔

پس اگر ہم جرمنی اور آغا صاحب کے نسخوں کا وجود تسلیم کر لیں۔ اور اس سے انکار کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ تو ہم کو یہ ماننا پڑیگا کہ یہ اس مثنوی کا تیسرا مخطوطہ ہے۔ اور اس لئے نامکمل ہونے کے باوجود خاص اہمیت رکھتا ہے[3]۔

اس مخطوطہ کو دیکھنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس کے شروع و آخر کے چند ہی اوراق ضائع ہوئے ہیں۔ کیونکہ یہ نامکمل نسخہ ہندوستان کے پرانے مہدی موعود جناب سید محمد جونپوری کی تعریف سے شروع ہوتا ہے۔ اس لئے خیال ہے کہ اس کے پہلے زائد از زائد حمد و نعت اور شاید مناجات ہی کا حصہ ہو۔ اسیطرح آخر میں خاتمہ کا تھوڑا حصہ موجود ہے۔ اور شاید دو چار ہی ورق کم ہوں۔ لیکن یہ اوراق ہاشمی کی ذاتی حالت اور قابلیت کی واقفیت کے لئے بہت اہم ہونگے۔ کیونکہ آخری صفحہ کے آخری چند اشعار وہ ہیں جو ہاشمی کے پیر کی زبان سے اُسکی حالت کو بیان کرنا شروع کرتے ہیں۔ اور ان سے اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ وہ اندھا تھا اس مخطوطہ میں ۱۴۵ اوراق ہیں اور ہر صفحہ پر ۱۷ شعر ہیں۔ لیکن بیچ بیچ میں سرخ روشنائی سے تقریباً ۳۵ سرخیاں بھی لکھی ہوئی ہیں۔ اور ہر سرخی دو سطروں کی ہے۔ اس حساب سے اس مخطوطہ میں ۱۴۵ × ۲ × ۱۷ - ۳۵ × ۲ = ۴۸۶۰ اشعار ہیں۔ ایک قابل لحاظ بات یہ ہے کہ یہ عنوانات اُردو نثر میں ہیں۔ حالانکہ اس عہد کے بہت بعد تک اکثر مثنوی نویس شعرا کا یہ دستور رہا ہے کہ وہ سرخیاں فارسی میں لکھا کرتے تھے۔

جناب زور نے ہاشمی کے حالات میں مندرجہ ذیل چیزیں بتائی ہیں۔ اس کا نام سید میراں تھا۔ سید شاہ ہاشم کا پیرو ہونے کی وجہ سے اُسنے اپنا تخلص ہاشمی رکھا۔ وہ بیجاپور کا باشندہ تھا۔ وہ بالکل اندھا تھا۔ وہ علی عادل شاہ (ثانی) کا درباری شاعر تھا۔ اُس کی تین تصانیف ہیں (۱) ترجمہ احسن القصص (۲) یوسف زلیخا (۳) غزل کا دیوان۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب نے ہاشمی کے ریختی دیوان کا بھی تذکرہ کیا۔ اور اس کا انتخاب دیا ہے۔ ایک مرثیہ کا بھی ذکر ہے[4]۔

مجھے افسوس ہے کہ اس وقت میں ایسی جگہ ہوں جہاں تاریخ دکن و تذکرہ کی کوئی کتاب بھی میرے پاس نہیں ہے۔ اس لئے میں ہاشمی کے متعلق جو کچھ لکھونگا وہ اس کی اس نامکمل مثنوی تک محدود ہوگا۔ البتہ اس کے عقاید کے سلسلہ میں میں نے ریاست پالن پور کی ضخیم تاریخ سے مدد لی ہے کہ اس ریاست کے فرمانروا اور وہاں کی مسلم آبادی کا ایک بااثر حصہ اُسی ملت اور اُنہی عقاید کا پیرو ہے۔

ہاشمی کے اصلی نام کے متعلق اس مخطوطہ سے کچھ پتہ نہیں چلتا۔ البتہ اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اُس کو یہ تخلص اُس کے پیر جناب سید ہاشم نے دیا تھا۔ چنانچہ وہ خود کہتا ہے ؎

سکت کاں ہے اتنی بیاں وار میں ۔۔۔ کروں وصف ہاشم کا اظہار میں
اوسی کیچ گھر کا ہوں میں سر فراز ۔۔۔ اونی ہاشمی مجکوں بولیا نواز

یہ سید ہاشم اُس جماعت سے تعلق رکھتے تھے جو جناب سید محمد جونپوری کو مہدی موعود تسلیم کرتی ہے۔ اور ہاشمی اسی کا پیرو ہے۔

جناب سید محمد جونپوری ۸۴۷ھ میں جونپور میں پیدا ہوئے وہیں تعلیم حاصل کی اور وہیں ولایت کے تمام مدارج طے کئے۔ اس کے بعد گجرات و دکن کی سیاحت کے بعد وہ حج کو گئے اور وہیں اپنے مہدی موعود ہونے کا اعلان کیا۔ اس کے بعد پھر گجرات آئے۔ اور یہاں بھی اپنا اعلان دُہرایا۔ لیکن زمانہ کو مخالف پاکر مختلف مقامات سے ہوتے اور اپنی تعلیم پھیلاتے فرح تک پہنچے اور وہیں اُن کا

[1و2] اردو کے شہ پارے جلد اوّل صفحہ ۲۷۔ [3] یہاں پر یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ فاضل مصنف نے اس کتاب کی ترتیب کے سلسلہ میں یورپ کے مختلف کتب خانوں میں جاکر ان مخطوطات کا مطالعہ کیا ہے۔ لیکن پھر بھی وہ حیدرآباد میں ایک ایسی اہم تصنیف کو نہیں دیکھتا اور اس کی وجہ سے غلط فہمی کا شکار ہوتا ہے۔

[4] اردو شہ پارے صفحہ ۲۰۱-۷۔

انتقال ہوا[۱]۔ اُن کے پانچ خلفا تھے ۔ اور ہاشمی نے اپنی مثنوی میں ان سب کا حال لکھا ہے[۲]

یو خاتم ولی رب نے پیدا کیا   دنیاں میں تو ساری بڑائی دیا
یو مہدی میں ہے سب پیمبر کا نشاں   یو موعود رب کا وہی ہے نشاں
نشانیاں تو کینا اچھی اس میں سب   یو سید محمد ہے جس کا لقب
نبی اور مہدی کو ایکچہ پچھان   یو یک ذات دو کیپ وناہے جان
نبوت ولائت کا یوں یک ہے بھید   کہ جوں ایک موتی کے تئیں دو ہیں چھید
فرض جس کی تصدیق ہے کر کہ مان   یقین کفر انکار ہے اُس کا جان
یو مہدی خلیفہ ہے رحمان کا   بیاں جن کیا جگ پہ فرقان کا
زمیں ہوا زمانہ کرے یوں ندا   ہے مہدی کا خاصا' دیکھا نا خدا
تو آیا ہے مہدی اسی کام کوں   دیکھانے خدا خاص ہور عام کو
او کینا دیکھادے خدا بے نقاب   خدا بخش مہدی ہے جس کا خطاب

ولائت نگر کا یو سلطان سانچ   تو اصحاب یعنی وزیراں ہیں پانچ

(۱) میراں سید محمود فرزند ہے   جسے سب نے مہدیچہ ثانی کہے
او صدیق ہے ہور بلند جس کا شان   جس نے سب سوں لیایا ہے اوّل ایمان

---

(۲) دوجے پر ہوا ہے سو خوند میر نام   صفت قاتلوا ہوا قتیلوا تمام
او صدیق کینا اچھے نام دار   کہ آیا ہے جس پر ولائت کا بھار

---

(۳) تیجا یار سو شاہ نعمت رہے   براعت کی متقراض مہدی کہے
بلند کیوں نہ اس کا اچھے کا سو تہاٹوں   پر نعمت رکھیا جس کا مہدی نے ناتو

---

(۴) دوسے یار جو تھا ہے شاہ نظام   خدا کن تھیں ملی ہے زمیں جس مدام

---

(۵) پنجم شاہ دلاور ہے مہدی کا یار   لدنی رہے علم جس دن منجھار

اس کے بعد ہاشمی نے اپنے پیر شاہ ہاشم کی تعریف کی ہے اور پھر لکھا ہے کہ اُس نے یہ مثنوی اُن ہی کے حکم سے لکھی ہے ۔ ہاشمی کے اوّلین بیان کو پیش نظر رکھ کر ہم کو دو میں سے ایک نتیجہ پر پہنچنا پڑتا ہے ۔ اُس کا بیان ہے کہ ہاشمی کے تخلص سے اُسکو اُس کے پیر نے نوازا تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر ایسا ہے تو کیا اس بیعت سے پہلے وہ شاعری کرتا تھا۔ اگر کرتا تھا۔ تو اس کا کیا تخلص تھا اور اس کا وہ کلام کس نام سے پایا جاتا ہے ۔ دوسرے یہ کہ چونکہ اُس نے یہ مثنوی پیر کے حکم سے لکھی ہے ۔ اور انکو سنایا بھی ہے تو ایسی صورت میں درازی عمر کی حیثیت سے مرید سے زیادہ پیر قابلِ لحاظ ہیں بہرحال ان چیزوں کو نظر انداز کر کے یہاں پر ہم اُس غلطی کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں جو مرتب اردو شہ پارے سے صرف اس لئے ہوئی ہے کہ اُنہوں نے اصل کتاب کا مطالعہ کرنے کی بجائے دوسروں کے بیانات پر بھروسہ کیا ہے۔ اُن کا بیان ہے :-

" ہاشمی پرنویس تھا کیونکہ اس زمانہ میں بھی اُس کی تین ضخیم کتابوں کے متعلق پتہ چلتا ہے[۳]"۔

یہ تین ضخیم کتابیں یہ ہیں :-

(۱) ترجمہ احسن القصص (۲) یوسف زلیخا (۳) دیوان اُلانق مرتب کا بیان ہے کہ اوّل الذکر و آخر الذکر کتابوں کے مخطوطے موجود ہیں ۔ لیکن بساتین اور احوال سلاطین کے مصنفین نے ترجمہ احسن القصص کا ذکر کیا ہے ۔ اور دیوان کا ذکر صرف بساتین نے کیا اور اسی کی رائے پر بھروسہ کر کے فاضل مرتب نے بھی اپنی رائے ہاشمی کے تغزل کے متعلق دیدی ہے ۔ رہا ترجمہ احسن القصص کا حال تو میرا خیال ہے کہ اس نادر مثنوی یوسف زلیخا کو بساتین کے مصنف نے بھی نہیں دیکھا تھا۔ ورنہ وہ ایسی غلطی نہ کرتا ۔ اور نہ دوسروں کو اس میں مبتلا ہونے کا سامان کر جاتا ۔

واقعہ یہ ہے کہ سورۂ یوسف کو خود کلام مجید میں " احسن القصص " کے نام سے یاد کیا گیا ہے ۔ اور اسی داستان یوسفؑ کو یہ لقب حاصل ہے، ہاشمی نے اپنے پیر کے حکم سے حضرت یوسفؑ کے قصّہ کو منظوم کیا اور شاید اس کا نام بھی احسن القصص یا اسکا ترجمہ رکھا ہو۔ بعد میں لوگوں نے بلا دیکھے دو نام سنکر دو کتابیں تسلیم کرلیں اور بساتین کے مصنف نے ذہانت سے کام لے کر یہ توضیح بھی کردی کہ روضۃ الشہدا کا دوسرا نام احسن القصص ہے ۔ اب ہم اپنے دعوئی کے ثبوت میں خود ہاشمی کا بیان پیش کرتے ہیں[۴]

ملک اکہ ہاشم کیا یوں ندا   کہ اے ہاشمی تجھ نواز یا خدا
ابد لگ رہے گا یو نیکی کا ناتو   تو مشہور ہوئے عالم میں تہا تو تہا نو
بخیلی نکو کر توں داتا رہو   کہ حاتم کے نمنے تو اظہار ہو
تو ٹا گنج یعنی زبان کھول توں   عجب یک قصّہ عشق کا بول توں
اچھی کا خبر جس کا فرقان میں   کیا جس کی تعریف سبحان نے
کہ یو قصّہ توں بول عرفان سوں   کتا ہوں کہ اب دہلکے من کان سوں

[۱] تاریخ پالن پور حصہ اوّل صفحہ ۴۰۸ - ۶۶۶ ۔ [۲] ہم نے طوالت کے خیال سے مسلسل اشعار نقل نہیں کئے ہیں بلکہ انتخاب دیا ہے ۔ [۳] یہاں ایک بات قابل ذکر ہے کہ ضمیمہ میں فاضل مرتب نے اُس دیوان بچھی کا جس کا انہوں نے انتخاب دیا ہے مصنف کا کوئی ذکر نہیں کیا صفحہ ۵۴۴

کہیا احسن القصہ جس کوں خدا کتا ہوں سو میں اس کا تجھ ابتدا

اس مضمون لکھنے سے ہمارا مقصد صرف اسی غلط فہمی کو دور کرنا تھا۔ کیونکہ ایسی مستند کتاب کے دامن پر یہ داغ بہت بُرا معلوم ہوتا ہے۔ اگر فرصت نصیب ہوئی تو نفس مثنوی اور اس کے سلسلہ میں ہاشمی کے حالات۔ اُسکی شاعری اُس کے زور بیان، اُس کی وسعت نظر وغیرہ پر کبھی اظہار خیال کیا جائے گا۔ البتہ یہاں پر اتنا بتا دینا چاہتے ہیں کہ مثنوی کی اندرونی شہادت ہم کو اس نتیجہ تک پہنچنے پر مجبور کرتی ہے کہ یہ کتاب دکنی اردو سے زیادہ گجراتی اردو کے قریب تر ہے۔

نجیب اشرف

مسلمانوں کی سب سے پہلی بیمہ کمپنی

۱۸ سال سے ۵۵ سال تک ہر مرد و عورت ممبر بن سکتا ہے۔ شرائط بالکل آسان ہیں۔ باقاعدہ اقساط کوئی نہیں دینی پڑتیں۔ بڑھاپے کی مصیبت، بیٹے بیٹی کی شادی۔ اولاد کی تعلیم سے بیفکر ہو جائیے۔ یعنی ہماری سب سے آسان مفت بیمہ کی سکیم کے ممبر بنجائیں۔ قواعد و فارم داخلہ ایک کارڈ لکھ کر مفت طلب کریں +

ضرورت ہے۔ کمپنی کو ہر شہر۔ ضلع۔ قصبہ میں دیانتدار بارسوخ ایجنٹوں کی جلد ضرورت ہے۔ کمیشن معقول دیا جاتا ہے۔ صرف ایسے اصحاب درخواست کریں۔ جو بارسوخ۔ محنتی اور دیانتدار ہوں۔ تھوڑی آمدنی والے اور بے روزگاروں کے لئے موقع ہے۔ ایجنسی فارم ۲ کے ٹکٹ آنے پر روانہ ہوگا +

پتہ دی بغداد پراویڈنٹ انشورنس کمپنی لمیٹڈ۔ لودھیانہ۔ (اپر انڈیا)

ایجنسی آفس:۔ بھوپال۔ لاہور۔ سرینگر۔ پونا۔ ناگپور۔ تھازی۔ برما۔ کراچی۔ ایٹہ۔ فیروزپور۔ چکلادہ۔ کشمیر +

کامل دائی یا لیڈی ڈاکٹر باتصویر

اس فن حکمت کی نادرو نایاب کتاب میں عورتوں کی تمام پوشیدہ بیماریوں کا علاج مع نسخوں کے درج ہے۔ دائی جنائی کا مفصل کام باتصویر دیا گیا ہے۔ دوسرا ایڈیشن ختم ہونے کو ہے۔ جلد طلب کریں +

اس کتاب کا ہر گھر میں ہونا اور ہر مرد و عورت۔ حکیم۔ ڈاکٹر اور دائی کو مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ آجتک ہندوستان بھر میں ایسی مکمل کتاب اردو میں شایع نہیں ہوئی۔ آج ہی منگوالیں۔ لکھائی چھپائی عمدہ۔ ضخامت ۲۰۴ صفحات۔ جلد بندھی ہوئی۔ قیمت فی جلد ۱۲؎۔ محصولڈاک ۶؍ +

پتہ:۔ منیجر احسان اینڈ کمپنی بستی گوٹھی ۱۲ لودھیانہ (اپر انڈیا)

عمل ہمزاد کا مکمل اصلی عمل

اگر حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہماری کتاب عامل کامل خریدیں۔ اس نادرو نایاب کتاب میں ہر مقصد، ہر خواہش اور ہر دلی مطلب کے پورا کرنے والے نقش، تعویذات منتر۔ جنتر۔ سحر۔ طلسمات اور معجزے ایسے ایسے لاجواب درج ہیں کہ جسے چاہو اپنا بنالو۔ روحانی دنیا کے عقیدتمند اور راسخ الاعتقاد فرزندوں کے لئے یہ کتاب واقعی لاجواب تحفہ ہے۔ ہاتھ کی لکیروں سے حال دیکھنا۔ فالنامہ شاہ مرداں و فالنامہ سلیمانی سے سوال کا جواب دریافت کرنا۔ خواب کی تعبیر دیکھنا اور ہر قسم کے تعویذات درج ہیں۔ قیمت مجلد عہ۔ محصولڈاک ۶؍ جلد طلب کریں۔ ناپسند ہو تو واپس کردیں +

پتہ:۔ صوفی بکڈپو نمبر ۹ لدھیانہ

سیرِ کشمیر

کشمیر جنتِ نظیر

کبھی صرف سلاطین کی سیر گاہ۔ آرام گاہ اور شکار گاہ تھی۔ مگر آج صلائے عام ہے کہ ہر اہل دل و ہر اہل ذوق آئے۔ اور اس فردوس ارضی کی سیر و تفریح سے بہرہ اندوز ہو۔

کشمیر میں

جا بجا گلپوش وادیوں کی بہاریں۔ نظارے۔ قدم قدم پر شفاف چشمے۔ اور گوھر بار آبشاریں۔ پھولوں میں بسی ہوئی مشکبار و عطر بیز ہوائیں۔ لالہ زاروں کی گلکار و جلوہ ریز فضائیں ہر باغ و راغ قدرت کے معصوم و دلاویز کرشمے۔ ڈل (جھیل) کی آئینہ پوش سطح پر عروسی کشتیوں کی حسین قطاروں کا لطف اُٹھائیے۔

کشمیر کے

آبشاروں کے شیریں نغمے آسمانی الہام کی طرح دل کو نور و سرور سے معمور کر دیتے ہیں۔ ان آبشاروں میں پانی کی بجائے آبِ حیات مستِ خرام ہے۔ کشمیر کے چشموں کا پانی دلوں سے کدورت اور دامنِ زندگی سے جسمانی کوفت کے داغ دھو ڈالتا ہے۔ زندگی میں ایک بار کشمیر ضرور آئیے۔ اور اگر ایک دفعہ اس فردوس صفت وادی کو دیکھ چکے ہیں۔ تو دوبارہ دیکھنے کی آرزو پوری کیجئے۔

آپ جب کشمیر دیکھیں جتنی بار دیکھیں۔ ہر بار کشمیر میں زندگی و زندہ دلی اور تفریح و تندرستی کا نیا لطف اُٹھائیں گے۔

سفر کے متعلق تفصیل۔ کتب اور دیگر معلومات پبلسٹی آفیسر نارتھ ویسٹرن ریلوے۔ لاہور سے طلب فرمائیں۔

ہماری کہانی دوسرے کی زبانی

(از قلم معجز رقم جناب ایم۔ شمیم صاحب سلہوری)

مبارک ہیں وہ ہستیاں جو رفاہِ عام کو اپنا فرض خاص سمجھتی ہیں اور روز و شب اُن کی خدمات میں مصروف و منہمک رہتی ہیں۔ فی الحال ہمارے شہر کانپور میں مالکان مطبع مجیدی جس اولوالعزمی سے علم و ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ اُس کو دیکھ کر بعض اوقات تعجب ہوتا ہے کہ ایسے زمانۂ کساد بازاری میں ان حضرات کو کونسا فرض لاحق ہو گیا ہے کہ زبان اردو کی خدمت میں اپنا ہزارہا روپیہ بے دریغ صرف کر رہے ہیں۔ میں اور کتب علیہ کو نظر انداز کر کے صرف صنف لغات کو ناظرین کے سامنے پیش کرتا ہوں ٭

لغات سعیدی

یہ وہ چیز ہے جس کی ایک عرصہ سے پبلک کو ضرورت تھی۔ یہ تمام لغات قدیمہ و جدیدہ عربی، فارسی، ترکی، لاطینی، معرب و مفرس کا ایک بے بہا خزانہ ہے۔ اس کے محاسن کو بالتفصیل پیش کرنا باعث طوالت ہے اسکو دیکھ کر ہر شخص خود ہی فیصلہ کر سکیگا۔ کہ یہ کتاب تمام مروجہ کتب لغات سے ایک بین فوق رکھتی ہے۔ یہ وہ کتاب ہے جو صاحب علم کو ہر وقت امداد پہنچا سکتی ہے۔ اور اپنے اندر ان تمام الفاظ کا مجموعہ رکھتی ہے جو فی زمانہ علم ادب میں رائج ہیں۔ آجکل کے نوجوان ادیب، مضمون نگار، طلبا، مدرسین مدارس، اور مترجم صاحبان کے لئے یہ بیش قیمت تحفہ ہے۔ ضرور خرید یئے۔ میری نا چیز رائے ہی کیا ہے۔ ملک کے مشہور اخبارات انقلاب لاہور، جمہور کلکتہ، و معزز رسایل نگار لکھنؤ، زمانہ کانپور۔ الناظر لکھنؤ اور مشاہیر عظام نے اسکی بابت جو کچھ اظہار خیال فرمایا ہے وہ اسکی خوبیوں کی ایک روشن دلیل ہے۔ حجم ۶۲۸ صفحات تقطیع فلسکیپ۔ لکھائی چھپائی دیدہ زیب ٹائیٹل رنگین قیمت صرف للعہ

منیر اللغات فارسی

یہ لغت ہے کہ تمام دشواریوں کا تماحصؔ میں نے اسکو تمام و کمال دیکھنے کے بعد جو رائے قایم کی ہے وہ یہ ہے کہ یہ کتاب اپنی نوعیت میں نرالی چیز ہے۔ اور اردو لغات میں اس سے قبل کوئی چیز ایسی شایع نہیں ہوئی۔ اسمیں فارسی الفاظ بجائے لغات کے لکھکر اُنکے مرادفت تمام اردو محاورات مع اسناد اساتذان بطور معنی بیان کئے گئے ہیں۔ تاکہ ہر شخص فارسی و اردو کے ہم معنی محاورات کا مطلب سمجھ سکے اور یہ معلوم ہو جائے۔ کہ اردو میں فلاں فلاں محاورہ کا محل صرف کیا ہے۔ واللہ یہ لغت ہے بالغت کا قانون نامہ، فارسی کی عبارت لکھنے یا اردو کی۔ دونوں کیلئے یکساں مفید اور کار آمد ہے جس محاورے کو استعمال کرنا ہو مع سند کے دیکھ لیجئے۔ کیا ایسی مفید کتاب کا مطالعہ کرنیکے بعد یہ ممکن ہے کہ انسان کو اردو محاورات پر کامل عبور نہ حاصل ہو جائے۔ کیا اس سے زیادہ تفصیل اردو زبان کی کوئی لغت پیش کر سکتا ہے۔ اور کر سکتا ہے تو اسقدر حجم ۳۲۰ صفحات تقطیع ۲۰×۲۶/۸ ٹائیٹل رنگین قیمت صرف تین روپے (عہ)

منیر اللغات اردو

یہ لغت بھی بوجہ اپنے طرز و جامع اور مختصر ہونے کے تمام لغات مروجہ پر ایک فوقیت رکھتی ہے۔ اسمیں اُنہیں الفاظ و محاورات کا ذکر ہے جو قطعی طور پر اپنے کئی کئی معنی کے ساتھ اردو میں رائج ہیں اور دوسری زبان سے کوئی تعلق نہیں رکھتے ہیں۔ اس کے شامل دو اور رسالے بھی ہیں۔ ایک خاص اسماء صفات کا خزینہ ہے اور دوسرا اقوال و امثال فارسی و اردو کا آئینہ ہے میرے نزدیک یہ کتاب بیحد قابل قدر ہے اور اسکا اسکولوں میں رائج کر دینا بیحد مفید و نتیجہ خیز ہوگا۔ ان دونوں کتابوں کی بابت حضرت لسان القوم مولانا صفی صاحب لکھنوی اور نیز دیگر مشاہیر عظام نے ان کو پسند فرما کر جو تحریر فرمایا ہے وہ سچی رائے اور حقیقی تعریف ہے جو ہر کتاب کے ساتھ شامل ہے۔ حجم ۲۵۶ صفحات تقطیع ۲۰×۲۶/۸ ٹائیٹل رنگین۔ قیمت صرف دو روپیہ عہ

(۱) محاورات نسواں و بیگماتی زبان (۲) بازاری زبان و اصلاحات پیشہ وراں (۳) غلط العوام و متروک الکلام (۴) منیر البیان فی تحقیق اللسان ٭

یہ چاروں رسالے بھی اپنی اپنی نوعیت میں ایک جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک اگر لکھنؤ و دہلی کے محلات کے محاورات کا گنجینہ ہے تو دوسرا بازاری اور پیشہ وروں، دلالوں، جواریوں وغیرہ کے مخصوص اصطلاحات کا مجموعہ۔ خاصکر تیسرا رسالہ غلط العوام و مفید انام ہے۔ جس کی موجودگی سے آپ الفاظ اردو و فارسی صحیح و فصیح بولنا اور لکھنا سیکھ جائیں گے اور دوسروں کی انگشت نمائی سے اپنے کو بچا لینگے۔ چوتھا رسالہ منیر البیان یہ زبان کی تحقیق و تدقیق میں بے اور بے مثل ہے۔ اسمیں دہلی اور لکھنؤ کی زبان کا فرق بھی پورے طور سے دکھلایا گیا ہے ٭

ان چاروں رسالوں کی قیمت یکساں اور تقطیع ۱۸×۲۲/۱۶ ۔ یعنی قیمت فی رسالہ ۸/

ایم شمیم

جملہ فرمائشیں بنام حاجی محمد سعید تاجر کتب و مالک مطبع مجیدی شہر کانپور آنی چاہئیں

المشتہر منیجر مطبع مجیدی۔ کانپور

اُٹھ مرے کالی کملی والے

(از حضرت میرزا یگانہ لکھنوی)

اے آئینۂ انوار ازل   اے جلوہ گہ ہر حسن عمل
ہے دیر سے ٹھنڈا دل کا کنول   دیدار دکھا پیرنگ سے نکل
میرے اندھیرے گھر کے اجالے
اُٹھ مرے کالی کملی والے

جان جہاں مقصود دو عالم   فرش نشیں اور عرش کا محرم
اشرف انساں۔ افضل آدم   خاک کا پتلا۔ نور مجسم
میرے اندھیرے گھر کے اُجالے
اُٹھ مرے کالی کملی والے

شمع جمال کے پروانے   تیری طلب میں دیوانے
سنتے ہیں کیا کیا افسانے   کس روپ میں تو ہے خدا جانے
میرے اندھیرے گھر کے اُجالے
اُٹھ مرے کالی کملی والے

آشفتہ بیانی سن تو سہی   کچھ درد نہانی سن تو سہی
ہاں میری زبانی سن تو سہی   یہ رام کہانی سن تو سہی
میرے اندھیرے گھر کے اُجالے

دیوانہ ہوں لیکن مست ولا   گم گشتۂ منزل ہم و نکا
کچھ دھیان نہ کر جو ہوا سو ہوا   گمراہ کو شمع جمال دکھا
میرے اندھیرے گھر کے اُجالے
اُٹھ مرے کالی کملی والے

روشن کردے چراغ امید   مار نہ ڈالے حسرت دید
جلوہ ترا سو عید کی عید   دید کوئی جس کی نہ شنید
میرے اندھیرے گھر کے اُجالے
اُٹھ مرے کالی کملی والے

یگانہ

(خاص)

فوجی کارنامہ

(ڈرامہ)

از جناب منشی کنھیالال صاحب ایم۔اے۔ ایل۔ ایل۔بی۔ ایڈووکیٹ۔ ایڈیٹر "چاند" الہ آباد

منظر [مختصر مکان کا ایک چھوٹا سا کمرہ ہے۔ آگ جل رہی ہے اور کھانا پک رہا ہے۔ آتشدان کے اوپر ایک فوجی آدمی کی ایک بھدی تصویر لٹک رہی ہے۔ ایک طرف اخبار کا ایک کٹ ہوا ٹکڑا اور ایک تمغہ فریم کیا ہوا آدمی کے پاس ٹنگا ہوا ہے۔ ایک چمکدار لوہے کا چولھا وسط میز پر رکھا ہوا ہے۔ کھڑکی میں ایک چھوٹی میز پر بائبل ہے۔ لکڑی کی گدے دار آرام کرسی رکھی ہے]

جون ۱۸۸۱

پردہ اٹھتا ہے اور خالی کمرہ نظر آتا ہے۔ دروازہ کھلتا ہے اور نورہ بریوسٹر ایک دیہاتی لڑکی اپنا اسباب لئے داخل ہوتی ہے اور وحشت زدہ نظر چاروں طرف ڈالتی ہے۔ اس کے بعد دروازہ بند کر دیتی ہے۔ ہنکنڈی ایک چھوٹے صندوق پر اور ہیٹ اور کوٹ اتار کر بائیں جانب یعنی تختہ پر رکھ دیتی ہے۔ ہنکنڈی پر سے اوپر کا کپڑا اٹھاتی ہے۔ اور داہنے جانب کرسی پر رکھدیتی ہے +

نورہ ۔ یہ چچا گرگیوری کی تصویر ہے (آتشدان کے پاس جاتی ہے) آخر بات کیا۔ یہ بالکل آتشدان کے اوپر کیوں لگائی گئی ہے۔ یہ تو بالکل ویسی ہی ہے جیسی ایک ہمارے گھر پر موجود ہے۔ اچھا اسی کے پاس تمغہ بھی لٹک رہا ہے۔ آہ کتنی حیرت کی بات ہے کہ سارے گھر کا انتظام میرے ہی ہاتھ میں ہوگا۔ اب دوسری جگہ شادی کرنے کی ضرورت ہی کیا۔ میرا خیال ہے چچا ابھی تک نہیں آئے۔ میں نے سنا ہے کہ وہ دس بجے سے پہلے نہیں آتے۔ اوہو یہ تو بڑا اچھا ہوا کہ خادمہ جانے سے پہلے آگ روشن کر کے گئی۔ اچھا دیکھ لینا چاہئے کہ چچا کے آنے پر سب چیزیں تیار ملینگی یا نہیں۔ مجھے دیکھ کر ان کو سخت حیرت ہوگی۔ میری آمد کے متعلق میری ماں کا خط تو ان کو ضرور ہی مل گیا ہوگا۔ لیکن ان کو اس کا خیال و گمان بھی نہ ہوگا کہ میں اسقدر جلد آجاؤنگی۔ (بڑی میز کے داہنی طرف) تعجب ہے دودھ کیوں نیلا نظر آتا ہے (بڑی میز کے پیچھے الماری پر) اوہ دو کوڑی کا مکھن بالکل واہیات۔ بڑا اچھا ہوا کہ میں مکھن اپنے ساتھ لیتی آئی (وہ پلیٹ سے مکھن کی گولی اٹھاتی اور ہنکنڈی میں رکھدیتی ہے۔ اور مکھن کی گولی ہنکنڈی سے نکالتی ہے اور پلیٹ میں رکھدیتی ہے) اچھا اب گوشت کو تو دیکھوں۔ اوہ نہ بہت خراب۔ کہاں ہمارے یہاں کا گوشت اور کہاں یہ۔ توبہ توبہ (گوشت کے پارچے کڑاہی میں رکھتی ہے اور کڑاہی کو آگ پر رکھتی ہے۔ (دیگچی کو دیکھتے ہوئے) اگر پانی گرم ہوگیا ہو تو میں چائے تیار کرلوں۔ میں اس میں پانی تو ابھی ٹھنڈا ہی ہے۔ خیر کوئی ہرج نہیں میں ابھی گرم کرتی ہوں (آگ پر چڑھی ہوئی دیگچی کا پانی ایک دوسرے برتن میں انڈیلتی ہے اور برتن کو میز پر رکھدیتی ہے) پیارے بڈھے چچا۔ (تصویر کی طرف دیکھ کر) وہ کتنا بہادر اور جری نظر آتا ہے۔ بیشک ان کو بہت ہی زیادہ دلیر ہونا چاہئے تھا۔ جو اس کے خلاف لڑنے آئے تھے۔ مجھے امید ہے کہ میں اس کو بہت آرام پہنچاؤنگی۔ اور وہ مجھ سے بہت خوش رہے گا۔ (دستک کی آواز آتی ہے) آہ پیارے! دستک! تعجب ہے کہ یہ کون ہے (پھر دستک کی آواز آتی ہے) مجھے دیکھنا چاہئے آخر ہے کون (دروازہ کھولتی ہے)

[سرجنٹ میکڈانلڈ داخل ہوتا ہے]

سرجنٹ ۔ (سلام کر کے) میں تکلیف دینے کی معافی چاہتا ہوں مس۔ کیا کارپورل گرگیوری بریوسٹر یہیں رہتے ہیں؟

نورہ ۔ (وحشت زدہ ہوکر) جی ہاں +

سرجنٹ ۔ وہی نا جو اسکاٹ گارڈ میں تھے؟

نورہ - جی ہاں +

سرجنٹ - اور جو واٹرلو کی جنگ میں شریک رہے ؟

نورہ - جی ہاں وہی +

سرجنٹ - میں اُن سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں +

نورہ - ابھی تک وہ نیچے نہیں تشریف لائے +

سرجنٹ - اچھا تو میں واپسی میں ملاقات کرونگا - ذرا ایک ضروری کام ہے ۔ گھنٹے دو گھنٹے میں واپس ہونگا ۔

نورہ - بہتر ہے (باہر نکلکر) میں اُن سے کیا نام بتاؤں کہ کون ملنے آیا تھا ؟ (سرجنٹ واپس آتا ہے اور اپنی بندوق کے بائیں جانب کے تختے پر رکھ دیتا ہے)

سرجنٹ - میرا نام ہے میکڈانلڈ - توپخانہ کا سرجنٹ میکڈانلڈ - لیکن مس مجھ کو امید ہے کہ تم میرے اظہار خیال کو معاف کروگی - بندوقچیوں کی بارک میں گفتگو رہی تھی کہ بڈھے جنٹلمین کے آرام و آسایش کا پورا خیال نہیں رکھا جاتا لیکن اب میں دیکھتا ہوں کہ ساری باتیں لغو تھیں کیونکہ اب اس سے زیادہ اور کیا کیا جا سکتا ہے +

نورہ - لیکن میں ابھی ابھی چلی آ رہی ہوں - ہم لوگوں کو جب معلوم ہوا کہ خادمہ ٹھیک انتظام نہیں کرتی ہے تو میرے والد نے مجھکو یہاں بھیجدیا کہ جس طرح مجھ سے ہو سکے اُن کے آرام میں فرق نہ آنے دوں +

سرجنٹ - بیشک اب ان کو خود ہی فرق معلوم ہوگا +

نورہ - (دوڑ دھوپ کرتے اور چائے کو برتن میں رکھتے ہوئے ۔ دو چچا کے لئے اور ایک برتن کے لئے (سرجنٹ سے) ہم لوگوں کو چچا گریگوری پر بہت فخر ہے (سماور کو آگ پر رکھتی ہے اور اُس میں دیگچی سے پانی بھرتی ہے)

سرجنٹ - اپنی جوانی میں وہ بہت شکیل آدمی تھا - اب اُس کے ہم عمروں میں کوئی باقی نہیں رہا - جو نپولین بوناپارٹ کے خلاف جنگ میں شریک تھے +

نورہ - دیکھو اُس کا تمغہ تصویر کے پاس ہی لٹک رہا ہے +

سرجنٹ - (اُس کے بعد) لیکن یہ تمغہ کے علاوہ اور دوسری کیا چیز ہے ؟

نورہ - (انگوٹھے کے بل کھڑی ہو کر اور گردن اُٹھا کر) یہ تو اخبار کا ایک ٹکڑا ہے جس میں چچاجان کے حالات درج ہیں (فریم کو اُٹھا لاتی ہے)

سرجنٹ - آہا یہ تو ایک پُرانے کاغذ کا ٹکڑا ہے - کونے پر زرد روشنائی سے تاریخ اگست ۱۸۱۵ء بھی تحریر ہے +

نورہ - (تمغہ اُتار لیتی ہے) اس میں تو بہت باریک حروف ہیں +

سرجنٹ - (میز کے سامنے) لاؤ میں پڑھ کر سنا دوں +

نورہ - عنایت ہے آپ کی +

سرجنٹ (گلا صاف کرکے) "ایک بہادرانہ کام" یہ اوپر سرے پر تحریر ہے + "بروز سہ شنبہ محافظ فوج کے تیسرے رسالہ کی بارک میں ایک بہت شاندار جلسہ منعقد ہوا اور شہزادہ ریجنٹ کی موجودگی میں یہ امتیازی تمغہ کارپورل بریوسٹر کے نذر کیا گیا۔"

نورہ - (سرجنٹ کے دست راست) یہ چچا کی شان میں ہے !

سرجنٹ "کپتان ہاڈین کے سمینہ فوج کے کارپورل گریگوری کو حال کی جنگ عظیم میں اُنکی بہادری کے امتیاز کے لئے جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ ۱۸ ارجون کی قابل یادگار تاریخ کو تیسرے محافظ فوج کے چار رسالوں نے ہگی مونٹ کے اُس خاص مقام پر قبضہ کر لیا جو جانی مورچہ کے جانب راست واقع تھا - ایسی نازک حالت میں بارود ختم ہوگئی اور کارپورل بریوسٹر سامان حرب کے بچانے کے لئے عقب سے بہت تیزی کے ساتھ روانہ ہوئے کارپورل بریوسٹر کو ہسوڈویژن سے واپسی کے بعد معلوم ہوا کہ فرانسیسی گولا اندازنے جھاڑیاں کاٹ کر آگ لگادی اور راستے میں بارود بچھا کر ناقابل گذر بنادیا ہے - باجہ والوں کے پہلے دستہ پر گولہ باری کی گئی اور اُنکا سردار مارا گیا - دستہ کے بقیہ لوگوں نے اس نظارہ سے خائف ہو کر گھوڑوں کی باگ پھیر دی لیکن کارپورل بریوسٹر کود کر گھوڑے کی زین پر بیٹھ گئے - مقابل والے آدمی کو مار کر گرادیا - اور گاڑی کو شعلوں کے درمیان سے لیکر نکل جانے میں کامیاب ہوئے - خدا بہادر بریوسٹر کو زندہ رکھے"+

سرجنٹ - "اس بہادری کے صلے میں کارپورل بریوسٹر کو ان کے ساتھیوں کی موجودگی میں سلطنت کے سب سے زیادہ عالی مرتبہ شخص کے ہاتھ سے یہ تمغہ عطا کیا گیا"+ (کاغذ کو رکھ دیتا ہے) بیشک یہ فخر کرنے کی چیز ہے - (فریم واپس کرتا ہے اور وہ آتشدان کے پاس رکھدیتی ہے)

نورہ - اور ہم لوگوں کو بھی اس پر بجد فخر ہے +

سرجنٹ - اچھا مس مجھ کو ایک ضروری کام ہے (بندوق لے کر) ورنہ ملاقات کرنے کے لئے ٹھہرتا (دروازے پر)

نورہ - (پیچھے پیچھے جاتی ہے) میرا خیال ہے کہ اب اُن کو آنے میں دیر نہ ہوگی +

سرجنٹ - ممکن ہے وہ میری واپسی تک باہر آجائیں - اچھا مس میں معافی چاہتا ہوں تسلیم - (سرجنٹ جاتا ہے)

نورہ - (دروازہ سے اُس کو دیکھتے ہوئے) آہا کیسا شریف آدمی ہے - میں نے آجتک ایسا آدمی کبھی نہیں دیکھا - مزاج بہت اچھا پایا ہے - کیسے اخلاق سے پیش آیا - چچا کے حالات مجھے پڑھ کر سنانے کی تکلیف اُٹھائی (بائیں جانب آکر) جیسے چچا کی فتحیابی میں کوئی شک نہیں ہے - ویسے ہی اُس کے نیک ہونے میں بھی کلام نہیں

ہو سکتا ۔ اب تو چائے تیار ہو گئی ہو گی (آگ کے پاس جا کر) اب اور ——

کارپورل (باہر ہی سے) میری ۔ میری برداشت +

نورہ ۔ (علیحدہ) یا اللہ رحم کر +

(کارپورل گرگیوری بربوسٹر کمرے میں ٹٹولتا ہوا داخل ہوتا ہے ۔ وہ بہت ہی لاغر اور کمزور ہے ۔ بال سفید ہیں ۔ چہرہ پر جھریاں پڑی ہوئی ہیں ۔ نوذ ہاتھ باندھے ہوئے خوفزدہ ہو کر پہلے اُس کو دیکھتی ہے ۔ پھر دیوار پر ٹنگی ہوئی تصویر کی طرف نظر اُٹھاتی ہے]

کارپورل ۔ (شکایتاً) میں راشن چاہتا ہوں ۔ بغیر اس کے مجھے سردی ستا رہی ہے میرے ہاتھ کو تو دیکھو (وہ انگلیوں کی کڑکڑاتی ہوئی جوڑوں کو کھولتا ہے)

نورہ ۔ (میز کے پیچھے جاتی ہے) بڑے چچا آپ مجھے پہچانتے ہیں؟ میرا نام ہے نورہ بربوسٹر ۔ ایکسس سے آئی ہوں +

کارپورل ۔ رم گرم ہے ۔ شوربے میں غذائیت ہے ۔ لیکن مجھ کو ایک پیالی چائے دو (نورہ کو چندھیائی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے) نوجوان عورت تو نے اپنا نام کیا بتایا؟ (میز کے داہنے جانب بیٹھتا ہے)

نورہ ۔ (میز کے بائیں جانب) نورہ بربوسٹر +

کارپورل ۔ بول لڑکی بول ۔ تو تو بالکل دیہاتی معلوم ہوتی ہے اور جیسی تیز آواز ہونی چاہئے ویسی نہیں ہے +

نورہ ۔ (کرسی کے پیچھے) میں ہوں نورہ بربوسٹر چچا (گوشت اُٹھاتی ہے) ، آپ کی بڑی بھتیجی ایکسس سے آپ کے ساتھ رہنے کے لئے آئی ہوں (آگ پر چڑھے ہوئے برتن سے گوشت نکال کر پلیٹ میں رکھتی ہے)

کارپورل ۔ (منہ چپڑ چپڑ کرتے ہوئے) تو نورہ ہے ۔ تو شاید میرے بھائی جارجی کی لڑکی ہو گی؟ مجھے جارجی کی لڑکی کا کچھ کچھ خیال ہے +

نورہ ۔ (گوشت کو میز پر رکھ کر) نہیں چچا میرا باپ آپ کے بھائی جارجی کا لڑکا ہے (چائے انڈیل کر)

کارپورل ۔ (کانپتے ہوئے ہاتھوں سے آستین اوپر چڑھا کر ہنہناتا اور منہ چپڑ چپڑ کرتا ہے) چھوٹا جارجی بہتیل آدمی تھا (نورہ چائے انڈیلتی ہے اور وہ میز سے بھڑ کر بیٹھتا ہے) جارجی نے مجھکو ایک مرتبہ دھکا بھی دیا تھا ۔ چند شلنگ کی ضمانت میں میں نے اپنا بلڈاک کا بچہ اُس کو دیا تھا ۔ شاید اب مر گیا ہے اُس نے تم کو لانے کے لئے نہیں دیا؟

نورہ ۔ (میز کے داہنے طرف سے کارپول کو تعجب سے دیکھتی ہوئی) بڑے چچا جارجی کو مرے ہوئے بیس برس ہو گئے +

کارپورل ۔ (ہنہناتے ہوئے) بہت خوبصورت کتے کے بچے تھے ۔ بہت خوبصورت (سپر پیٹر کے چار پیتا ہے ۔ نورہ دوسری پیالی بھرتی ہے) راشن نہ ملنے کی وجہ سے مجھے سردی معلوم ہو رہی ہے ۔ رم گرم ہے اور دوسری شراب بھی گرم ہے +

نورہ ۔ میں آپ کے لئے کچھ مکھن اور انڈے اپنے ساتھ لیتی آئی ہوں اور ماں نے سلام کہا ہے اور مزاج پوچھا ہے ۔ اُنہوں نے ایک ٹین بالائی بھی آپ کے لئے دیا تھا ۔ وہ راستے میں اُلٹ گئی (آگ کی بائیں جانب کی کرسیوں کی قطار کے داہنی طرف)

کارپورل ۔ (جلدی جلدی کھاتے ہوئے) یہ ایک درمیانی عمدہ طریقہ ہے کہ کل چھوڑنا پڑا +

نورہ ۔ کیا چیز چچا؟

کارپورل ۔ وہی گاڑی جس پر تم آئی ہو +

نورہ ۔ نہیں میں صبح کی ٹرین سے آئی ہوں +

کارپورل ۔ خدایا ذرا اس کو سوچو تو ۔ ریلوے ٹرین! تم اس بڑے بڑے خوفناک پنجے والی چیز سے خائف نہیں ہوئیں ۔ ریلوے ٹرین سے تمہارا آنا خیال کر کے ڈر معلوم ہوتا ہے (چپڑ چپڑ کرتے ہوئے) خدایا ۔ اب دنیا میں کیا ہونیوالا ہے ۔ (سینے کو پھیلا کر بازو پھیلانے کی کوشش کرتا ہے) کھانا کھانے کے بعد اب مجھکو طاقت معلوم ہو رہی ہے +

نورہ ۔ بیشک چچا کھانا کھانے کے بعد آپ کچھ مضبوط معلوم ہو رہے ہیں (میز کے اوپر سے چیزوں کو ہٹاتی ہے)

کارپورل ۔ غذا اُس آگ کے کوئلہ کے مثال معلوم ہوتی ہے ۔ لیکن لڑکی میں جل نہیں گیا ہوں +

نورہ ۔ (میز کو صاف کرتے ہوئے) آپ نے تو بہت عمر پایا ہے ۔ چچا آپ کو ایک زمانہ دراز معلوم ہونا چاہئے +

کارپورل ۔ نہیں بہت زیادہ نہیں ۔ میری عمر نوے برس سے کچھ زیادہ ہے لیکن سارے واقعات معلوم ہوتے ہیں کل کی بات ہے ۔ جب مجھے انعام ملا تھا ۔ اور لڑائی ہوئی تھی ۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جنگ عظیم کے بارود کی خوشبو ابھی تک میری ناک سے نہیں گئی +

نورہ ۔ ہاں چچا میں نے پڑھا ہے ۔ میں سمجھتی ہوں آپکو اُس پر بہت فخر ہو گا +

کارپورل ۔ (کھڑا ہو کر اس کو دیکھتا ہے) میرے لئے یہ بہت بڑا دن تھا۔ بہت بڑا شہزادہ ریجنٹ موجود تھا۔ بڑا خوبصورت اور سڈول جسم پایا تھا۔ (پائپ میں تمباکو بھرتا ہے) وہ کہتا تھا "فوج کو تم پر فخر ہے" اور میں کہتا تھا "مجھ کو فوج پر فخر ہے"۔ اور وہ لارڈ بل سے کہتا تھا "کیسا معقول جواب دیا۔ اور دونوں ہنس کر لوٹ جاتے تھے (کھانستا ہے اور منہ چیڑ چیڑ کرتا ہے اور آتشدان کے اوپر والے حصہ کی طرف اشارہ کرتا ہے)

نورہ ۔ چچا آپ کیا مانگتے ہیں؟ کیا چیز دوں؟ (آتشدان کے اوپر سے بوتل اور چمچہ لاتی ہے)

کارپورل ۔ اس بوتل سے ایک چمچہ دے لڑکی (اس کو پیتا ہے) یہ بہت مفرح دوا ہے (باجے کی آواز آتی ہے) اور بلغم کو خارج کرتی ہے (نورہ کھڑکی سے جھانکتی ہے) تم کھڑکی سے کیا دیکھ رہی ہو؟ (نورہ کھڑکی کھولتی ہے۔ اور باجے کی آواز صاف آتی ہے)

نورہ ۔ چچا اس سڑک سے فوج کا ایک رسالہ آرہا ہے +

کارپورل ۔ (اٹھ کر کھڑکی کے پاس جاتے ہوئے) رسالہ! اہاہا میرے گلاس کہاں ہیں؟ میں ان کو کان میں لگا کر بہت صاف سن سکتا ہوں۔ پہلے کیطرح اب بینڈ نہیں بجتا (کھڑکی سے دیکھ کر) ڈرم میجر وغیرہ سب موجود ہیں۔ لڑکی دیکھ تو ان کا نمبر کیا ہے؟ (اس کی آنکھیں چمک اٹھتی ہیں۔ چھڑی اور سر باجے کی آواز پر حرکت کرتا ہے)

نورہ ۔ ان کا تو کوئی نمبر نہیں معلوم ہوتا ہے۔ شانے پر البتہ کچھ لکھا ہوا ہے۔ غالباً آکسفورڈ شائر ہے +

کارپورل ۔ ہاں ٹھیک ہے۔ میں نے سنا تھا کہ نمبر اڑا دیا گیا ہے۔ اور ان کا نئے طرز کا نام رکھا گیا ہے۔ (سر ہلاتا ہے) اگر یہ ڈوک کے سامنے کیا گیا ہوتا تو وہ کچھ نہ کچھ ضرور کہتا۔ وہ جا رہے ہیں۔ وہ سب کے سب نوعمر ہیں۔ لیکن مارچ کرنے کے قاعدے سے خوب واقف ہیں۔ (باجے کی آواز دھیمی ہوجاتی ہے) اس وقت وہ گھوم رہے ہیں (وہ دیکھتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ سب غائب ہوجاتے ہیں)

نورہ ۔ (نورہ مدد دیتے ہوئے) اب اپنی کرسی پر چلکر بیٹھئے +

کارپورل ۔ اچھا وہ بوتل پھر لاؤ۔ اس سے بلغم خارج ہوتا ہے۔ جوانس کہتا ہے کہ یہ تمہارے لئے بہت مفید چیز ہے۔ وہ بہت چالاک آدمی ہے۔ اور میں اس کے کلب میں ہوں۔ دیکھو وہاں ادائیگی کا کارڈ رکھا ہوا ہے۔ بینڈ بند ہوجاتا (یکایک اپنی ران کو پیٹ کر) میں سمجھتا ہوں کچھ دال میں کالا ہے +

نورہ ۔ کہاں چچا؟

کارپورل ۔ میں سپاہیوں کے لئے کہہ رہا ہوں۔ مجھے معلوم ہوگیا ہے وہ اپنا موزہ ہی پہننا بھول گئے ہیں۔ ایک سپاہی بھی موزہ نہیں پہنے ہے (منہ چیڑ چیڑ کرتا ہے) اگر ڈوک ہوتا تو کچھ نہ کچھ ضرور کہتا +

(دروازہ کھلتا ہے اور سرجنٹ نظر آتا ہے)

نورہ ۔ (دروازہ کی طرف دیکھتے ہوئے) چچا یہ وہی سپاہی ہے جو صبح آیا تھا۔ نیلا کوٹ ہے اور اس میں سنہری پلیٹ لگی ہوئی ہے +

کارپورل ۔ وہ کیا چاہتا ہے؟ لڑکی کھڑی دیکھتی کیا ہے۔ دروازہ پر جا اور اس سے دریافت کر +

(وہ دروازے پر جاتی ہے جو نصف کھلا ہوا ہے۔ توپخانہ کا سرجنٹ میکڈانلڈ اپنی بندوق لئے ہوئے دروازے کے نزدیک آتا ہے اور سلام کرتا ہے)

سرجنٹ ۔ میں دوبارہ تسلیم عرض کرتا ہوں۔ بڑے جنٹلمین سے اب ملاقات ہوسکتی ہے؟

نورہ ۔ جی ہاں وہ موجود ہیں۔ مجھے امید ہے آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہونگے۔ چچا ایک شخص آپ سے ملنا چاہتے ہیں +

سرجنٹ ۔ آپ کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ خوشی اور فخر دونوں ساتھ ساتھ +

(آگے بڑھتا ہے بندوق کو زمین پر ٹیک کر فوجی قاعدہ سے سلام کرتا ہے۔ نورہ کچھ خوفزدہ اور کچھ اشتیاق آمیز نظروں سے آنے والے کو دیکھتی رہتی ہے۔)

کارپورل ۔ (سرجنٹ کی طرف دیکھکر) بیٹھ جاؤ سرجنٹ بیٹھ جاؤ۔ (سر سے اشارہ کرتا ہے) بلّے حاصل کرنے کے لئے تم بالکل جوان ہو۔ میرے زمانے میں تو ایک بلّا بھی حاصل کرلینا بہت مشکل تھا۔ اب تو تین حاصل کرلینا کوئی بات ہی نہیں ہے۔ بندوقچی پرانے سپاہی رکھے جاتے تھے۔ اور وہ لوگ بہت جلد تین بلّے حاصل کرلیتے تھے +

(سرجنٹ لڑکی کے پاس بندوق کھڑی کردیتا ہے۔ نورہ جھاڑن اٹھاکر پونچھتی ہے اور اس کو ہتکنڈی میں رکھدیتی ہے)

سرجنٹ ۔ ملازمت کرتے ہوئے مجھے آٹھ برس ہوئے۔ میکڈانلڈ میرا نام ہے۔ اپنے ماتحتوں کی طرف سے آپ سے ملاقات کرنے آیا ہوں۔ جو شہر میں آپ کی ذات کو غنیمت سمجھتے ہیں +

[نورہ میز صاف کر چکتی ہے اور میز پوش لپٹا ہوا الماری میں رکھا ہوا ہے]

کارپورل ۔(چڑچڑ کرتے اور ہاتھ ملتے ہوئے) ریجنٹ نے جو کہا تھا وہی بات ہے وہ کہتا تھا "فوج کو تم پر فخر ہے"، اور میں کہتا تھا "مجھ کو فوج پر فخر ہے"، وہ لارڈ بل سے کہتا تھا "دیکھو کیا معقول جواب دیا"، اور دونوں ہنستے ہنستے لوٹ جاتے تھے +

سرجنٹ ۔ اگر آپ یہاں سے تھوڑی دور کی تکلیف گوارا کیا کریں تو تمباکو سے بھرا ہوا پائپ اور ایک گلاس شراب کو ہمیشہ اپنا منتظر پائیں گے اور ادنیٰ درجہ کے ملازمین آپ کی تشریف آوری کو باعثِ فخر تصور کریں گے۔

کارپورل ۔ (کھلکھلاتے ہوئے ہنسکر) وہ کتے مجھ کو دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ اچھا ذرا گرمی پڑنے لگے تو میں آؤنگا۔ آج میری طبیعت کچھ خراب ہے۔ اور سردی معلوم ہو رہی ہے (سینے کو تھپتھپا کر) تم کسی نہ کسی روز مجھ کو بارک میں دیکھو گے +

سرجنٹ ۔ تو ن کمیشن مس کو دریافت کرنا یاد رکھئیگا +

کارپورل ۔ آن +

سرجنٹ ۔ ن کمیشن مس +

کارپورل ۔ او خدا، افسروں کی طرح اُس کے بھی ساتھی ہیں۔ فوجی شرابخانے کے لئے یہ بہت ہی عظیم الشان بات ہے۔ اگر یہ ڈیوک کے لئے کیا جاتا تو وہ کچھ نہ کچھ ضرور کہتا +

سرجنٹ ۔ (تعظیماً) آپ تو محافظ دستہ میں تھے نا؟

کارپورل ۔ ہاں میں ایک محافظ ہوں۔ وہی تھرڈ گارڈ جو اب اسکاٹ گارڈ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور اس میں جتنے تھے سب مر گئے۔ ایک بچہ بھی زندہ نہ رہا بجز مجھ آوارہ گرد کے۔ میں اپنے کو اسی نام سے یاد کرتا ہوں۔ اور یہ میرا قصور نہیں ہے۔ کیونکہ ابھی تک میری طلبی نہیں ہوئی۔ اور بغیر طلبی کے میں اپنی جگہ کیسے چھوڑ سکتا ہوں +

سرجنٹ ۔ (سر ہلا کر) جتنے ہیں ایک دن ہم سب لوگ وہاں جمع ہوں گے۔ لیجئے ذرا میرے تمباکو کا تو مزہ چکھئے۔ (تھیلی دیتا ہے)

کارپورل ۔ آن +

سرجنٹ ۔ لیجئے تمباکو سے شوق کیجئے +

[کارپورل بربوسٹر اپنے مٹی کے پائپ کو بھرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن وہ گر پڑتا ہے۔ اور ٹوٹ جاتا ہے۔ کارپورل بچوں کی طرح لمبی لمبی ہچکیاں بھر کر رونے لگتا ہے]

کارپورل ۔ میرا پائپ۔ میرا پائپ۔ ٹوٹ گیا میرا پائپ +

نورہ ۔ (دوڑ کر اُس کے پاس جاتی ہے اور اُس کو تسکین دیتی ہے) چچا نہ روئیے۔ نہ روئیے ہم دوسری منگوالیں گے +

سرجنٹ ۔ اپنے دل کو رنجیدہ نہ کیجئے (پائپ دیتے ہوئے) لیجئے یہ لیجئے۔ اُمید ہے کہ آپ قبولیت کی عزت بخشیں گے۔ یہ لکڑی کا پائپ ہے اور کہربا کی منہال لگی ہوئی ہے +

کارپورل ۔ (روتے میں ہنسکر۔ سرجنٹ اپنی بندوق لاتا ہے) واہ واہ یہ بہت نفیس پائپ ہے۔ لڑکی ذرا میرے نئے پائپ کو دیکھ۔ جارج کو ایسا پائپ نصیب بھی نہ ہوا ہوگا۔ اس میں کہربا کی منہال لگی ہوئی ہے (منہ سے لگاتا ہے) تم کو یہ بندوق وہیں سے ملی ہے سرجنٹ +

سرجنٹ ۔ جی ہاں میں بارک سے واپس آرہا تھا کہ آپ سے ملنے چلنے آیا +

کارپورل ۔ ذرا مجھ کو دو۔ دیکھوں تو +

سرجنٹ ۔ ضرور۔ (بندوق دیتا ہے)

کارپورل ۔ یہ تو پرانے ہی زمانہ کی بندوق کی طرح ہے۔ ایک ہاتھ کندھے پر رہے۔ اچھا اپنے بندوق کا گھوڑا چڑھاؤ۔ لاؤ مجھ کو دو۔ ارے سرجنٹ +

[بندوق کا کندہ دبنے سے کھل گیا۔ نورہ میز پر سے دیکھ رہی تھی] آہ۔ یہ لو۔ کندہ تو ٹوٹ کر دو ہوگیا +

سرجنٹ ۔ (ہنستے ہوئے) یہ بالکل ٹھیک ہے۔ لیور دبنے سے پچھلا حصہ کھل گیا یہ وہ جگہ ہے جہاں سے بندوق بھری جاتی ہے +

کارپورل ۔ ہیں۔ اس غلط سرے سے بھرتے ہو۔ اچھا معلوم ہوا اس میں گرگیف ضرورت نہیں ہے۔ میں نے لوگوں کو کہتے ہوئے سنا تھا لیکن مجھکو یقین نہیں آتا تھا۔

سرجنٹ ۔ (کھڑا ہو کر) میں نے آپ کو بہت تکلیف دی۔ اب پھر کسی روز ملاقات کرونگا۔ اور اپنے ساتھ دو ایک آدمیوں کو بھی لیتا آؤنگا۔ کیونکہ آپ سے ملنے کے بہت لوگ شائق ہیں (سلام کرتے اور جاتے ہوئے) مس میں تسلیم عرض کرتا ہوں +

نورہ ۔ چچا کیا وہ ایک شریف اور خلیق آدمی نہیں ہے؟ (دروازہ تک جاتی اور اُس کو دیکھتی رہتی ہے)

کارپورل ۔ (ہنہناتے ہوئے) لڑکی وہ تمغے حاصل کرنے کے لئے بہت کم سن ہے

بندوقچیوں کے سرجنٹ کو سن رسیدہ ہونا چاہئے معلوم نہیں آجکل یہ کیا معاملہ ہو رہا ہے (چبڑ چبڑ کرتے ہوئے) لیکن نورہ اُس نے مجھ کو ایک پائپ دیا ہے۔ بہت نفیس پائپ جس میں کہربا کی منہال لگی ہوئی ہے۔ بھائی جارجی کو ایسا پائپ کبھی نصیب نہ ہوا ہوگا ٭

نورہ۔ (علیحدہ دروازہ کی طرف اشارہ کرکے) وہ ساٹھ برس میں چچا کی طرح ہو جائیگا اور کسی زمانہ میں چچا اُس کی طرح رہا ہوگا (بائیں جانب بڑھ کر) وہ بہت ہی خلیق معلوم ہوتا ہے۔ مجھ کو "مس" اور چچا کو "جناب" کہہ کر مخاطب کرتا ہے۔ ایسا نفیس آدمی تو آجتک میری نظر سے نہیں گذرا ٭

کارپورل۔ لڑکی تو کیا اِدھر اُدھر کر رہی ہے۔ ذرا کرسی کو دروازہ تک لے جانے میں مجھے مدد دے۔ یا تو یہ خیال کر رہی ہے کہ کرسی خود بخود چلی جائے گی۔ یہاں گرمی ہے اگر ہوا سے مکھیاں اُڑ اُڑ نگا تو مجھ کو تکلیف پہنچیگی۔ اس موسم میں یہ بہت ناگوار معلوم ہوتی ہیں ٭

نورہ۔ کیا چیز چچا۔ مکھیاں؟

[وہ بہت آہستہ آہستہ اُس جگہ جاتا ہے جہاں سورج کی روشنی دروازے سے کمرے میں آتی ہے اور وہ دھوپ میں بیٹھتا ہے۔ نورہ اُس کو چلنے میں پکڑے رہتی ہے]

کارپورل۔ یہ بہت عمدہ جگہ ہے۔ سورج کی روشنی دیکھ کر مجھ کو ہمیشہ عزت اور ناموری کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ پادری آج آیا تھا؟

نورہ۔ چچا جان وہ تو نہیں آیا (بائیں جانب جھکتی ہے)

کارپورل۔ تو پھر وہ کل آیا تھا۔ مجھے پڑھ کر سُناتا ہے ٭

نورہ۔ چچا جان میں بھی سنا سکتی ہوں ٭

کارپورل۔ تم بھی پڑھ سکتی ہو؟ میں نے تو ایسی لڑکی نہیں دیکھی۔ تم ریلوے ٹرین سے سفر کر سکتی ہو۔ تم پڑھ سکتی ہو۔ یہ دنیا میں کیا ہونے والا ہے؟ پادری آتا ہے تو مجھ کو بائبل پڑھکر سناتا ہے (نورہ دوڑکر جاتی ہے اور بائبل لاتی ہے۔ اس کے بعد جھک جاتی ہے)

نورہ۔ (بائبل کھولکر) کونسا بیان آپ سننا چاہتے ہیں؟

کارپورل۔ آن۔ (نورہ پھر انہیں الفاظ کو دہراتی ہے)

کارپورل۔ لڑائی کا بیان ٭

نورہ۔ لڑائی!

کارپورل۔ ہاں لڑائی کا بیان۔ پادری جب آتا ہے تو اولڈ ٹسٹامنٹ مانگتا ہے اور کہتا ہے نبی اسرائیل بہت بہادر سپاہی تھے ٭

نورہ۔ لیکن چچا جان دوسری دنیا میں تو بالکل امن ہے ٭

کارپورل۔ نہیں لڑکی نہیں ٭

نورہ۔ ہاں چچا جان یقینی ٭

کارپورل۔ (کچھ ناراضگی سے اپنی چھڑی زمین پر گرا کر) میں تو کہتا ہوں لڑکی نہیں۔ میں نے پادری سے پوچھا تھا ٭

نورہ۔ پھر اُس نے کیا بتایا تھا ٭

کارپورل۔ وہ کہتا تھا کہ وہاں ایک آخری جنگ ہوگی ٭

نورہ۔ جنگ ہوگی ٭

کارپورل۔ ہاں [illegible] لڑکی۔ اس نے اس جنگ کا نام بھی تو بتایا تھا۔ دیکھو۔ آ۔ آ

نورہ۔ آرمگڈن ٭

کارپورل۔ ہاں ہاں یہی نام تھا (کچھ مسرور ہونے لگتا ہے) مجھے اُمید ہے کہ تھرڈ گارڈ بھی وہاں موجود رہے گا۔ اور ڈوک — ڈوک کو کچھ نہ کچھ کہنا ہوگا۔

(کرسی میں کچھ لیٹ جاتا ہے۔ نورہ کھڑکی بند کرکے بائبل رکھ دیتی ہے)

نورہ۔ آج طبیعت کیسی ہے چچا جان؟ آپ کچھ خستہ معلوم ہوتے ہیں ٭

کارپورل۔ (ناتوانی سے) ہوا کافی لگ گئی ہے۔ اور ان مکھیوں سے لڑنے کی طاقت نہیں رکھتا ٭

نورہ۔ چچا جان میں ان کو دور رکھونگی ٭

کارپورل۔ اس موسم میں یہ بہت ہی تکلیف دہ ہوتی ہیں۔ اچھا آؤ ذرا اس کرسی کو اُٹھاؤ تو (دستک) کرسیاں اسقدر روزنی بنائی جاتی ہیں کہ اُٹھانے میں دقت ہوتی ہے ٭

[اُٹھتے وقت زنجیر کھٹکھٹانے کی آواز آتی ہے اور کرنیل مڈونٹر شہری لباس میں داخل ہوتا ہے]

کرنیل۔ کیا گریگوری بریوسٹر آپ ہی کا نام ہے؟

کارپورل۔ ہاں جناب میرا ہی نام ہے ٭

کرنیل۔ تو آپ وہی شخص ہیں جس سے میں ملنے آیا ہوں ٭

کارپورل۔ وہ کون ہے جناب؟

کرنیل۔ گریگوری بریوسٹر اُن کا نام ہے ٭

کارپورل۔ تو میں وہی آدمی ہوں جناب ٭

کرنیل۔ آپ وہی بریوسٹر ہیں جن کا نام اسکاٹ گارڈ کے رجسٹر میں درج ہے۔

اور جو واٹرلو کی جنگ میں شریک تھے؟

کارپورل - وہی بریوسٹر جناب۔ میرے زمانے میں وہ تھرڈ گارڈ کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ وہ بہت اچھا رسالہ تھا۔ اب صرف ان کو میری اس لئے ضرورت ہے کہ سب ایک جگہ جمع ہو جائیں +

کرنیل - خوب۔ خوب۔ ابھی ان کو عرصہ تک انتظار کرنا پڑے گا۔ مجھ کو آپ سے کچھ بات کرنے کی ضرورت ہوئی۔ اس لئے حاضر ہوا۔ کیونکہ میں اسکاٹ گارڈ کا کرنیل ہوں

[کارپورل جلدی سے کود کر کھڑا ہو گیا اور فوجی قاعدہ سے سلام کیا۔ وہ گرنے کے لئے لڑکھڑایا۔ کرنیل اور نورہ نے اس کو سنبھالا۔ نورہ اُس کے بائیں طرف تھی]

کرنیل - سنبھلو سنبھلو (بریوسٹر کو دوسری کرسی کے پاس لیجاتا ہے۔ آرام اور اطمینان........

کارپورل - (بیٹھکر ہانپتے ہوئے) میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں جناب مجھکو خود آپ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہئے تھا۔ میں فلینگ کمپنی کا ایک معمولی حیثیت کا کارپورل ہوں۔ اور حضور فوج کے کرنیل ہیں۔ مجھ ناچیز کی ملاقات کے لئے تکلیف گوارا کرنا میری عزت افزائی کرنا ہے +

[نورہ میز کے داہنی طرف اس کو بیٹھنے میں مدد دیتی ہے۔ اور کرنیل آتشدان کے پاس بیٹھتا ہے]

کرنیل - ہم لوگوں کو لندن میں آپ کی ذات پر بہت فخر ہے +

کارپورل - یہی بات تو ریجنٹ نے بھی کہی تھی "فوج کو تم پر فخر ہے" +

کرنیل - آپ تو ہگی مونٹ کی فتحیابی میں یقینی شریک تھے؟

[نورہ ہنکنڈی میں سے سوئی دھاگہ لے کر میز کے بائیں طرف سینے کے لئے بیٹھتی ہے]

کارپورل - جی ہاں میں شریک تھا +

کرنیل - میں امید کرتا ہوں کہ آپ بہت آرام سے اور خوش ہونگے +

کارپورل - جب موسم ٹھہر جاتا ہے اور مکھیاں ستانے کے لئے نہیں ہوتیں تو میری طبیعت اچھی رہتی ہے۔ کھانسی کی البتہ شکایت رہتی ہے۔ بلغم خارج ہونے کی دوا پیتا ہوں۔ اور جب کھانا نہیں کھاتا تو سردی پریشان کرتی ہے اب عضو بیکار ہو کر کسی کام کے نہیں رہے +

کرنیل - دماغ کی کیا حالت ہے؟

کارپورل - دماغ میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ میں فوج کے ہر شخص کا نام بتا سکتا ہوں

کرنیل - اور جنگ کے واقعات یاد ہیں؟

کارپورل - بالکل ہو بہو ویسے ہی۔ آنکھیں بند کرتا ہوں تو سارے واقعات سامنے آجاتے ہیں اور اسقدر صاف اور واضح کہ آپ یقین نہیں کر سکتے اچھا دیکھئے وہ دوا کا بوتل جہاں رکھا ہے۔ اُس کے داہنی طرف ہماری فوج ہے۔ آپ دیکھتے ہیں نا۔ اور جہاں ہماری فوج ہے اُس کے داہنی طرف گولے وغیرہ رکھے ہوئے ہیں۔ اچھا جناب یہ ہو گیا۔ اب دیکھئے (سر اٹھا کر اطمینان سے بوتل کی طرف دیکھتا ہے) یہاں ہماری زرد فوج ہے۔ اور یہاں پر ہماری بندوقیں وغیرہ ہیں۔ اور وہ اُس مقام پر جہاں میرا پائپ رکھا ہوا ہے فرنچ ہیں۔ اور وہ تھوک کی جگہ پر پیدو شین ہیں۔ جو ہمارے میمنہ پر حملہ کرنے آرہے ہیں۔ اُن کی بندوقوں کو دھوئیں کا نظارہ بڑا دلخوشکن تھا۔ (نورہ اُس کو کرسی پر بیٹھنے میں مدد دیتی ہے)

کرنیل - اچھا آپ کی زندگی میں کس بات سے آپ کے دل کو صدمہ پہنچا؟

کارپورل - مجھے جو صدمہ رہا تو تین روپے کا۔ جو میرے ہاتھ سے جاتے رہے لیکن اب جبکہ ملنا ہی نہیں ہے تو اُس کا غم کرنا بیکار ہے۔ میں نے بروسل میں جابز اسمتھ کو قرض دیا تھا۔ اور اُس نے وعدہ کیا تھا کہ تنخواہ کے روز دیدونگا۔ فرق نہ پڑے گا۔ لیکن اُس قرض کے متعلق بغیر ایک سطر لکھے وہ مارا گیا۔ بس اُس تین روپے کا مجھے ہمیشہ افسوس رہا +

کرنیل - (ہنس کر) گارڈ کے افسران کچھ ناچیز نذر آپ کے آرام و آسایش کے لئے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ یہ میری طرف سے نہیں ہے۔ اس لئے میرا شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں +

[کارپورل کے تمباکو کی تھیلی میں ایک نوٹ رکھدیتا ہے اور رخصت ہوتا ہے]

کارپورل - شکریہ ادا کرتا ہوں جناب۔ لیکن کرنل صاحب ایک گذارش اور ہے۔ اگر منظور فرمائیں +

کرنیل - ہاں ہاں کارپورل بتاؤ کیا کہتے ہو؟

کارپورل - اگر میری طلبی ہو تو ایک جھنڈا۔ اور بندوقچیوں کے ایک رسالے سے محروم نہ رکھا جاؤں۔ میں شہری نہیں بلکہ فوجی ہوں اور چاہتا ہوں کہ فوج کی دو قطار میرے جنازے کے ساتھ ہوں +

کرنیل - بہت اچھا یہ خواہش آپکی پوری کردی جائیگی۔ اطمینان رکھئے (کارپورل

کرسی میں لیٹ جاتا ہے) اوہو شاید وہ ماندہ ہوکر سوگیا۔ اچھی لڑکی تسلیم۔ خدا کرے تمہاری نسبت اچھی ہی خبر سننے میں آئے (کرنل جاتا ہے)

نورہ۔ شکریہ جناب مجھے بھی یہی اُمید ہے۔ چچاجان ضرور سو گئے ہیں لیکن اسقدر پیلے اور نحیف۔ مجھے تو خوف معلوم ہوتا ہے۔ اور بھی کوئی ہوتا تو اچھا تھا مجھے تو ان کے مزاج کی خبر بھی نہیں کہ کب اچھے رہتے ہیں اور کب نہیں

[سرجنٹ میکڈانلڈ آتا ہے]

سرجنٹ۔ تسلیم عرض ہے مس۔ جنٹلمین کی طبیعت کیسی ہے؟

نورہ۔ میرے خیال میں وہ سو گئے ہیں۔ مگر اُن کی طرف سے مجھے بڑا اندیشہ ہے۔

سرجنٹ۔ (کارپورل کے پاس جاکر) اب وہ زیادہ دن تک چلتے نظر نہیں آتے ممکن ہے سوجانے سے کچھ توانائی آجائے +

نورہ۔ اُمید تو یہی ہے +

سرجنٹ۔ اسقدر جلد واپس آنے کی میں وجہ بتاؤں۔ بات یہ ہوئی کہ بارک میں جاکر جب میں نے بائپ ٹوٹنے کا بیان کیا تو اُن لوگوں نے ایک پونڈ تمباکو بھی دیا +

نورہ۔ ان کا اسقدر خیال رکھنا آپکی عنایت ہے +

سرجنٹ۔ تم ہمیشہ ان کے ساتھ ہی رہیں؟

نورہ۔ نہیں۔ میں آج صبح آئی ہوں +

سرجنٹ۔ تو تم کو ہر چیز کے درست کرنے میں بڑی دقت ہوگی +

نورہ۔ میں نے یہاں آکر ہر چیز کو بہت ابتر حالت میں پایا۔ فرصت کے وقت سب درست کرونگی +

سرجنٹ۔ یہ آواز تو مجھ کو فوج کی سی معلوم ہو رہی ہے۔ جیسے کوچ کا حکم دیا جاتا ہو

نورہ۔ آپ نے کیسے سمجھ لیا کہ یہ کوچ ہی کا حکم ہے +

سرجنٹ۔ مس تم کو کبھی بارک میں جانے کا اتفاق ہوا ہے؟

نورہ۔ نہیں میری ساری عمر گھر میں گذری ہے +

سرجنٹ۔ اچھا اگر وہ جائیں تو تم بھی ساتھ آنا پھر میں تم کو دکھلاؤنگا +

نورہ۔ ضرور آؤنگی +

سرجنٹ۔ تو وعدہ کرتی ہونا؟

نورہ۔ (ہنسکر) آپ کو بہت خواہش ہے؟

سرجنٹ۔ بیشک میری عین تمنا ہے +

نورہ۔ اچھا میں وعدہ کرتی ہوں کہ ضرور آؤنگی +

سرجنٹ۔ مجھ کو ہمہ تن منتظر پاؤگی +

نورہ۔ یقین تو ہے بڑا لطف آئے گا +

سرجنٹ۔ لیکن نوجوان لیڈیاں جس لطف کی آرزومند ہوتی ہیں۔ وہ کہاں ممکن ہو سکتا ہے +

نورہ۔ میں اُن لیڈیوں میں نہیں ہوں۔ میں نے ہمیشہ اپنے ہاتھوں سے کام کیا ہے اور اس کو یاد رکھونگی +

کارپورل۔ (بلند آواز میں) محافظ دستہ کو بارود کی ضرورت ہے۔ بارود کی۔ (اور زور سے) محافظ دستہ کو بارود کی ضرورت ہے۔ (اُٹھنے کی کوشش کرتا ہی)

نورہ۔ ہائے مجھے تو ڈر معلوم ہوتا ہے +

کارپورل۔ (لڑکھڑاتے ہوئے کھڑا ہوکر اور اپنا سپاہیانہ ہاتھ پھیلاکر) محافظ دستہ کو بارود کی ضرورت ہے۔ خدا کے واسطے فوراً پہنچاؤ (کرسی میں گر پڑتا ہے نورہ اور سرجنٹ اُس کی طرف دوڑتے ہیں)

نورہ۔ (روتے ہوئے) ہائے کچھ تبلائیے تو ان کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے +

سرجنٹ۔ (سنجیدگی سے) میں خیال کرتا ہوں کہ اب وہاں تھرڈ گارڈ کی جمعیت پوری ہو جائیگی +

ڈراپ

منشی کنہیالال

IQBAL ACADEMY Library LAHORE 3/613

ریویو **میوزک آف انڈیا یعنی موسیقی ہند**۔ ازجناب کے ایل رلیارام ۹۱ میکلوڈ روڈ لاہور۔ موسیقی ہندوستان کا قدیم ترین اور مستند فن ہے۔ بلکہ دنیا کے قدیم ترین علوم میں جو درجہ موسیقی کو حاصل ہے وہ شاید اور کسی علم کو حاصل نہیں۔ اس فن پر اردو زبان میں کوئی اچھی کتاب ابھی تک نہیں لکھی گئی تھی۔ شائقین علم و فن کو جناب کے ایل رلیارام صاحب کا مرہون منت ہونا چاہیے کہ انہوں نے اس ادق ترین فن پر ایک جامع کتاب لکھکر اردو زبان میں ایک قابلقدر اضافہ کیا ہے۔ کتاب کا سائز ۲۰×۳۰ ضخامت ۲۱۴ صفحہ۔ کاغذ کتابت گوارا قیمت ؎ مندرجہ بالا پتہ سے منگائیے۔ موسیقی ہند میں اصول موسیقی، راگ کا مادہ و مخرج۔ آواز کا مخرج جسمانی آواز کی کیفیت، سماعت، سُر کی بناوٹ اور اُنکے بنیادی اصول سُر کا پھیلاؤ۔ راگ، راگ کے اوقات گانے کے مختلف طریقے۔ گوئیے کی خوبیاں اور عیوب۔ ہاول علم موسیقی کی تاریخ۔ اور جدید ہندستانی آلات موسیقی۔ مغربی موسیقی کا اثر مغربی راگ کے اصول۔ دوسرے حصے میں جو اسی پر مشتمل ہو۔ راگ انکی طرزیں اور طرز ادا پر روشنی ڈالی گئی ہو کتاب ہر طرح سے جامع ہو +

دوشیزہ

علم نوعی خانگی زندگی پر لاجواب تصنیف

دُوسرا ایڈیشن

۲۵ عدد بلاک کی اور ایک سو دستی تصاویر۔ لکھائی۔ چھپائی کاغذ عمدہ۔ حجم اڑھائی سو صفحہ سے زائد۔ سائز کلاں۔ کتاب مجلد ہے
قیمت صرف ساڑھے تین روپے (۳؎)

یہ کتاب ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو رہی ہے۔ معزز طبقہ میں اس کتاب کو اتنا پسند کیا گیا ہے کہ بعض اصحاب نے کتاب کے مخصوص حصے اپنی لڑکیوں۔ عورتوں اور نوجوانوں کو پڑھائے ہیں۔ لوگوں کا خیال ہے کہ اس قسم کی کتاب جو اتنی مفید ہو۔ آجتک نہیں لکھی گئی۔ بے حد مفید ہے۔ اس لئے اس کا ہر گھر میں موجود ہونا لازمی ہے۔ فحش اور جذبات کو برانگیختہ کرنے والی تحریروں سے پورا پورا اجتناب کیا گیا ہے صرف سائنٹفک طبی اور اخلاقی پہلو سے اس قسم کے رازہائے سربستہ بے نقاب کئے گئے ہیں۔ جو کسی قیمتی سے قیمتی کتاب میں بھی آپ کو نہیں ملیں گے۔ یہ کتاب دو ہزار (۲۰۰۰) روپیہ قیمت کی کتابوں کے مطالعہ اور برسوں کے تجربات اور دقیق مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ اسے منگوائیے۔ پڑھئے اور اس سے فائدہ اٹھا کر مصنف کے حق میں دعائے خیر کیجئے

تصویری مرقع

۲۴ رنگین تصاویر کا مجموعہ
صرف ایک روپیہ (عہ) میں

تین تین پیسہ میں ایک ایک تصویر مکانوں اور کمروں کی آرائش کیلئے چوکھٹوں میں جڑوا کر رکھیے آپ کے کتبخانہ کی زینت بھی ہوگی۔ ٹائٹل دبیز اور رنگین ہے۔ ریشمی فیتہ سے سلائی کی گئی ہے، دنیا کے مشہور ترین مصوروں کے شاہکار ہیں۔ چوبیس تصاویر قیمت صرف ایک روپیہ اور محصولڈاک بہر میں ارسال خدمت ہونگیں فی الفور طلب کیجیے

شریر بیوی

مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی ایم اے علیگ کے نہایت دلچسپ نتیجہ خیز سبق آموز اور مذاقیہ رنگ میں لکھے ہوئے افسانوں کا مجموعہ ہے جسمیں ایک جدید تعلیمیافتہ آزاد خیال عورت شریر بیوی کے نقاب میں ہندوستانی معاشرت کی خوبیوں اور برائیوں کو نمایاں کرتی ہے پڑھتے پڑھتے آپ لوٹ پوٹ ہو جائینگے
قیمت عہ

مینجر نیرنگ خیال بک ڈپو شاہی محلہ لاہور

مکتبہ محمد حسین خوشنویس متصل کھاڑہ بونال لاہور

S.M.ASGHAR,

DIAMOND MERCHANT

Y.M.C.A. BUILDINGS, THE MALL, LAHORE.

شیخ محمد اصغر جوہری وائی ایم سی اے بلڈنگس مال روڈ لاہور